خطباتِ عالیہ

یعنی

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ

کے

چہل سالہ خطباتِ صدارت کا مجموعہ

جس میں

ہر معزز صدر کے قابلِ مطالعہ و سبق آموز حالاتِ زندگی مع فوٹو کے چھاپے گئے ہیں



مرتبہ

مولوی انوار احمد صاحب زبیری زمارہروی

حسب الارشاد جناب نواب صدر یار جنگ بہادر مولانا حاجی محمد حبیب الرحمن خاں صاحب شروانی
آنریری سکریٹری آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس

باہتمام محمد مقتدی خاں شروانی

مسلم یونیورسٹی پریس علی گڑھ میں طبع ہوئے ۱۳۴۶ھ ۱۹۲۷ء

(بار اول) (صدر دفتر کانفرنس نے شائع کیے) (۱۰۰۰ جلد)

فطرت اطفال

یعنی

فنِ تعلیم و تربیت کے متعلق انگریزی کی ایک مختصر لیکن نہایت مفید کارآمد اور دلچسپ
کتاب کا ترجمہ اساتذہ و والدین دونوں کے لئے اس کا مطالعہ ضروری ہے یہ رسالہ ۸۰ صفحہ کا ہے
ابھی حال میں کانفرنس نے ترجمہ کرا کر شائع کیا ہے۔ اولاد کی تعلیم کا معاملہ اس قدر اہم ہے کہ تمام خاندان
کی آئندہ ترقی اسی پر منحصر ہے اس لئے کسی شخص کو ایسے اہم مقصد پر چار آنہ خرچ کرنے میں تامل نہ
جب آپ اس رسالہ کو غور سے پڑھیں گے تو اندازہ ہوگا کہ صرف ۴ر خرچ کر کے آپ نے کس قدر علم
و تجربہ حاصل کیا۔ خود بھی خریدئیے اور صاحب اولاد احباب کو بھی خریداری کی ترغیب دیجئے

تاریخ التعلیم

مصنفہ جناب ڈاکٹر ضیاء الدین احمد صاحب ایم اے، ڈی ایس سی، پی ایچ ڈی، سی آئی ای
پرو وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

اس رسالہ میں فن تعلیم و تدریس کی گزشتہ تاریخ نہایت سلیس و شگفتہ عبارت میں بیان کی گئی ہے۔
مختلف اوقات میں ماہرین فن تعلیم نے جو تعلیمی اصول قائم کئے اور امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ جو تبدیلیاں تعلیم
ممالک و اقوام کے اصول تعلیم میں واقع ہوئیں ان کو نہایت حسن و خوبی سے بیان کیا ہے جملہ اصحاب
فن تعلیم سے دلچسپی رکھتے ہیں اس کتاب کا ضرور ملاحظہ فرمائیں۔ لکھائی چھپائی عمدہ ضخامت ۱۱۲ صفحہ قیمت ۱۲ر

ملنے کا پتہ: دفتر آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس سلطان جہاں منزل علی گڑھ

خطباتِ عالیہ

حصۂ اوّل

(از اجلاس اوّل منعقدہ علی گڑھ سنہ ۱۸۸۶ء تا اجلاس بستم منعقدہ ڈھاکہ سنہ ۱۹۰۶ء)

فہرست مضامین

مضمون | صفحہ



حالات، خطبات، تصاویر

خطباتِ عالیہ کی اس پہلی جلد میں حسبِ ذیل بزرگوں کے حالات، خطبات اور عکسی تصاویر موجود ہیں:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدمہ

نوشتۂ مولوی محمد اکرام اللہ خاں صاحب ندوی

موجودہ زمانہ میں جب کہ انگریزی تعلیم ہندوستان میں سرعت کے ساتھ پھیل رہی ہے، ہزاروں اسکول اور کالج قایم ہیں اور یونی ورسٹیوں کی تعداد میں برابر اضافہ ہو رہا ہے، اس زمانہ کی حالت کا اندازہ کرنا مشکل ہے جب کہ اب سے پچاس برس پہلے مسلمان نہ صرف انگریزی تعلیم سے ناآشنا تھے بلکہ اس کے سخت مخالف تھے۔ چنانچہ سرسید مرحوم نے جب اپنی تعلیمی تحریک کا آغاز کیا تو عام طور پر مسلمانوں کے ہر طبقہ نے اُن کی مخالفت میں آواز بلند کی اور بجز چند افراد کے جو اُن کے ہم آہنگ تھے عام مسلمانوں کی طرف سے سرسید کی حوصلہ افزائی نہیں ہوئی لیکن باوجود شدید مخالفت کے سرسید اور اُن کے رفقائے کار استقلال اور مستعدی کے ساتھ اپنے کام میں مصروف رہے

یہاں تک کہ مسلسل پچاس برس کی جد و جہد کے بعد فضا میں اس قدر تبدیلی پیدا ہو گئی کہ اب کوئی آواز جدید تعلیم کی مخالفت میں بلند نہیں ہوتی۔ اور اگر ہو بھی تو کوئی شخص اس آواز پر لبیک کہنے کے لئے آمادہ نہیں ہے۔ یہ اور بات ہے کہ مسلمان اپنے ضرب المثل افلاس، تعلیم کی گرانی، اور بعض دوسرے اسباب کی بنا پر اب بھی بہ نسبت غیر مسلم اقوام کے جدید تعلیم میں پس ماندہ ہیں لیکن اس کے یہ معنی ہرگز نہیں ہیں کہ وہ جدید تعلیم کے مخالف ہیں یا اُس کی ضرورت سے انھیں انکار ہے۔ سرسید نے اِس مخالفت کے طوفان کا جس طریقہ سے مقابلہ کیا اور آخر کار جن ذرائع سے کامیابی حاصل کی، اس موقع پر اختصار کے ساتھ اُس کا تذکرہ کرنا غالباً بے موقع نہ ہوگا۔

(۱) جب سرسید نے یہ محسوس کیا کہ مسلمان مذہبی حیثیت سے انگریزی تعلیم کے مخالف ہیں اور اُن کا یہ عام خیال ہے کہ ایک غیر مسلم قوم کی زبان سیکھنا مذہباً جائز نہیں۔ تو اُنھوں نے مضامین، خطبات، مستقل رسائل اور اپنے مشہور ماہانہ رسالہ تہذیب الاخلاق کے ذریعہ سے مسلمانوں کے اوہام و خیالات کی تردید کی اور بتایا کہ مذہب علوم جدیدہ کا مخالف نہیں ہے۔ اِس کے علاوہ اُنھوں نے تاریخی حیثیت سے ثابت کیا کہ مسلمانوں نے اپنے عہد عروج و کمال میں غیر قوموں کے علوم سیکھے بلکہ اُن میں خاص فضل و کمال حاصل کیا۔ سرسید کے اِن پُرزور

مضامین نے اُن کے بہت سے حامی و مددگار پیدا کر دیئے۔ جو اپنے عالمانہ مضامین اور تصنیفات و خطبات کے ذریعہ سے مسلمانوں کے خیالات کی اصلاح کرتے رہے یہاں تک کہ مخالفت کا وہ طوفان ٹھنڈا ہو گیا۔ اور اب لوگوں کو سرسید اور اُن کے احباب کے خیالات سے وہ نفرت نہیں رہی جو پہلے تھی۔

(۲) چونکہ انگریزی اسکولوں اور کالجوں میں مسلمانوں کی مذہبی تعلیم کا کوئی انتظام نہ تھا، اس لیئے مسلمانوں کو عام طور پر انگریزی تعلیم سے وحشت تھی۔ وہ خیال کرتے تھے کہ مذہبی تعلیم نہ حاصل کرنے سے اُن کے بچّے اسلام سے بیگانہ ہو جائینگے۔ اور مسلمانوں کا یہ خیال کچھ بے جا نہ تھا۔ اِس لیئے سرسید نے یہ تجویز کیا کہ مسلمان انگریزی تعلیم کے لیئے اپنی مخصوص درس گاہیں قایم کریں۔ جو خود مسلمانوں کی نگرانی و انتظام کے ماتحت ہوں اور اُن درس گاہوں میں مسلمان بچّوں کی مذہبی تعلیم و تربیت کا معقول انتظام کیا جائے۔ چنانچہ چند سال کی سعی و کوشش کے بعد سرسید نے ۱۸۷۵ء میں علی گڑھ کالج کا سنگ بنیاد رکھا۔ شیعہ و سنی مسلمانوں کی مذہبی تعلیم کے لیئے علٰحدہ علٰحدہ کمیٹیاں بنائی گئیں۔ نصاب تعلیم تجویز ہوا۔ نماز کے لیئے مسجد تعمیر کی گئی۔ اور اخلاقی نگرانی کے لیئے اتالیق و نگراں مقرر کیئے گئے۔

اِن انتظامات سے مسلمانوں کو ایک حد تک اطمینان ہوا، اور وہ اپنے بچّوں کو تعلیم کے لیئے اس کالج میں بھیجنے پر آمادہ ہو گئے۔

(۳) باوجود مندرجۂ بالا تدابیر کے ابھی مسلمانوں کی ایک کثیر جماعت ہندوستان میں ایسی موجود تھی جو یا تو سرسید کی تحریک سے قطعًا نا آشنا تھی یا اُن کی مخالف تھی۔ اس لیئے کالج قایم کرنے کے دس سال بعد ۱۸۸۶ء میں سرسید نے یہ محسوس کیا کہ ہندوستان جیسے وسیع ملک میں کوئی مفید تحریک اُس وقت تک سرسبز و کامیاب نہیں ہو سکتی جب تک مسلمانوں میں ایک مستقل و مضبوط جماعت ایسی نہ ہو جو لگاتار اس تحریک کے متعلق تبلیغ و اشاعت کی خدمت انجام دیتی رہے بلکہ ملک کے مختلف صوبوں میں دورہ کرکے اور لوگوں کو جمع کرکے اپنے خیالات اُن کو سُنائے۔ سرسید کی اس تخیل کا نتیجہ وہ مشہور و معروف انجمن ہے جس کا نام مختلف تبدیلیوں کے بعد آج کل آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس ہے اور جس کا صدر دفتر مُسلم یونی ورسٹی کے پہلو میں بمقام علی گڑھ قایم ہے۔

اِس موقع پر کانفرنس کے اغراض و مقاصد کی تفصیل بیان کرنے کی حاجت نہیں۔ گزشتہ چالیس سال میں کانفرنس نے اپنے مقاصد کے متعلق اس قدر کثرت سے لٹریچر شائع کیا ہے اور ہندوستان کے مختلف مقامات پر اتنے

اجلاس منعقد کیئے ہیں کہ ہر پڑھا لکھا مسلمان نہ صرف کانفرنس کے نام سے واقف ہو چکا ہی بلکہ اجمالی طور پر اس کے اغراض و مقاصد سے بھی باخبر ہی۔ کانفرنس مسلمانوں کی سب سے پہلی باقاعدہ انجمن ہی جو ایک خاص قانون اور دستورالعمل کے ماتحت کام کرتی ہی اور موجودہ تہذیب و تمدّن نے قومی مجالس کے متعلق جو تہذیب و ضابطہ لازم قرار دیا ہی اُس کی پابند ہی۔ یہ کانفرنس ہر سال دسمبر کے آخری ہفتہ میں اپنا اجلاس ہندوستان کے کسی خاص شہر میں منعقد کرتی ہی جو اکثر تین روز تک رہتا ہی۔ اجلاس کی رہ نمائی کے لیئے پہلے سے ایک صدر کا انتخاب ہوتا ہی۔ صدر اجلاس کے نظم کو باقاعدہ قایم رکھنے کے علاوہ اپنا خطبۂ صدارت بھی پڑھتا ہی جو عموماً لکھا ہوا ہوتا ہی۔ چونکہ صدارت کے لیئے اکثر ملک کے قابل و ممتاز اصحاب کا انتخاب ہوتا ہی جو علاوہ تعلیم یافتہ ہونے کے اپنی قوم کی حالت کے متعلق وسیع تجربہ رکھتے ہیں (بلکہ پہلے سے قومی خدمت میں مصروف ہوتے ہیں) اس بنا پر وہ اپنا خطبۂ صدارت خاص توجہ و محنت سے تیار کرتے ہیں اور اپنے تجربہ و وسیع معلومات کے لحاظ سے جن چیزوں کو مسلمانوں کے لیئے مفید سمجھتے ہیں بیان کرتے ہیں۔ اس لیئے یہ خیالات و افکار درحقیقت اس لائق ہیں کہ قوم اُن پر عمل کرے اور آیندہ نسلوں کے لیئے اُن کو محفوظ رکھے۔ گزشتہ چہل سالہ مدت میں کانفرنس کے اُنتالیس (۳۹) اجلاس ہندوستان کے مختلف

صوبجات میں منعقد ہوئے اور ہر اجلاس کی رپورٹ سال بہ سال شایع ہوتی
رہی جن میں خطبات صدارت بھی شامل تھے۔ لیکن آج یہ رپورٹیں ناپید
ہیں۔ اس لیئے اگر کسی شخص کو ان خطبات کے پڑھنے کا شوق بھی ہو۔ تو
اُن کا مہیّا کرنا ممکن نہیں۔ البتہ کانفرنس کے صدر دفتر میں ایک ایک جلد محفوظ
ہے۔ لیکن اس سے ہر شخص مستفید نہیں ہو سکتا۔ اس لحاظ سے کانفرنس کا یہ
کارنامہ لایق تحسین و ستایش ہے کہ اُس نے ان پراگندہ خطبات کو یکجا
کر کے شائع کرنے کا اہتمام کیا ہے۔

جو اصحاب ابتدا سے کانفرنس کے شریک مددگار رہیں اُنھوں نے
آہستہ آہستہ چالیس سال میں یہ خطبات سُنے ہیں اور اس طرح سے سُنے ہیں کہ
اُن کے لیئے سفر کی زحمتیں اُٹھائی ہیں، روپیہ صرف کیا ہے، اور بسا اوقات
آرام و راحت کی قربانی بھی کی ہے۔ لیکن خطباتِ عالیہ کے ناظرین خوش نصیب
ہیں کہ جو داستان دوسروں نے چالیس سال میں بصرف دولت و راحت
سُنی وہ آج مکمل صُورت میں اُن کے سامنے موجود ہے جس کو وہ چند گھنٹے میں
اس طرح پڑھ سکتے ہیں کہ نہ سفر کی ضرورت ہے نہ صرفِ زر کی حاجت۔

قوم میں ہر خیال کے لوگ ہوتے ہیں۔ ممکن ہے بعض اشخاص ایسے بھی
ہوں جن کے نزدیک کانفرنس کی یہ خدمت مفید و لایق ستایش نہ ہو اور اُن کے
خیال میں اس داستان کہن و افسانہ پارینہ کا شائع کرنا تحصیل حاصل سمجھا جائے۔

لیکن یہ غنیمت ہے کہ ملک میں اہلِ نظر بھی ہیں جو اس کام کی اہمیّت بخوبی سمجھ سکتے ہیں ۔

ہمارے نزدیک مختلف حیثیات سے یہ مجموعہ نہایت مفید و دلچسپ ہے۔ اجمالاً بعض خصوصیات کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے ۔

(۱) اس کتاب کے چالیس ابواب (خطبات) ہیں ۔ لیکن ان ابواب کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ چالیس سال میں لکھے گئے ۔ چالیس اصحاب نے تصنیف کیئے ۔ اور شائع کرنے سے پہلے ہندوستان کے مختلف چالیس موقعوں پر سنائے ۔ ہزاروں سامعین دور و دراز مقامات کا سفر کر کے آئے تاکہ خود مُصنفین کی زبان سے سُنیں ۔ اخبارات نے اِن کو شائع کیا ، اور ہندوستان کے گوشہ گوشہ تک پہنچایا ۔ اور آخرکار چالیس سال بعد یہ کتاب مکمل ہو کر شائع ہوئی ۔ کیا یہ خصوصیت اُردو کی کسی اور کتاب کو بھی حاصل ہے ؟

(۲) عام طور پر ہر کتاب زبان و طرز ادا کے لحاظ سے ابتدا سے انتہا تک ایک شان رکھتی ہے ۔ اگر مُصنّف صاحبِ ذوق ہے اور اُس کو زبان پر قدرت حاصل ہے تو اُس کی کتاب اپنے عہد کی زبان کا بہتر نمونہ ہوتی ہے ۔ لیکن خطبات عالیہ کی یہ خصوصیت ہے کہ زبان کے لحاظ سے اس کا ایک باب دوسرے سے مختلف ہے ۔ چونکہ اس کی

ترتیب و تکمیل چالیس سال میں انجام پزیر ہوئی ہے۔ لہٰذا زبان میں تدریجاً جو انقلابات و تبدیلیاں ہوتی رہیں اور طریقہ ادا، طرز استدلال، اسلوبِ بیان، اور ذخیرۂ الفاظ کے لحاظ سے زبان میں جو ترقی ہوئی ان سب کا اندازہ اس کتاب سے ہوتا ہے۔ ابتدائی خطبات مختصر اور سادہ ہیں۔ اُن میں مضامین کی کوئی خاص ترتیب یا تقسیم نہیں، نہ مختلف تعلیمی مسائل پر بحث ہے۔ بلکہ سادہ زبان میں کانفرنس کی ضرورت کا اظہار کر کے مسلمانوں کو انگریزی پڑھنے کی ترغیب دی گئی ہے، اسی ذیل میں کہیں کہیں اُن نکتہ چیں اشخاص کا جواب بھی ہے جو کانفرنس اور انگریزی تعلیم کے مخالف ہیں۔ زبان میں مغربیت کا اثر مطلق نہیں پایا جاتا۔ البتہ وہ سادہ طرزِ بیان ضرور موجود ہے جو سرسید نے واقعات و مسائل کے بیان کے لیئے اختیار کیا تھا۔ ابتدا میں لوگ زیادہ تر سرسید، نواب محسن الملک، مولٰنا حالی، مولٰنا نذیر احمد اور علّامہ شبلی جیسے یگانۂ روزگار مشاہیر کے دیکھنے اور اُن کا لکچر یا کلام سننے کے لیئے آتے تھے۔ خطبۂ صدارت کو کوئی خاص اہمیت حاصل نہیں تھی۔ صدر قاعدہ کے مطابق اجلاس کا نظم قایم رکھتا۔ مگر سرسید کی زبردست شخصیت سے مرعوب ہو کر اُن کی مرضی کے مطابق کام کرتا تھا۔ لیکن جب چند سال بعد آہستہ آہستہ اس کانفرنس

نے مستقل و مضبوط حیثیت اختیار کرلی، اور تعلیمی کام کے تجربہ کی بدولت بہت سے مسائل بحث و نظر کے لیئے سامنے آ گئے تو خطبۂ صدارت نے بھی ایک خاص حیثیت اختیار کرلی۔ اب صدر کا کام صرف اجلاس کے طریقہ کار کی رہ نمائی کرنا نہ تھا۔ بلکہ لوگ اُس سے یہ توقع بھی کرتے تھے کہ وہ موجودہ تعلیمی مسائل اور زیر بحث مضامین پر مسلمانوں کو اپنے تجربہ و خیالات سے فائدہ پہونچائیگا۔ اُن کی تمام ضرورتوں کے متعلق مفید تدابیر بتا کر اپنی قابلیت کا ثبوت دیگا۔ کانفرنس کے سات ابتدائی اجلاس خطبہ صدارت کے لحاظ سے کچھ ممتاز نہیں ہیں لیکن ۱۸۹۳ء میں جب کانفرنس کا آٹھواں اجلاس علی گڑھ میں منعقد ہوا اور نواب محسن الملک صدر منتخب ہوئے تو خطبہ صدارت میں ایک خاص وسعت و شان پیدا ہوگئی۔ یہ سب سے پہلا خطبہ تھا جس میں زورِ بیان اور جوش پایا جاتا ہے اور انشاپردازی کی ایک خاص جھلک نظر آتی ہے۔ مثلاً نواب صاحب ایک موقع پر نکتہ چینوں کے جواب میں فرماتے ہیں:۔

"مانا کہ ہم نے مغربی علوم کا شوق دلا کر مسلمانوں کو خراب کیا۔ مانا کہ ہم نے انگریزی تعلیم و تربیت کے جاری کرنے سے الحاد پھیلایا۔ مانا کہ ہم نے کانفرنس

قایم کر کے مسلمانوں کو بہکایا۔ مگر ہم پر طعنہ کرنے والے
خدا کے لیئے یہ بتا دیں کہ اُنھوں نے اپنی قوم کے لیئے
کیا کیا، اور اس ڈوبتی ہوئی کشتی کے بچانے میں کون سی
کوشش کی؟ اگر ہم نے مسلمانوں کے لیئے دیر و کنشت
بنایا، مانا کہ گناہ کیا۔ مگر یہ فرمائیے کہ اُن کا بنایا ہوا
بیت المقدس کہاں ہے جہاں جا کر ہم سجدہ کریں؟ اگر ہم نے
اپنے بھائیوں کے واسطے ایک قومی کانفرنس قایم کی،
ہم قبول کرتے ہیں کہ ایک بے سود کام کیا۔ مگر ہمارے
دوست براہ مہربانی یہ فرما دیں کہ اُنھوں نے قوم کے
حال پر مرثیہ پڑھنے، قوم کی مصیبت پر ماتم کرنے پر
کون سی مجلس بنائی ہے کہ ہم وہیں جا کر نوحہ کریں اور سر
پیٹیں؟ ہم اگر مضر یا بے سود کام کرنے کے گنہ گار ہیں تو قوم کو
مرتے دیکھنے اور کچھ نہ کرنے کا ذمہ دار کون ہے

گر دستِ تو کشتن و مرا ن گناہ من	دیدن ہلاک و رحم نہ کردن گناہ کیست
گیرم کہ وقتِ ذبح تپیدن گناہ من	دانستہ دشنہ تیز نہ کردن گناہ کیست

غرض نواب صاحب کی صدارت کے بعد خطبۂ صدارت آہستہ آہستہ
وسعت و جامعیت اختیار کرتا گیا۔ جدید مباحث پیدا ہو گئے۔

انگریزی زبان کے اثر سے اُردو کے ذخیرۂ مفردات و مصطلحات میں اضافہ ہوتا گیا۔ طریقہ استدلال اور طرز ادا میں تبدیلیاں پیدا ہوئیں۔ چنانچہ آج اگر ان خطبات کو مسلسل طریقہ سے پڑھا جائے تو زبان کے یہ تمام ارتقائی مدارج صاف طور پر نظر آتے ہیں اور یہ اندازہ ہوتا ہے کہ زبان نے گزشتہ چالیس سال میں اسالیب بیان اور ذخیرۂ الفاظ کی حیثیت سے کس قدر ترقی کی اور مغربی تعلیم کا خیالات و زبان پر کیا اثر پڑا۔ لہٰذا اس لحاظ سے بھی یہ خطبات ایک خاص حیثیت رکھتے ہیں جو کسی دوسری کتاب کو حاصل نہیں ہے۔

(۳) قدامت و امتداد زمانہ نے اِن خطبات میں ایک تاریخی حیثیت بھی پیدا کر دی ہے۔ جہاں تک تعلیم و تربیت کا تعلق ہے یہ خطبات تمام تعلیمی مباحث پر حاوی ہیں۔ اگر بحث کا کوئی پہلو ایک خطبہ میں رہ گیا ہے تو دوسرے میں موجود ہے۔ ان خطبات سے مسلمانوں کی گزشتہ چہل سالہ تعلیمی تاریخ اجمالی طور پر ہمارے سامنے آجاتی ہے۔ مثلاً ابتدا میں جب مسلمان جدید تعلیم کے مخالف ہیں تو تعلیم کے جواز اور اُس کی ضرورت پر عقلی و نقلی دلائل پیش کیے جاتے ہیں۔ لیکن جب رفتہ رفتہ مسلمانوں کے خیالات میں تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے تو تعلیم کے متعلق بہت سے جزئیات پر بحث کی جاتی ہے۔ اور طریقۂ کار تجویز

کیا جاتا ہے۔ لیکن جب مسلمان تعلیم شروع کر دیتے ہیں تو اس راہ میں مشکلات و دشواریاں پیش آتی ہیں۔ کہیں افلاس زنجیرپا بن جاتا ہے کہیں خاص خاص قوانین سنگ راہ ثابت ہوتے ہیں، کبھی برادران وطن کی ہمہ گیری اور تنگ نظری تعلیم میں مشکلات پیدا کرتی ہے۔ اس لیئے مشکلات کے حل کرنے پر توجہ کی جاتی ہے۔ غربا کی تعلیم کے لیئے وظائف مانگے جاتے ہیں۔ گورنمنٹ سے تعلیم میں آسانیاں بہم پہونچانے کے لیئے مطالبہ کیا جاتا ہے۔ برادران وطن کی بے مہری پر اظہار رنج وافسوس ہوتا ہے۔ مگر ان سب مشکلات کے باوجود تعلیمی کام برابر جاری رہتا ہے۔ یہاں تک کہ مسلمان تعلیم پا پاکر اسکولوں اور کالجوں سے نکلتے ہیں! اور گورنمنٹ کی کچھ ملازمتیں اُن کو حاصل ہو جاتی ہیں۔

جب تعلیم اس حد تک پہونچ جاتی ہے تو مسلمان ایک قدم اور بڑھاتے ہیں، یعنی اب تعلیم نسواں کی ضرورت سامنے آتی ہے اور مسلمانوں کو خطبۂ صدارت میں یہ بتایا جاتا ہے کہ جب تک عورتیں تعلیم یافتہ نہ ہونگی بچوں کی تعلیم و تربیت معقول طریقہ سے ممکن نہ ہوگی۔ کیوں کہ تعلیم کی ابتدا آغوش مادر سے شروع ہوتی ہے۔ چند سال کی پیہم تبلیغ کے بعد مسلمان تعلیم نسواں کی ضرورت کا اعتراف کرتے ہیں۔ کانفرنس

میں ایک مستقل شعبہ قایم ہوتا ہے۔ اور ایک زنانہ اسکول کی بنیاد رکھی جاتی ہے۔

اس کے بعد بالغ العمر مسلمانوں کی تعلیم کی ضرورت محسوس ہوتی ہے چنانچہ اب چند سال سے کانفرنس کے خطبۂ صدارت میں اس پر بحث کی جاتی ہے۔ اور یورپ میں اس کے متعلق جو کچھ ہو رہا ہے اُس کو بطور مثال بیان کیا جاتا ہے۔ اسی سلسلہ میں شبینہ مدارس کے قیام کا معاملہ ہے جس کی ضرورت شدت سے محسوس ہو رہی ہے اس کے ساتھ ساتھ جبریہ و مفت تعلیم کا مسئلہ بھی زیر بحث آگیا ہے اور اس کی ضرورت پر خاص طریقہ سے زور دیا جاتا ہے اور چونکہ حالات کی تبدیلی اور برادرانِ وطن کی ہمہ گیری اور تنگ نظری کی وجہ سے ملازمت کا دروازہ مسلمانوں کے لیئے بند ہو رہا ہے، اس لیئے اب اُن کو صنعتی و تجارتی تعلیم کے حاصل کرنے کی بھی ترغیب دی جاتی ہے۔ کیوں کہ یہ خطرہ پیدا ہو گیا ہے کہ اگر مسلمان صنعت و حرفت پر متوجہ نہ ہوئے تو کسبِ معاش کے زرخیز وسائل سے محروم رہ جائینگے۔ علاوہ خطبۂ صدارت کے یہ مسائل مختلف تجاویز کی صورت میں بھی پیش ہوتے رہتے ہیں۔ غرض حالات کی تبدیلی اور زمانہ کی ترقی پزیر رفتار نے بہت سے جدید مسائل پیدا کر دیئے

اس لیئے دائرۂ بحث روز افزوں وسعت اختیار کرتا جاتا ہے۔ اس بنا پر کانفرنس کے صدر کا یہ فرض ہو گیا ہے کہ وہ اپنے خطبہ میں مسلمانوں کی تمام ضروریات کا استقصا کرے اور اُن کے متعلق مفید تدابیر بتائے خطباتِ عالیہ کے مطالعہ سے یہ سب باتیں اجمالی طور پر معلوم ہو جاتی ہیں اور یہ اندازہ ہوتا ہے کہ گزشتہ چہل سالہ دور میں نظام تعلیم و طریقۂ تعلیم میں کیا تبدیلیاں پیدا ہوئیں۔ اور مسلمانوں پر ان انقلابات کا کیا اثر پڑا۔ اس سلسلہ میں مسلم یونی ورسٹی کی تحریک اور اس کے انجام کا بھی حال معلوم ہوتا ہے۔ غرض سیکڑوں تعلیمی مسائل ہیں جن کی اجمالی تاریخ خطبات کے مطالعہ سے معلوم ہوتی ہے اور وہ طریق کار بھی معلوم ہو جاتا ہے جو بحالت موجودہ مسلمانوں کے لیئے مفید ہے۔ اگر آپ ان خطبات کا غور سے مطالعہ کرینگے تو آپ کو معلوم ہو گا کہ تعلیم کے متعلق کتنے جدید مسائل پیدا ہو گئے اور ملک کی سیاسی و اقتصادی حالت نے مسلمانوں کی تعلیم پر کیا زبردست اثر ڈالا ہے۔ یہ چیزیں آپ کو کسی دوسری کتاب سے معلوم نہیں ہو سکتیں لہذا اس پہلو سے بھی خطبات کا مطالعہ مسلمانوں کے لیئے مفید و سود مند ہے۔

(۴) یہ خطبات درحقیقت علی گڑھ تحریک کی تاریخ کے چند اجزا یا ابواب

ہیں اور ایک اہم ضرورت کو پورا کرتے ہیں۔ بدقسمتی سے علی گڑھ تحریک کے متعلق کوئی مستقل کتاب اب تک نہیں لکھی گئی۔ لیکن آہستہ آہستہ ایسی متعدد کتابیں و رسائل شایع ہو چکے ہیں جن کا مطالعہ علی گڑھ تحریک کے متعلق صحیح معلومات بہم پہونچاتا ہے۔ مثلاً سرسید، نواب محسن الملک وغیرہ کے مضامین جو تہذیب الاخلاق میں چھپا کرتے تھے اب مستقل کتاب کی صورت میں شائع ہو گئے ہیں۔ اسی طرح سرسید، نواب محسن الملک اور شمس العلماء مولانا نذیر احمد کے تمام لیکچر مدت ہوئی چھپ گئے ہیں۔ سرسید کی مکمل سوانح عمری مولانا حالی کے قلم سے حیاتِ جاوید کے نام سے اسی صدی کے اوائل میں شائع ہو گئی جس سے علی گڑھ تحریک کے ابتدائی حالات تفصیلاً معلوم ہو سکتے ہیں۔ ۱۹۲۵ء میں کانفرنس نے نواب وقار الملک کی مکمل لائف وقار حیات کے نام سے چھاپی ہے۔ جس میں علی گڑھ تحریک کے متعلق بڑا ذخیرہ معلومات کا موجود ہے۔ ان سب کتابوں کے علاوہ سرسید، نواب محسن الملک اور نواب وقار الملک کے مکاتیب بھی شائع ہو چکے ہیں جن میں علی گڑھ تحریک کے متعلق بہت سے اہم واقعات ملتے ہیں یہ سب چیزیں کالج کی تاریخ کے اجزا اور ابواب ہیں اور اب خطبات عالیہ نے اس سلسلہ

کو بڑی حد تک مکمل کر دیا ہے۔ اگر کوئی شخص ان سب کتابوں کا مطالعہ کرے تو علی گڑھ تحریک کے متعلق اس کو کافی عبور حاصل ہو سکتا ہے۔ بلکہ ایک سلیقہ مند شخص ان سب چیزوں کو پیش نظر رکھ کر علی گڑھ تحریک کی ایک دلچسپ و مفصل تاریخ مرتب کر سکتا ہے۔ جو کمی تھی وہ خطبات نے پوری کر دی۔ غرض مختلف وجوہ سے یہ خطبات نہایت دلچسپ و سبق آموز ہیں اور جتنا زمانہ گزرتا جائیگا ان کی قدر و قیمت بڑھتی جائے گی۔

یہ خطبات بجائے خود دلچسپ تھے لیکن ہر صدر انجمن کے مختصر حالات و تصاویر نے ان کو اور زیادہ دلچسپ بنا دیا ہے۔ ابھی چونکہ زیادہ زمانہ نہیں گزرا ہے اس لیئے کوشش کرنے سے یہ حالات فراہم ہو گئے۔ ورنہ چند سال بعد تلاش کرنے پر بھی ہاتھ نہ آتے۔ تصویروں کا ملنا تو اور زیادہ دشوار تھا۔ اب بھی ایک سال کی تلاش و خط کتابت کے بعد یہ حالات و تصویریں فراہم ہوئی ہیں۔ نواب صدر یار جنگ بہادر مولانا حاجی محمد حبیب الرحمن خاں صاحب شروانی آنریری سکریٹری ایجوکیشنل کانفرنس نے اس مجموعہ کی ترتیب و تدوین کے لیئے جن صاحب کو منتخب کیا ان کی موزونیت میں کوئی کلام نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ مولوی انوار احمد صاحب زبیری مارہروی (جو ان حالات و خطبات کے جامع ہیں) موجودہ صدی

کے اوایل سے کانفرنس سے وابستہ ہیں۔ اُنھوں نے زمانۂ دراز تک نواب محسن الملک نواب وقار الملک صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب اور نواب صدر یار جنگ بہادر کے ساتھ کانفرنس کا کام کیا ہے اور کانفرنس کے اجلاسوں کے انتظام میں خاص حصّہ لیا ہے۔ اس لحاظ سے وہ گویا کانفرنس کی زندہ تاریخ ہیں۔

گزشتہ چالیس سال میں جس قدر اصحاب کانفرنس کے صدر ہوئے اُن میں سے بجز دو صاحبوں کے مولوی انوار احمد صاحب نے سب کو دیکھا ہے، اکثر سے ملاقاتیں کی ہیں اور اُن کی باتیں سُنی ہیں اور بہت سے لوگوں کے خطبہائے صدارت خود اُن کی زبان سے سُنے ہیں بہت سے بزرگ ایسے ہیں جن کے حالات زندگی دیکھنے کا اُن کو خاص موقع ملا ہے۔ ان حالات کے لحاظ سے اس کام کے لیئے اُن سے زیادہ موزوں کون ہو سکتا تھا؟ اور شاید اب علی گڑھ میں اور کوئی شخص ایسا موجود بھی نہیں جو ایک رُبع صدی سے کانفرنس سے مستقل تعلق رکھتا ہو، جس نے کانفرنس کے اتنے اجلاس دیکھے ہوں، اور کانفرنس کے مقاصد کے سلسلہ میں ہندوستان کے قریبًا ہر صوبہ کا ہزاروں میل سفر کیا ہو۔

چنانچہ جیسی توقع تھی مولوی انوار احمد صاحب نے اس خدمت کو نہایت دلچسپی اور ذوق کے ساتھ انجام دیا۔ حالات کے سلسلہ میں بہت سی خبریں اُنھوں نے ایسی لکھی ہیں جن کے وہ چشم دید راوی ہیں۔ یہ واقعات ہم کو

صرف اُن ہی سے معلوم ہو سکتے تھے۔ اب جو شخص آئندہ علی گڑھ تحریک کی تاریخ مرتب کرنا چاہے اُس کے لیئے مولوی انوار احمد صاحب کی یہ کتاب بہت مفید و کار آمد ہو اور عام ناظرین کے لیئے بھی جو قومی تحریکات سے کچھ بھی تعلق رکھتے ہیں نہایت دلچسپ ثابت ہوگی، اور حسن قبول حاصل کریگی۔ امید ہے کہ کانفرنس کی چالیسویں سالگرہ (اجلاس) کے موقع پر (جو امسال مدراس میں ہے) اس کتاب کا شایع ہونا دلچسپی کا باعث ہوگا! اور مدراس کا چالیسواں خطبۂ صدارت کانفرنس کی تاریخ کو ۱۹۲۷ء تک مکمل کردیگا۔

خاکسار

محمد اکرام اللہ خاں ندوی
شاہجہاں پوری

سلطان جہاں منزل علی گڑھ
۲۰ مئی ۱۹۲۷ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دیباچہ

نوشتۂ جامعِ اوراقِ ہٰذا

ہر زبان کے خطیبوں کے خیالات اور افکار ذہنی و دماغی کا ذخیرہ اُس زبان کا بیش بہا سرمایہ متصور ہوتا ہے جس زبان میں کہ وہ ادا کیئے جاتے ہیں جو اپنے زمانہ کے لحاظ سے راہ عمل اور مستقبل کے لیئے قوم کی ہمت اور جوش کا افسانہ تاریخی صفحۂ عالم پر اُن کے کارنامۂ عمل کی زندہ یادگار بن کر چمکتا ہے۔ موجودہ نسلیں اُن کے ساتھ خواہ کچھ ہی سلوک کیوں نہ کریں لیکن یقیناً آنے والی نسلیں اُس کو شوق سے پڑھتی ہیں اور اپنے ماحول کے مطابق گزرے ہوئے حالات کے لحاظ سے استخراج نتائج میں اپنے پیش رووں کے ٹھوس اور عمیق افکار سے مدد لے کر اُن کی دماغی کاوشوں کا خواہ وہ ملکی پالیٹکس سے تعلق رکھتی ہوں خواہ تعلیمات عامّہ یا بہبودئیے قوم کے دیگر امور مہمات سے، غرض ہر طرح سے ان کا خیر مقدم کرنے میں پیش قدمی کی کوشش کرتی رہتی ہیں۔
اسی کا نتیجہ ہے کہ مہذب اور تعلیم یافتہ دنیا طرح طرح سے اپنی قوم کے دانشوروں

کے خیالات کی اشاعت کرتی رہتی ہے؛ گویا اس طریقہ سے گزرے ہوئے لوگوں کا پیغام آنے والی نسلوں کو پہونچا کر ان میں عمدہ تعلیم بہتر تربیت، پاکیزہ اخلاق کی تخم ریزی کر کے ان کی نشو ونما میں مصروف نظر آتی ہے اور اس طریقہ سے قوم میں کسب فضایل اور ترک رزائل کا سلسلہ نا متناہی جاری رہ کر قوم کی عزت اور وقار کا درجہ علمی اور اخلاقی حیثیت کے لحاظ سے بتدریج ترقی کرتا ہوا چلا جاتا ہے۔

اٹھارھویں صدی کے آخر سے انیسویں صدی کے چوتھائی سے زیادہ عرصہ تک مسلسل چالیس بیالیس برس کی مدت میں آل انڈیا (سابق محمدن حال مسلم) ایجوکیشنل کانفرنس نے مسلمانان ہندوستان میں جس استقلال و استقامت کے ساتھ تعلیمی منادی کا فرض انجام دیا ہے اور جس طرح قوم کے اندر علوم جدیدہ کی اشاعت و تبلیغ میں پانی کی طرح روپیہ بہایا ہے جو بلاشبہ یہ ایک بیش بہا قومی خدمت ہے۔ جس زمانہ میں اور جن حالات کے اندر کانفرنس قایم ہوئی اس وقت دنیا متحرک تھی اور مسلمان ساکن و جامد قومی تعلیم کے لحاظ سے وہ ایک تاریک زمانہ تھا جس کے اندھیرے میں ہماری تمام حسیات ملّی مُردہ ہو رہی تھیں۔ اس مجلس کے میر مجلسوں نے زود حاضرہ کی ضرورت اور حقائق حالات کی بنا پر اپنے زبردست خطبوں کے ذریعہ سے قوم کو تعلیم پر متوجّہ کرنے کی اہم کوشش کی اور ان کے پُر جوش خطبوں نے اور کانفرنس کی لگاتار تبلیغ نے جو انقلاب مسلمانوں کی تعلیمی ترقی اور دماغی حالت کی مناسبت سے کیا ہے اور اکتساب علوم جدیدہ کی وجہ سے علم و فن کی مختلف شاخوں میں قوم میں جو آثار ترقی ظاہر ہو رہے ہیں وہ اس قابل ہیں کہ کتابی شکل میں قوم کے روبرو پیش کیے جائیں۔ لہٰذا میں نے چاہا کہ یہ خطبے جو کانفرنس کی چالیس سالہ رپورٹوں میں منتشر ہیں اور اب بھولے بسرے

ہوگئے ہیں ایک مجموعہ کی شکل میں موجودہ نسل کے سامنے ان کو لایا جاوے جن کے سننے اور دیکھنے سے وہ اب تک محروم ہے، کیوں کہ یہ ایک وقتی سخن دانی نہ تھی جو ایک مرتبہ سُن لی اور سامعہ نواز ہوگئی ضرورت تھی کہ ان پھولوں کو جو چالیس برس کی گل چینی کا نتیجہ ہیں ایک گلدستہ میں ترتیب کے ساتھ لگایا جائے تاکہ اپنے اپنے مذاق کے مطابق ان کی نزہت، خوش بو، اور مہک سے جسم قومی کی روح کو تسکین اور طاقت پہونچتی رہے۔

جن باوقار لوگوں نے کانفرنس کے جلسوں کی صدارت کے فرایض انجام دیئے ہیں وہ اپنی مختلف النوع قابلیتوں اور اوصاف کے لحاظ سے اپنے اپنے دَورِ زندگی میں اس پایہ کے بزرگ تھے اور ہیں جن کا مرتبہ نہ صرف علمی حیثیت سے بلند نظر آتا ہے بلکہ ان کی اصابت رائے اور ان کی قومی ہمدردی کی وجہ سے بھی خواہان قوم کے سربرآوردہ طبقہ نے اُن کو منصب صدارت پر منتخب کر کے عملاً اُن کے فضل و کمال کا اعتراف کیا اس لحاظ سے ہم بلاخوف تردید کہہ سکتے ہیں کہ وہ "گروپ" جس میں چالیس سالہ مجلس تعلیم کے صدر بیٹھے ہوئے نظر آتے ہیں اور جن کی تعداد (۳۲) ہے وہ بلاشبہ بتّیس کروڑ مسلمانان ہندوستان کے قایم مقام اور مسلم جماعت کے روح رواں ہیں۔ اور اس لحاظ سے مذکورۂ بالا خطیبوں کے خطبے ہماری گزشتہ اور موجودہ دَورِ زندگی کی ایک ایسی تاریخ ہے جس کے سننے سے ہم چونکے، بیدار ہوئے اور اپنی غفلتوں کا ہم کو علم ہوا، اور جن پر عمل پیرا ہونے سے ہم اپنی تعلیمی جد و جہد میں کامیاب ہوتے نظر آتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ آیندہ بھی ان خیالات کے مطالعہ سے ہم اپنی فرد گزاشتوں پر مطلع ہو کر ملکی اور ملّی فوائد کے لحاظ سے اپنی قومی زندگی کو کامیاب تر بنا سکتے ہیں۔

الحمدللہ کہ چند روز کی محنت و دماغ سوزی سے تقریباً نصف صدی کے بہترین اشخاص اور عالمانِ زمانہ کے خیالات کا بیش بہا سرمایہ مرتب ہو کر اس قابل ہوا کہ **"خطبات عالیہ"** کے نام سے قوم کے ہاتھ میں پہونچایا جا سکے۔ یہ مجموعہ نہ صرف باکمالوں کی رائے ان کے تجربہ، اور ذہنی و دماغی قوتوں کو آپ کے سامنے لاتا ہے بلکہ ان کے ساتھ ان مشاہیر قوم کی مختصر بائیوگرافی بھی اس میں شامل کی جاتی ہے جس کے مطالعہ اور پیروی سے ہماری زندگی کی دشوار گزار منزل آسانی کے ساتھ کٹ سکتی ہے۔ ان نوشتوں پر عمل کرنے سے ہم اپنی قومی خصوصیات کو عملی و علمی لحاظ سے پھر واپس لا سکتے ہیں اور دُنیا میں اخلاق محمّدی کا پھر ایک ایسا نمونہ اپنی ذات میں پیدا کر کے دُنیا کو مجبور کر سکتے ہیں کہ وہ مسلم اخلاق کو ماننے اور اُس کی تعظیم کرے۔

یہ انسانی فطرت ہے کہ وہ بڑے لوگوں کے حالات کو اور ان کے نام اور کام کو معلوم کرنے کے بعد اس امر کا خواہش مند پایا جاتا ہے کہ ممکن ہوتا تو وہ نہ صرف ان کے خیالات سے استفادہ کرتا بلکہ وہ ان کو اپنی آنکھوں سے بھی دیکھتا اور اُن کے خط و خال سے اُن کی غیر معمولی سمجھ کی شناخت کرتا۔ ہم نے اس خیال کو پیش نظر رکھ کر حتی الامکان کوشش کی کہ مشاہیر مذکورۂ بالا کے فوٹو بھی اُن کے حالات اور خطبات کے ساتھ چھاپے جاویں جو ایک حد تک اس خواہش کو پورا کر سکتے ہیں۔ بہت سی کاوش کے بعد جن جن اصحاب کے فوٹو دستیاب ہو سکے وہ زیب خطبات کر کے کتاب کو ممکن سے ممکن طور پر دلچسپ بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔

غالباً یہ ظاہر کرنا بھی بے موقع نہ ہوگا کہ اس مجموعہ کی ترتیب و تیاری میں

درحقیقت مخدومی نواب صدر یار جنگ بہادر مولانا الحاج محمد حبیب الرحمن خاں صاحب شروانی کا ذوق ادب کارفرما تھا۔ نواب صاحب ممدوح علاوہ علمی و ادبی ذوق کے اسلاف کرام کے کارناموں کو منظر عام پر لانے کے لیئے ہمیشہ تیار رہتے ہیں آپ کا خیال ہے (اور بالکل بجا ہے) کہ یہی چیزیں قوم میں زندگی کی روح پیدا کر سکتی ہیں زیادہ تر اسی جذبہ نے مجکو آمادہ کیا کہ اس دورِ آخر کے مشاہیر کے حالات زندگی اور ان کے خیالات موجودہ نسل تک پہونچاؤں تاکہ قوم کے نوجوانوں کو معلوم ہو کہ اس زمانۂ زوال و انحطاط میں بھی ہماری قوم میں کیسے کیسے بزرگ موجود ہیں اور اُن کے قیمتی خیالات و حالات ہماری تعمیری زندگی کے لیئے کیسے مفید و کارآمد ہیں۔ زمانہ کی ایک یہ بھی علمی تہذیب ہے کہ جس فن اور مسئلہ کے متعلق کوئی کتاب لکھی اور چھاپی جاتی ہے اس فن کے نقاد اور مُبصّر سے نقد و تبصرہ کی خواہش کر کے مقدمہ نگار کے خیالات اور آرار کا اظہار اس کی زبان میں ضروری خیال کیا جاتا ہے۔ میرے فاضل دوست مولوی اکرام اللہ خاں صاحب (ندوی) جو عربی ادب کے ذوق آشنا اور زبان اُردو کے پختہ کارنا ثر ہیں اور جن کو بہ سلسلہ تالیف و ترتیب "وقار حیات" نیز صدر دفتر کانفرنس کے تعلق کی وجہ سے علی گڑھ تحریک کے متعلق وسیع لٹریچر کے مطالعہ کا کافی موقع ملا ہے اور جنھوں نے میری اس تجویز (ترتیب "خطباتِ عالیہ") سے پوری دلچسپی کا اظہار کر کے مجکو اس کام کے لیئے آمادہ کیا جب میں نے بوجوہ بالا موصوف سے مقدمہ نگاری کی خواہش کی تو اُنھوں نے میری درخواست کو منظور کیا اور جملہ خطبات کا از سرِ نو مطالعہ کر کے ایک دلچسپ مقدمہ تحریر فرمایا جو ان خطبات کے ساتھ شامل ہے۔ خطبات کی ترتیب و تدوین سے

پہلے نیز دورانِ ترتیب میں اس کام کی ضرورت و اہمیت کے متعلق دل میں شبہات تھے لیکن مقدمہ کے دل آویز بیان نے جس طرح اس ضرورت کا مجکو یقین دلایا، ناظرینِ خطبات کے نزدیک بھی غالبًا یہ محنت رائیگاں نہ سمجھی جاویگی۔

چالیس برس کے خطبات کا مجموعہ بجائے خود ایک بڑی کتاب کی حیثیت رکھتا ہے اِس پر ہر صدر کے مختصر حالات زندگی کا اضافہ پھر مقدمہ اور فوٹو کی کاپیاں، اس لحاظ سے کہ وزن زیادہ نہ بڑھے، اور کتاب کا مطالعہ دلچسپی اور آسانی کے ساتھ کیا جاسکے چالیس برس کو تین زمانوں پر تقسیم کرکے بیس۲۰ برس کی ایک اور دس۱۰ دس برس کی دو دو جلدیں کردی گئی ہیں پھر بھی ہر جلد کا حجم کافی وقیع ہے۔

اس موقع پر مجکو اپنے برادر عزیز امداد احمد زبیری سلمٗ کا بھی جو مُسلم یونی ورسٹی میں بی اے کلاس کا طالب علم ہے شکریہ ادا کرنا چاہیئے جس نے بعض اصحاب کے حالات کے انگریزی سے اُردو ترجمہ میں مجکو مدد دی۔ میں مکرمی خاں صاحب میر ولایت حسین رضؔ صاحب بی اے، سپرنٹنڈنٹ کانفرنس آفس کا بھی ممنون ہوں کہ جب کسی مدد کی میں نے ان سے خواہش ظاہر کی تو اس بارہ میں نہ صرف میری مدد کی بلکہ اس کی تیاری و ترتیب کے متعلق بھی مجکو ترغیب دی۔

بلاشبہ اگر یہی کام دوسرے قابل ہاتوں کی مدد سے انجام پاتا تو کسے انکار ہوسکتا ہے کہ وہ موجودہ حیثیت سے زیادہ دلچسپ اور زیادہ مفید ہوتا۔ لیکن اتنے عرصہ تک جب کسی نے نہ کیا تو نہ ہونے سے ہونا گو وہ غیر مکمل صورت ہی میں ہو بہتر ہے۔ اب ان دھندلے خاکوں میں رنگ بھرنا اور نقش و نگار پیدا کرنا آیندہ اُس مصوّر کا کام ہے جو تاریک اور روشن دونوں پہلوؤں

کا اندازہ داں ہوگا۔

سلطان جہاں منزل
(صدر دفتر کانفرنس)
علی گڑھ

مئی ۱۹۲۷ء

سراپا گنہگار خاکسار
انوار (مارہروی)





مولوي حاجي محمد سميع الله خاں
صدر اجلاس اول (علي گده سنه ۱۸۸٦ ع)

اجلاس اوّل

(منعقدہ علی گڑھ ۱۸۸۶ء)

صدر مولوی حاجی محمد سمیع اللہ خاں صاحب مرحوم سی ایم جی

رئیس دہلی

حالات صدر

ممدوح جن کا قریب قریب صحیح سنہ ۱۸۳۴ء میں اپنے وطن (دہلی) میں پیدا ہوئے۔ نسبتاً "علوی" تھے جن کا سلسلہ چونتیسویں پشت میں حضرت علی علیہ السلام پر ختم ہوتا ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب کہ ہندوستان میں مسلمانوں کا دورِ اقبال تنزل و انحطاط کے آخری درجے طے کر رہا ہے۔ مسلمانوں کی فرماں روائی اور سلطنت کا خاتمہ ہو چکا ہے۔ جہاں گیری اور عالمگیری کی عالم گیری سمٹ کر لال حویلی کی محدود چہار دیواری میں محصور رہی اور شمع اقبال شمع سحری بن کر بجھنے کے قریب ہے۔ سوسائٹی سے اچھی سیرت اور بزرگوں کے اخلاق اور ان کے علم و فضل کی جگہ جہالت، تعصبات توہمات، مراسم پرستی لیتی جاتی ہے۔ دولت و حشمت کی بربادی کے ساتھ شرافت نفس کے جذبات عالیہ ایک ایک کر کے قوم سے رخصت ہونے کے طالب ہیں۔ انھوں نے جب دارالخلافہ "دہلی" میں آنکھیں کھولیں اور ہوش سنبھالا تو بزم نشاط و اقبال کی جگہ صف ماتم بِچھی دیکھی۔ رہروان صراط مستقیم کے نقش پا کی جگہ بچی کھچی یادگاروں کو اپنے سامنے اُجڑتے اور مٹتے ہوئے دیکھا۔ اس بدبختی اور بدنصیبی کے دور میں بقیۃ السیف چند ہستیاں ایسی باقی تھیں جو تشنہ کامِ علم و ہدایت کی رہنمائی اور تہذیب نفوس کی کارفرما تھیں۔ مولوی سمیع اللہ خاں شروع زمانہ بچپن ہی سے غیر معمولی طور پر ذہین معلوم ہوتے تھے اور آثار رشد و ہدایت ان کی پیشانی سے ہویدا تھے۔ جس گھر میں ان کی پیدائش ہوئی تھی وہ خود تہذیب و شائستگی اور امارت کا گہوارہ رہ چکا تھا۔ شفیق باپ نے شروع سے اکتسا

علم وفضل کی طرف توجہ کی۔ بیٹے کی فطری ذہانت اور سعادت نے صلاحیت نفس کی بشارت دے کر ہمّت کا قدم آگے بڑھایا۔ رسم بسم اللہ خوانی کے بعد حرف شناسی سے آگے بڑھے تو مولوی محمد حسین نے فارسی کی تعلیم دی۔ میر پنجہ کش نے خوش نویسی میں دستگیری کی۔ مولوی مملوک علی، مولوی سید محمد جیسے جید علماء اور مفتی صدرالدین خاں جیسے علّامۂ یگانہ کی توجہ سے اٹھارہ برس کی عمر میں معقول، منقول، فقہ، اصول فقہ، حدیث وغیرہ کی تکمیل کر کے طلبہ کی صف سے نکل کر خود مسند علم کے جانشین اور وارث قرار پائے۔ ان کی علمی شہرت نے دور دور کے طلبہ کو ان کے حلقۂ درس اور آغوش تعلیم و تربیت میں جابٹھایا۔ مولوی صاحب بڑے ذوق و شوق سے پڑھاتے تھے بالخصوص ان کے طرز تعلیم کی ان دنوں (دلّی) میں خاص شہرت تھی۔ لڑکپن ہی سے ان کو میلوں ٹھیلوں، مجمعوں اور سیر تماشوں سے نفرت تھی۔ چنانچہ غیر مشروع امور سے وہ اپنی زندگی کے آخری لمحوں تک متنفر رہے۔ وہ ہمیشہ اعلیٰ و ادنیٰ سے با خلاق پیش آتے تھے۔ ان کی زبان سے کریہہ اور ثقیل الفاظ کبھی ان کے نوکروں تک نے نہیں سُنے۔ وہ اعتدال کو ہر کام اور ہر حالت میں ملحوظ رکھتے تھے۔ روپیہ پیسہ خرچ کرنے میں مفید اور غیر مفید باتوں کا لحاظ پیش نظر رہتا تھا۔ اسراف سے نہایت احتیاط تھی لیکن قومی اغراض میں بے دریغ روپیہ صرف کرتے تھے۔ مدرستہ العلوم علی گڑھ کو سیکڑوں اور ہزاروں روپیہ چندہ میں اُنھوں نے دیا

تحصیل علم کا شوق ہر زمانہ میں رہا اور کتاب کے مطالعہ نے آخر وقت تک حقِ رفاقت ادا کیا۔ سنجیدگی متانت اور وقار کی وہ تصویر تھے۔ ہنسی، چہل کی باتیں کرنا وہ جانتے ہی نہ تھے۔ احکام مذہب کی عظمت اور بزرگی ان کی زندگی کا نصب العین رہی۔ نماز کے وہ ایسے پابند تھے کہ جب سے وہ فرض ہوئی مدت العمر کبھی قضا نہ کی۔ یہی حال روزہ کا تھا کہ کیسا ہی گرم موسم ہو وہ روزے برابر رکھا کرتے تھے۔ جنوری ۱۸۷۱ء میں اُنھوں نے حجاز کا سفر کیا۔ مکہ مکرمہ میں حج اور زیارت سے فارغ ہو کر مدینۂ طیبہ میں روضۂ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر حاضر ہوئے اور فیوض و برکات حاصل کرنے کی کوشش کی۔ ڈھائی مہینے مکہ مکرمہ میں اور چھ مہینے مدینۂ طیبہ میں قیام کیا۔ دورانِ قیام مکہ مکرمہ میں مولانا حافظ محمد عبدالحق صاحب مکّی سے جو عالمِ باعمل بزرگ تھے، سندِ "دلائل الخیرات" حاصل کی اور بعد از مراجعت سفر حجاز اس کو صحت کے ساتھ چھپوا کر شائع کیا۔

علوم رسمی اور مذہبی کے درجۂ فضیلت کو طے کرنے کے بعد ۱۸۵۶ء میں اُنھوں نے قانونی تعلیم کی طرف توجہ کی اور امتحان وکالت اور منصفی میں کامیاب ہوئے۔ جب ان امتحانوں میں یہ کامیاب ہوئے اور کامیابی کی خبر ان کے اُستاد علامۂ زماں مفتی صدرالدین خاں نے سُنی تو خوش ہو کر ان کو مبارکباد دی اور آبدیدہ ہو کر کہا "افسوس اب تم مشاغل قانونی میں مصروف رہ کر علوم قدیمہ کی شمع کو روشن نہ رکھ سکو گے۔ تمھارے اُستادوں کا نام زندہ نہ رہ سکے گا جنھوں نے اس غرض سے جہاں تک ان سے ممکن تھا تمھیں علم و ادب سے آراستہ

کیا تھا۔"

ہولناک زمانہ غدر کو انھوں نے اپنی ہوشمندی کے عالم میں دیکھا۔ عام ہمدردی اور حسن سلوک ان کا فطری جوہر تھا دہلی میں جو تباہی مسلمان امرا اور شرفا پر آئی وہ ان سب کے شریک حال تھے۔ ہمدردی اور نیکی کا ہاتھ بڑھانے میں جو کارنمایاں انھوں نے اس پرآشوب وقت میں انجام دیئے، یہ کہنا مبالغہ نہیں کہ خدا ترسی کے امتحان میں وہ پورے اُترے۔ بیسیوں شرفار کے جرمانے اُنھوں نے اپنے پاس سے ادا کئے اور بیسیوں قیدیوں کو جیل خانہ کی کوٹھریوں سے نکالا۔ خود ان کے استاد مفتی صدرالدین خاں بہ سلسلۂ بغاوت نظربند ہوئے۔ مولوی صاحب نے ان کی رہائی کے لئے جان لڑادی انجام کار مفتی صاحب تمام شبہ شبہات سے بری ہوئے اور جو جائداد ان کی ضبط ہوگئی تھی وہ بھی واپس دی گئی۔ ایک نواب زادے کو پھانسی ہوتی ان کی رہائی کے لئے سرسید ان دنوں میرٹھ میں بیٹھے ہوئے اور سمیع اللہ خاں دلی میں رہ کر ان کی جان بچانے کی کوششیں کررہے تھے۔

دلی میں ہنگامۂ فنا گرم ہے۔ جہاں جس کا موتھ سرسماتا ہے بھاگنا چاہتا ہے۔ سمیع اللہ خاں بھی تنگ دل ہیں۔ اور بال بچوں کو لے کر باہر جانے کی فکر میں ہیں۔ سواری عنقا ہے۔ بہزار خرابی رتھیں حاصل کیں۔ ایک میں اپنے بیوی بچوں کو بٹھایا دوسری رتھ لے کر سرسید کے گھر پہونچے۔ اس میں اُن کی بیوی اور بچوں کو جن میں سید محمود اور سید حامد بھی تھے سوار کرایا۔ اور سب کو ساتھ لے کر اور خود پاپیادہ سفر کرکے نظام الدین اولیا پہونچے۔

سرسید کی والدہ اور ان کی خالہ باوجود اصرار کے گھر چھوڑنے پر راضی نہ ہوئیں۔ ان کے جانے کے بعد سرسید کے ماموں وحیدالدین خاں اور ان کے ماموں زاد بھائی ہاشم علی خاں دونوں نشانۂ بندوق بنے۔ بوجہ قابلیت ذاتی اور شرافت خاندانی ۱۸۵۸ء میں ان کو عہدۂ منصفی دیا گیا اور کانپور میں تعیناتی ہوئی۔ چار سال تک منصفی کرنے کے بعد ان کو وکالت کرنے کا خیال آیا۔ اس شوق نے ترک ملازمت پر آمادہ کیا۔ اور ۱۸۶۲ء سے ۱۸۷۳ء تک تخمیناً گیارہ سال تک نہایت شہرت کمال نیک نامی کے ساتھ آگرہ اور الٰہ آباد کی صدر دیوانی اور صدر نظامت و ہائی کورٹ میں فرائض وکالت انجام دیئے۔

دلی میں جس طرح ان کا گھر مدرسۂ دینیات تھا اور دور دور کے طالب علم ان سے پڑھنے آتے تھے اسی طرح دور وکالت میں اس زمانہ کے نوجوانوں کو پیشۂ قانون کی طرف مائل کرکے درس قانونی دیا کرتے تھے۔ چنانچہ میرٹھ کے مشہور وکیل سید محمد حسین، سہارنپور کے مشہور مقنن مولوی ناظر حسن اور علی گڑھ کے نامور وکیل خواجہ محمد یوسف، مولوی سمیع اللہ خاں کی قانونی تعلیم کے ثمر اول تھے۔ ۱۸۷۲ء میں جب سید محمود انگلستان سے بیرسٹر

بن کر لوٹے اس وقت مولوی سمیع اللہ خاں الہ آباد میں تھے۔ سید محمود کو آپ نے عملی حیثیت سے اس پیشہ
کے رموز و اشارات سے واقف کیا اور جب خود سب جج کے عہدے پر پہونچے تو اپنے تمام مقدمات ان کو دیئے
۱۸۷۳ء میں مولوی صاحب کے یوروپین دوستوں خصوصاً آنریبل جسٹس بی پیرسن نے ان کو سرکاری
ملازمت اختیار کرنے کا مشورہ دیا۔ ہندوستانیوں میں طبقۂ وکلاء کے آپ پہلے ممبر تھے جو پہلی بار صدر الصدور
بنائے گئے۔ چنانچہ عہدۂ صدر الصدوری کا جائزہ سب سے پہلے آپ نے علی گڑھ میں لیا۔

ان کے کامیاب پیشۂ وکالت کی تعریف میں اور مسلّمہ قانونی قابلیت کی مدح میں اور ان کے ممتاز سوانح زندگی
کے حالات میں ۱۰ ستمبر ۱۹۰۸ء کو اخبار پانیر نے خاص طور پر ایک آرٹیکل نکالا جس میں ان کی نادر الکلامی قانونی
موشگافیوں کی داد دی گئی تھی۔ نیز ہائی کورٹ کے ججوں نے ان کے تقرر صدر الصدوری کے عہدے کے
موقع پر ان کی قانونی قابلیت کا منظر عام پر اعتراف کر کے اظہار مسرت کیا تھا۔

زمانہ وکالت کا بہت سے موکلوں پر محنتانہ باقی رہ گیا جس کی تعداد تقریباً ساٹھ ہزار روپیہ ہوتی تھی
جب وہ علی گڑھ میں صدر الصدور ہو کر آ گئے تو اکثر موکل محنتانہ لے کر آئے۔ لیکن انھوں نے اس
خیال سے کہ جب وکالت ترک کر دی پھر محنتانہ واپس لینے کا خیال بھی چھوڑ دیا اور آئی ہوئی رقوم واپس
کر دیں وہ نہایت نامی گرامی صدر الصدور کی حیثیت سے علی گڑھ، الہ آباد، مراد آباد اور فتح گڑھ میں کارفرما
رہے۔ جس وقت وہ ایک جگہ سے دوسری جگہ کو تبدیل ہوتے تھے تو گروہ خواص سے لے کر عام پبلک تک
میں اداسی چھا جاتی تھی۔

علی گڑھ سے مراد آباد کو ۱۸۸۱ء میں آپ کا تبادلہ ہوا۔ انسٹی ٹیوٹ گزٹ مورخہ یکم اکتوبر ۱۸۸۱ء میں آپ
کے الوداعی جلسہ کی کیفیت نہایت غمگین اور افسردہ الفاظ میں ڈوبی ہوئی نظر آتی ہے۔

مولوی صاحب نے بیرون ہندوستان کے تین سفر کئے۔ ۱۸۸۰ء میں انگلستان اور دوسرا ۱۸۸۴ء
میں مصر کا، تیسرا سفر حجاز تھا جس مقصد سے سر سید انگلستان گئے تھے یہی مقصد ان کا بھی تھا۔ چنانچہ اپنے سفرنامہ
انگلستان کے ایک ٹکڑے میں وہ اپنے اغراض سفر کے سلسلہ میں لکھتے ہیں۔

"میرے دل میں ایک مدت سے دو سفروں کا شوق تھا۔ ایک تو عرب کے سفر کا اور دوسرے یورپ کے
سفر کا۔ عرب کے سفر کو زیادہ تر تعلق مذہبی حالت سے ہے اور یورپ کے سفر کو انسان کی بھلائی، ملکی و قومی
ہمدردی اخلاقی و معاشرتی و دماغی خیالات کی ترقی سے۔ میں نے عرب کا سفر ہنوز نہیں کیا ہے"

دوسرا سفر مصر کا ملکی سیاست کے تقاضے سے تھا۔ ۱۸۸۴ء میں ارل نارتھ بروک سابق وایسرائے ہند
جب مصر کے لارڈ ہائی کمشنر کر کے مصر میں مامور کئے گئے تو انھوں نے گورنمنٹ ہند سے ایک لائق اور قابل

شخص کے مانگے جانے کی خواہش کی اور اس ذریعہ سے اس اہم خدمت پر مولوی صاحب منتخب کیئے گئے۔ انھوں نے یورپ اور مصر دونوں سفروں کے نہایت دلچسپ سفرنامے لکھے ہیں جن کے پڑھنے سے ان ملکوں کے اس زمانہ کے حالات پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ وہ یورپ کی ہر چیز کا خصوصاً تعلیم گاہوں کا غور سے مطالعہ کرتے تھے اور انھوں نے یورپ کے اسباب ترقی کو گہری نظر سے دیکھا تھا۔ جب وہ یورپ سے واپس ہوئے تو سرسید نے بمبئی جاکر ان کا استقبال کیا اور انھیں جہاز سے اُتارا۔

جب مولوی صاحب مصر کے کار خاص سے سبک دوش ہوکر ہندوستان واپس آئے تو سر الفرڈ لائل لفٹنٹ گورنر کے عہد میں سب جج کے عہدے سے آپ ڈسٹرکٹ اور سشن جج کے ممتاز عہدے پر فائز کئے گئے اور تقریباً (۸) سال تک ایک فاضل اور نامور جج کی حیثیت سے آپ نے اس اہم ذمہ داری کی خدمات نیک نامی کے ساتھ انجام دیں۔ آپ کی صحت نہایت عمدہ حالت میں تھی۔ چاہتے تو عرصہ تک اس عہدے پر رہ سکتے تھے لیکن اس خیال سے کہ دنیا گزشتنی وگزاشتنی ہے۔ فیصلہ کیا کہ آخر زمانۂ حیات یادِ خدا میں بسر ہو۔ چنانچہ ۱۸۹۲ء میں اپنی خواہش سے وظیفہ لے کر سرکاری خدمت سے علحدگی اختیار کرلی۔

ان کے ترک ملازمت کو حاکمان اعلیٰ نے نقصانِ عظیم محسوس کیا اور گورنر سے لے کر ہائی کورٹ اور ملکی اخبارات تک نے ان کی سروس سے علحدگی پر اظہار افسوس کیا۔ ان کو تصنیف وتالیف سے بھی ذوق تھا کتب درسیہ کی ادق کتابوں پر عربی زبان میں حسب ضرورت حواشی تحریر کرکے ان کو چھپوایا۔ اسی طرح فلسفہ کی کتا پر حواشی لکھے۔ حال کی قانونی کتابوں کا خلاصہ قلمبند کیا۔ اگر ان کی تمام تصنیفات شائع ہوجاتیں تو بلاشبہ وہ ایک مفید ذخیرہ علمی اپنی یادگار میں چھوڑتے مگر افسوس کہ یہ تمام ذخیرہ دہلی کی مصیبت میں تلف اور برباد ہوگیا۔

ملکی اور شاہی تقریبات میں ہمیشہ ان کی ممتاز جگہ ہوتی تھی ۱۸۸۳ء میں بمقام لکھنؤ نواب لفٹنٹ گورنر نے ایک خاص جلسہ میں ان کے سینہ پر سی ایم جی کا تمغہ آویزاں کیا۔ اور اس معزز خطاب شاہی کی سند دی جو ملک معظم کی طرف سے عطا ہوئی تھی۔ اس خوشی میں امرا اور اکابر لکھنؤ نے اسی دن قیصر باغ کی بارہ دری میں مولوی صاحب کو ڈنر دیا۔ اس جلسہ کے صدر شاہزادہ مرزا سلیمان قدر بہادر سابق شاہ اودھ کے بھائی تھے۔

وظیفہ یاب ہونے کے بعد سر سالار جنگ اول سالار جنگ ثانی نواب وقار الامرا اور سر آسمان جا بہادر غرض چاروں مدار المہام سرکار آصفیہ نے وقتاً فوقتاً ایما فرمایا کہ مولوی صاحب حیدر آباد میں سرکار آصفیہ کے دامن دولت سے وابستہ ہوجائیں۔ ڈھائی ہزار تنخواہ کے علاوہ یہ ترغیب بھی دی گئی تھی کہ مولوی صاحب کے پسر اکبر کو تاحیات تین سو روپیہ ماہوار کا منصب بھی سرکار نظام سے عطا ہوگا۔ اس کے علاوہ ان کے اخراجا

تعلیم متعلق انگلستان کا بار بھی خزانہ عامرہ پر رہے گا جس کی مجموعی رقم تیس ہزار ہوتی تھی۔ یہ بھی وعدہ تھا کہ واپسی پر اور اختتام تعلیم انگلستان کے بعد وہ بھی خدمت شائستہ پر فائز کئے جائیں گے لیکن ان کی قناعت اور گوشہ گیر طبیعت پر کسی ترغیب اور تحریص کا رنگ نہ چڑھنا تھا نہ چڑھا اور شکر و تشکریہ کے ساتھ اس وابستگی سے دامن بچائے رہے۔

ان کی زندگی کا بڑا مقصد اور شروع خیال قومی تعلیم تھا۔ درس و تدریس سے فارغ ہونے کے بعد ان کی تجویز تھی کہ مسلمانوں میں عربی تعلیم کی رغبت اور خواہش پیدا کی جاوے چنانچہ ۱۸۶۲ء میں انھوں نے دہلی میں عربی کا مدرسہ کھولا۔ کلکتہ مدرسہ میں مولوی سید بدرالدین جو رئیس المدرسین تھے پنشن لے کر دہلی چلے آئے تھے، سو روپیہ ماہوار پر وہ اس مدرسہ کے مدرس اوّل مقرر ہوئے۔ مدرسہ کا خرچ دو سو روپیہ ماہوار تھا لیکن چندہ کی مقدار ہمیشہ کم رہی جس کو مولوی صاحب اپنی ذات سے پورا کرتے تھے۔ کافی عرصہ تک یہ مدرسہ زندہ رہا۔ اور اچھی لیاقت کے عربی داں اشخاص مدرسہ نے پیدا کئے۔ لیکن جب وکالت کی غرض سے مولوی صاحب نے دلّی چھوڑی تو یہ مدرسہ بھی ۱۸۶۹ء میں بند ہوگیا۔

مدرسۃ العلوم علی گڑھ کی بنا اور اس کا وجود سرسید کے بعد اگر کسی دوسری کوشش اور توجہ کا رہین منت ہے تو مولوی سمیع اللہ خاں کا۔ جب سرسید کے دل میں مسلمانوں کی تعلیم کا اور اس کے ذریعہ سے ان کی اصلاح اور ترقی کا خیال پیدا ہوا تو اس تصویر خیالی کے پیکر میں مولوی سمیع اللہ خاں نے روح پھونکی۔

جب انگریز مسلمانوں سے حکومت لے کر خود حکمراں بنے تو انھوں نے کامل تسلّط و اقتدار کے بعد ملکی نظام اور صیغہ جات پر توجہ کی اسی سلسلہ میں نظام تعلیم کو استوار اور محکم بنانے کے لئے مدرسے اور یونیورسٹیاں قائم کیں چوں کہ مسلمانوں کے ہاتھ سے حکومت انگریزوں نے لی تھی وہ طبعاً ان سے نفرت رکھتے تھے۔ یہی نفرت اب علوم جدیدہ کے حاصل کرنے میں مانع آئی۔ مذہبی حیثیت سے آج کل کے مقابلہ میں اُس وقت علمار کا بھی قوم میں خاصہ اثر تھا۔ علوم جدیدہ سے ان کی مخالفت اور انگریزوں کی نسبت سے ہر چیز کے ساتھ نفرت بالخصوص حصول تعلیم کی کوشش میں بہت کچھ مزاحم تھی اور سرسید کو خدا نے ایسا دردمند دل اور چشم بصیرت عطا کی تھی کہ ایک طرف تو وہ زوال حکومت کے سبب سے جن مختلف قسم کے مصائب اور آلام میں قوم کو مبتلا دیکھ رہے تھے۔ دوسری طرف عدم تعلیم و تربیت کی وجہ سے زمانہ آئندہ میں جو اور بری گت بننے والی تھی وہ اس سے بے خبر نہ تھے۔ اس مرض کا علاج ان کے خیال میں علوم جدیدہ کی تحصیل مدرسۃ العلوم کے قیام کے ذریعہ سے ہوسکتی تھی۔ چوں کہ مولوی سمیع اللہ خاں ان حقائق کے اندازہ داں تھے انھوں نے خود مصیبت اور بپتا کی گھٹاؤں کو اپنے اوپر اور قوم پر گرجتے ہوئے سنا تھا اور دیکھتے ہوئے

دیکھا تھا۔ غدر کی آفت ان کے سامنے تھی۔ پشتینی امیروں اور شرفا کے خاندان ان کے سامنے ملیامیٹ ہوئے تھے۔ عام طور پر افلاس نکبت بداخلاقی اور جہالت کا زور تھا۔ خود مولوی تھے مشائخ او صوفیہ کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ان حالات نے ان کو پرانے حجرہ سے نکالا اور وہ خواب سرسید کی تعبیر بن کر ترجمان عمل کی شکل میں قوم کے سامنے آئے۔ اس مقصد کے لئے سرسید نے ایک کمیٹی بنارس میں قائم کی جس کے سکرٹری مولوی صاحب قرار پائے۔ اب وہ علی گڑھ میں صدر الصدور ہیں۔ جدید حکومت کی کرسی نے اقبال مندی اور افریں نئی قوت پیدا کردی ہے۔ علم وعمل پشتینی اعزاز وجاہت رفیق کار ہیں۔ علی گڑھ کے گرد و نواح میں مسلمان زمینداروں اور کھاتے پیتے لوگوں کا جھنڈ ہے۔ جس وقت انھوں نے علی گڑھ میں دارالعلم کی بنا رکھی آواز بلند کی جلسے کرکے ماضی وحال کو سامنے رکھا۔ استقبال کے نتائج بد سے خبردار کیا۔ تعصبات اور جہل کی غفلتوں پر ٹھوکے دے کر دکھتی ہوئی رگوں میں سے نشتر دے کر فاسد مادہ کو نکالا۔ تاثیر نے پیش قدمی کی۔ اعوان و انصار جھنڈے کے نیچے آنا شروع ہوگئے۔ قدمے، درمے، سخنے تائید کے لئے نہ صرف آوازیں بلند ہوئیں بلکہ ہات بھی بڑھے۔ سرسید اپنے یاروں سے کہتے تھے کہ جب تک پندرہ لاکھ روپیہ اکٹھا نہ ہوجائے مدرسہ کھولنے کا نام نہ لو۔ اس رائے سے اگر کسی کو اختلاف تھا تو وہ مولوی سمیع اللہ خاں تھے جن کی دوررس نگاہ ہمیشہ نتائج صحیحہ پر پہونچ کر رکتی تھی۔ انھوں نے چندہ کی فہرست کھولی اور جو پہلے دے چکے تھے اس کے علاوہ سب سے پہلے اپنے نام سے ایک ہزار روپیہ دیا۔ اور دوسروں سے لینے کی کوشش کی۔ اس طریقہ سے جب کافی رقم فراہم ہوگئی تو ۲۴ مئی ۱۸۷۵ء کو مدرسہ کی افتتاحی رسم ادا کرکے اس دارالعلم کی بنیاد ڈال دی۔ جو آج "مسلم یونیورسٹی" کے نام سے اقصائے عالم میں ایسی واحد اسلامی درس گاہ ہے جس کا نمونہ آج نہ قسطنطنیہ میں ہے نہ ایران میں اور نہ مصر میں۔ اس مکتب یا مدرسہ کے رجسٹر میں سب سے پہلے اپنے بیٹے کا نام لکھوایا اور داخل کیا جن کا پورا نام افضل العلما، نواب سربلند جنگ مولوی حمید اللہ خاں بیرسٹرایٹ لا ریٹائرڈ چیف جسٹس حیدرآباد ہے۔ خود سرسید احمد خاں رسم افتتاح مدرسہ کی شرکت کی غرض سے بنارس سے علی گڑھ آئے۔

۱۸۷۳ء میں جس وقت سرسید نے مدرستہ العلوم کی امداد کے لئے سب سے پہلا سفر پنجاب کا کیا اس وقت بھی ان کے رفیقوں میں مولوی سمیع اللہ خاں کی شخصیت سب سے بلند و بالا نظر آتی تھی۔

۱۸۸۰ء میں مدرستہ العلوم کی سالانہ رپورٹ پڑھنے کی غرض سے جب سرسید کھڑے ہوئے تو اس وقت اپنے رفیق منزل کا ذکر حسب ذیل الفاظ میں کرتے ہیں۔

"جس کالج کی رپورٹ آپ حضرات کو پڑھ کر سنائی گئی ہے، یہ مولوی سمیع اللہ خاں صاحب کے مستقل ارادے اور صحیح رائے کی بدولت قائم ہوا ہے۔ کالج فنڈ کمیٹی جس کے ممبر مولوی سمیع اللہ خاں بھی۔ تھے اور جس نے مدرستہ العلوم

قایم کرنے کا منصوبہ باندھا تھا۔ اس کی رائے تھی کہ جب تک پندرہ لاکھ روپیہ جمع نہ ہو جائے تو اس وقت تک مدرسہ یا کالج نہیں جاری ہو سکتا۔ اس رائے سے مولوی صاحب نے اختلاف کیا اور جب کسی نے اس اختلاف کی پروا نہ کی تو انھوں نے مخصوص فیاضی سے کام لے کر ایک فہرست چندہ کھولی اور اپنے پہلے چندہ کے علاوہ اس میں بھی ایک ہزار روپیہ سے چندہ میں شرکت کی اور اس طرح پر جب روپیہ جمع ہو گیا تو انھوں نے مدرستہ العلوم قایم کر دیا۔

ان کی اس جلیل القدر خدمت قومی کا اعتراف نہ صرف سر سید نے بلکہ لارڈ رپن وایسرائے اور سر آکلنڈ کالون لفٹننٹ گورنر ممالک متحدہ آگرہ واودھ نے بھی اپنی ان تقریروں میں کیا ہے جو انھوں نے کالج وزٹ کے موقعوں پر کی تھیں۔

اس احسان قومی کے اعتراف اور شکریہ میں سر سید کورٹ میں کھڑے ہو تو شمال کی طرف "وکٹوریہ گیٹ" کے اوپر ایک لمبی سفید سل میں بخط عربی جلی حروف میں حسب ذیل کتبہ فارسی زبان میں کندہ نظر آتا ہے۔

"ترقی خواہان قوم اگر چہ از چند سال در پے قیام ایں مدرسہ کہ ذریعہ بہبود وبہبود قومیت و نعمت تعلیم و تربیت اطفال نعمت غیر مترقبہ صرف ہمت می کردند مگر اجرا ء آں بخیر تاخیر می افتاد جناب مولوی محمد سمیع اللہ خاں صاحب بہادر رئیس دہلی جرأت و ہمت را بکار برد و بتاریخ بست و چہارم مئی ۱۸۷۵ء کہ روز سعید سالگرہ ملکہ معظمہ وکٹوریہ قیصر ہند بود ایں مدرسہ را اجرا فرمودند تمامی ممبران کمیٹی مدرستہ العلوم مشکور وممنون شاں بودہ اند و باظہار شکر گزاری ایں لوح را نصب می نمایند و ایں منزل را بنام نامی جناب ممدوح موسوم می سازند"

اب یہ منزل عالی جس کا نام "سمیع اللہ خاں منزل" ہے بہمہ جہت مکمل ہو کر تعمیر ہو چکی ہے۔ اور اس کے کلاک ٹاور کا منارہ گم گشتہ راہوں اور اوقات عمل کا رہ نما ہے۔

۱۸۷۵ء سے لے کر ۱۸۸۹ء تک مولوی سمیع اللہ خاں سر سید کے دست و بازو بن کر مدرستہ العلوم کو ہر ممکن ترقی دینے میں مصروف عمل رہے۔ اور جو پودا انھوں نے اپنے ہاتھ سے لگایا تھا اور جس محنت کے ساتھ اس کو سینچا تھا وہ ان کی زندگی میں پروان چڑھا اور برگ و بار لایا۔ اب سر سید کی زندگی عمر کی آخری منزلیں جلد جلد طے کر رہی ہے۔ مدرستہ العلوم اور اس کے بورڈنگ کی ہمہ گیری اور وسعت ترقی کرتی جاتی ہے۔ اندرونی معاملات اور انتظامات میں مولوی صاحب کا اقتدار اور ان کی پوزیشن واضح ہے۔ انگلش اسٹاف کو ان کی مداخلت اس پیمانے پر منظور نہ تھی جس کا ان کو حق تھا۔ رفتہ رفتہ شکایتیں پیدا ہوئیں۔ سر سید نے اسٹاف کی حمایت کی۔ یہ بات بھی الم نشرح تھی کہ سر سید چراغ سحری ہیں، ان کے جانشین ہوں گے تو سمیع اللہ خاں ہوں گے

اسٹاف کے لئے یہ خلش بھی کچھ کم نہ تھی۔ الغرض گفتہ و ناگفتہ واقعات چند در چند نے وہ وقت سامنے لا کر موجود کر دیا کہ جس نے ان کی اور سرسید کی قرابت اور رفاقت رقابت اور عداوت سے بدل دی ۱۸۸۹ء میں سرسید نے ٹرسٹیز بل کا مشہور مسودہ جس میں سید محمود مرحوم کو اپنے بعد اپنا جانشین تجویز کیا تھا ٹرسٹیوں کے سامنے پیش کیا۔ اس بل نے ہولناک مخالفت پیدا کر دی۔ علی گڑھ بلند شہر کے بڑے بڑے تعلقہ دار رؤسا اس مخالفت میں مولوی سمیع اللہ خاں کے ساتھ ہو گئے۔ نواب وقار الملک مولوی مشتاق حسین نے بھی سرسید کی رائے سے زبردست اختلاف کر کے ایسی زبردست تحریر لکھی جس نے اس آگ پر اور تیل چھڑکا۔ انجام کار جیت سرسید کی ہوئی اور بل کثرت رائے سے پاس ہو گیا۔ مولوی سمیع اللہ خاں کو شکست ہوئی اور ان کے ساتھ مدرسۃ العلوم اپنے بہت سے قدیم یار وں اور مددگاروں سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو گیا اور کالج کی ترقی عرصہ دراز کے لئے رک گئی۔

یہ تو جو کچھ ہونا تھا سو ہو گیا۔ ۱۸۸۹ء میں وہ مدرسۃ العلوم سے کلیتاً دست بردار ہو گئے لیکن جب تک زندہ رہے اور عرصہ تک زندہ رہے علی گڑھ میں مستقل طور سے سکونت رہی۔ جہاں کہیں مدرسہ کے طلبہ کو دیکھ پاتے ان کے ساتھ بزرگانہ شفقت کا اظہار فرماتے۔ جو طلبہ ان کی کوٹھی پر ان سے ملنے جاتے ان کے ساتھ عزیزانہ برتاؤ کرتے اور پند و نصائح فرماتے رہتے تھے۔

سرسید کے اور ان کے تعلقات کو پیوستہ کرنے کی مختلف اوقات میں مختلف تدابیر گرامی قدر اصحاب نے کیں۔ ایک مرتبہ نواب وقار الامرا بہادر اسی غرض سے علی گڑھ تشریف لائے۔ مگر جو رشتہ ٹوٹ چکا تھا وہ دونوں کی زندگی تک پھر نہ جڑ سکا اور مدرسۃ العلوم کی تاریخ میں واقعہ مذکور داستان حسرت بن کر رہ گیا جس پر ہر زمانہ اپنے اپنے وقت میں افسوس کرے گا۔ جب تک وہ زندہ رہے علی گڑھ اور نواح علی گڑھ و بلند شہر کے رؤسا میں ان کی خاص منزلت اور توقیر تھی اور سب کے سب با ادب پیش آتے تھے جو عمر کے لحاظ سے برابر کے تھے وہ ان کے دوست تھے اور جو ان سے چھوٹے تھے وہ ان کے چھوٹے تھے۔ الٰہ آباد میں یونیورسٹی تھی، مشہور میور سنٹرل کالج کے مسلمان طلبہ کی اقامت میں دشواریاں تھیں۔ اس ضرورت کے لحاظ سے ۱۸۹۲ء میں انھوں نے مسلم بورڈنگ ہاؤس کی بنیاد ڈالی۔ ستر ہزار روپیہ میں اس عمارت کی تکمیل ہوئی جو الٰہ آباد میں مسلمانوں کی تعلیم کا اس وقت بڑا سہارا رہی۔

۲۷ دسمبر ۱۸۸۶ء کو آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے وہ پہلے خطیب اور صدر اول قرار دیئے گئے۔ آج جس جگہ "اسٹریچی ہال" اپنی مشہور روایات کے لحاظ سے کافی سے زیادہ شہرت رکھتا ہے اس جگہ پر کانفرنس کا عارضی پنڈال بنایا گیا تھا اور جس میں خطبۂ ذیل جو کانفرنس کی پیدائش کے لحاظ سے بالکل سادہ ہے

مولوی صاحب کی زبان سے حاضرین کانفرنس نے سنا تھا۔ بالآخر

جہاں اے برادر نماند بکس
دل اندر جہاں آفرین بند وبس

انتقال سے دو ایک برس پہلے بالکل گوشہ گیر ہو گئے تھے۔ دن رات کے بیشتر اوقات یادِ خدا اور عبادت گزاری میں بسر ہوتے تھے۔ کبھی کبھی اجمیر اور دلّی کی خانقاہوں اور مزارات کی زیارت کر کے ہفتوں وہاں مشغول اوراد واشغال رہتے تھے۔ اور پھر علی گڑھ واپس آجاتے تھے۔ رحلت سے کچھ عرصہ قبل معمولی علالت رہی۔ چوہتّر برس کی عمر میں یہی علالت باعثِ موت بن گئی۔ ۷/ اپریل ۱۹۰۸ء کو علی گڑھ میں وفات پائی حسب وصیّت لاش دہلی پہونچائی گئی۔ اور حضرت سلطان المشائخ کے جوار میں دفن کئے گئے۔

عربی شاعر نے ایسے ہی لوگوں کے لئے کہا ہی۔

یفارق الناس جسمٌ ماجدٌ ندسٌ
بحر المعارف فی المعروف مشہور

ایک بزرگ نے لوگوں کو چھوڑ دیا جو علم و معرفت کا دریا اور احسان میں مشہور تھا۔

خطبۂ صدارت

اے معزز حاضرین! سب سے پہلے میں اپنے اوپر اُن معزز اہل جلسہ کا شکریہ ادا کرنا فرض سمجھتا ہوں جنھوں نے مختلف مقامات سے تشریف آوری کی تکلیف گوارا کی ہے اور دور دراز فاصلہ سے قوم کو بھلائی پہونچانے کے ارادے سے تشریف لاکر اس جلسہ میں شریک ہوئے ہیں۔ اس کے بعد میں اُس عزت کا شکریہ ادا کرتا ہوں جو آپ سب صاحبوں نے اپنی مہربانی سے مجھ کو اس جلسہ کا صدر انجمن ہونے سے بخشی ہی۔

اے صاحبان! آج کا جلسہ ایک ایسا جلسہ ہی کہ جو مسلمانوں کی تاریخ میں اگر وہ لکھی جاوے گی تو ایک بے نظیر جلسہ شمار کیا جاوے گا۔ سب لوگ اس سے واقف ہیں کہ دنیا میں جو چیز قابل عزت خیال کی جاتی ہی وہ سویلیزیشن ہی جس کا ترجمہ آسان لفظوں میں شایستگی ہوسکتا ہی اور جو دو جزوں سے مرکب ہی ایک تعلیم سے اور دوسری تربیت سے۔ جب کسی ملک میں تعلیم ترقی پر ہوتی ہی تو تربیت بھی اسی کے ساتھ ترقی پر ہوتی ہی۔ انسان کو سب ملکوں میں مختلف لفظوں سے اشرف المخلوقات کہتے ہیں لیکن جب یہ سوال ہو کہ یہ خطاب اس کو کیوں دیا گیا ہی تو جواب یہی ہوگا کہ تعلیم کی وجہ سے انسان اور دیگر حیوان میں تعلیم اور تربیت کا فرق ہی۔ تعلیم اور تربیت ہی ایسی چیز ہے جس سے انسان انسان کہا جاتا ہے۔ دنیا میں تعلیم مختلف طریقوں سے ہوتی آئی ہے۔ اور تربیت کے

بھی مختلف طریقے ہیں۔بعضوں کا قول ہے کہ تعلیم فیضانِ الٰہی ہے۔بعض کہتے ہیں کہ اشراق کے طریقے سے حاصل ہو اور بعض کہتے ہیں کہ اکتسابی طریقہ سے۔

میں پہلے دونوں طریقوں کا کچھ ذکر نہ کروں گا کیوں کہ ہم کو جو تعلق ہے وہ اکتسابی تعلیم کے طریقہ سے ہے اس اکتسابی تعلیم کے طریقہ میں ہماری قوم اگلے زمانہ میں کیسی ہی اعلیٰ درجہ پر ہو مگر اس زمانہ میں سب سے پیچھے ہے۔اس کا سنبھالنا مسلمانوں پر فرض ہے۔اس بات پر غور کرنے کے لئے کہ وہ کیوں کر سنبھالی جاوے اور اُس کے سنبھالنے کا کونسا طریقہ اختیار کیا جاوے میرے نزدیک کانگرس کا طریقہ اس کے لئے نہایت عمدہ اور مفید ہے۔

ہمارے ملک میں بے شک لوگوں کے دلوں میں قوم کے سنبھالنے کا خیال پیدا ہوا اور لوگوں نے مختلف طریقے اُس کے اختیار کئے ہیں اور ہر ایک جگہ اپنے اپنے مقاصد کے لحاظ سے تعلیم پر خیال کیا جاتا ہے مگر ہر ایک جگہ مختلف طریقے اُس کے خیال کئے گئے ہیں اور اختیار کئے گئے ہیں۔لوگوں کو ان طریقوں میں اختلاف ہے۔کوئی خیال کرتا ہے کہ یہی طریقہ قوم کو تعلیم دینے کا سب سے عمدہ ہے۔کوئی کہتا ہے کہ اس طریقہ سے کچھ بھی ترقی قوم کو نہیں ہو سکتی۔تعلیم اور قومی ترقی کے مختلف طبقات ہیں اور ان کو خلط ملط کر دینے سے ظاہر یہ اختلاف پیدا ہوئے ہیں۔اگر ہماری قوم آپس میں متفق ہو کر اور صلاح اور مشورہ کر کے اور ایک دوسرے کے خیالات سے واقف ہو کر کوئی مضبوط طریقہ قوم کی تعلیم اور ترقی کا اختیار کرے تو بلاشبہ قوم کے لئے بہت زیادہ مفید ہو۔میں سمجھتا ہوں کہ اس مقصد کے حاصل ہونے کو اس کانگریس سے جس کا آج پہلا اجلاس ہے بہتر اور کوئی طریقہ نہیں ہے۔

اس طریقہ سے تمام لوگوں کو جو قوم کی بھلائی چاہتے ہیں اس بات پر غور کرنے کا بخوبی موقع ملے گا کہ ان کی قوم کی تعلیم کا سب سے عمدہ کون سا طریقہ ہے جس سے اُن کی قوم جہالت سے نکلے اور ایسی نامور ہو کہ اور ملک کے لوگ بھی اس کو مہذب اور تعلیم یافتہ سمجھیں۔مجھے اس بات کا فخر ہے کہ اس مقصد کی کارروائی شروع کرنے کے لئے مجھ کو عزت دی گئی ہے۔اگرچہ آج کا جلسہ کچھ بہت بڑا جلسہ نہیں ہے۔مگر مجھ کو قوی امید ہے کہ آئندہ اس پر لوگوں کو بہت توجہ ہوگی اور ہر سال اس جلسہ کو ترقی ہوتی جاوے گی۔

اب مجھ کو صرف یہ بات کہنی باقی ہے کہ محمڈن ایجوکیشنل کانگریس کا جلسہ کھولا گیا۔پس جو رزولیوشن کہ اس جلسہ میں پیش ہونے قرار پائے ہیں وہ پیش کئے جاویں۔

اجلاسِ دوم

(منعقدہ لکھنؤ ۱۸۸۷ء)

صدر جناب منشی سیّد امتیاز علی خاں صاحب مرحوم رئیس کاکوری ضلع لکھنؤ

حالاتِ صدر

منشی صاحب کا سلسلۂ نسب باپ اور ماں کی طرف سے سادات علوی اور سادات بنی فاطمہ میں مشترک ہے۔ ۱۸۳۵ء میں بمقام باندہ جہاں ان کے والد سرکار انگریزی کے ملازم تھے پیدا ہوئے۔ اس زمانہ میں ریاست باندہ اپنے عروج و اقبال پر قائم تھی۔ جہاں ہر قسم کے اہل کمال کا مجمع تھا۔ منشی صاحب کی تعلیم و تربیت کا زمانہ وہیں ختم ہوا۔ علوم عربیہ و فارسیہ کی تعلیم کے ساتھ فن سپہ گری کی بھی تعلیم پائی جو اس زمانہ کے شرفا کا دستور و آئین تھا۔ انفراغ تعلیم کے بعد باندے سے قریب ایک دوسری ریاست میں سو روپیہ ماہوار کے ملازم ہو گئے۔

فارسی انشا پردازی میں مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ سے اور نظم میں مولانا غلام امام شہیدؔ سے استفادہ کیا تھا۔ ابتداءً تخلص جمیلؔ رکھا تھا بعد کو اُستاد کے اشارے سے صوفیؔ اختیار کیا۔ وہ نہ صرف تخلص کے لحاظ سے جمیل تھے بلکہ ان کا تمام سراپا حسن و جمال کی تصویر تھا۔ حسن صورت کے علاوہ قدرت نے ان کو حسنِ سیرت میں بھی کافی حصہ عنایت کیا تھا۔ وہ بڑے متواضع، خلیق اور صاحب جود و سخا تھے۔ ان کی گفتگو میں دل آویزی اور بات چیت میں شگفتگی نظر آتی تھی۔ مزاج میں سادگی تھی اور نمود و نمائش سے نفرت۔

انتزاع سلطنت اودھ کے بعد حسب طلب مسٹر بارلو ڈپٹی کمشنر گونڈا وہ علاقہ تلسی پور و چردہ کے افسر پولیس مقرر ہوئے جنھوں نے اس پرآشوب زمانہ میں اہم ذمہ داری کے فرائض نیک نامی کے ساتھ انجام دے کر گورنمنٹ سے انعامات پائے۔ زمانۂ غدر کے آخر تک وہ اسی خدمت پر مامور رہے۔ بعد غدر جب ان کے والد نے پنشن لی تو وہ ان کی جگہ مقرر ہو کر باندہ واپس گئے۔ لیکن اس زمانہ میں ریاست باندہ کی بساط اقبال الٹ چکی تھی۔ شہر ارباب کمال سے خالی ہو چکا تھا تاہم منشی صاحب نے چھ برس



منشی امتیار علی خاں
صدر اجلاس دوم (لکھنؤ سنہ ۱۸۸۷ع)

باندے میں گزارے اور بالآخر استعفا دے کر وطن چلے آئے، اور قانون پڑھ کر جوڈیشل کمشنر اودھ کے امتح
قانونی میں درجۂ اعلیٰ کی سند حاصل کر کے پیشۂ وکالت میں مصروف ہو گئے۔ یہی زمانہ ان کی ترقی کا پہلا
تھا۔ بند وبست پختہ درپیش تھا۔ ہر کہ ومہ کے حق کی تحقیق و تفتیش جاری تھی۔ تعلقہ داران اودھ ایک طرف
گورنمنٹ سے اپنے حقوق خاص کو حاصل کرنے میں ساعی تھے اور دوسری جانب ان کم زور اور غریب کاشتک
کے حقوق جو ان کے قبضے میں کسی نہج سے آچکے تھے چھوڑنا نہ چاہتے تھے۔ منشی صاحب نے موخر الذکر فرقہ کی
دستگیری پر کمرِ ہمت باندھی اور بالآخر اپنی پرزور و مسلسل تحریروں سے گورنمنٹ کو اپنی جانب متوجہ کر لیا۔ نتیجہ
ہوا کہ اودھ میں حقوق ماتحت کی تحقیقات کی تحریک زندہ ہو کر بڑی حد تک ان کی دادرسی ہوئی۔ چوں کہ حقو
تعلقہ داری کی ترتیب و تجدید کا مسئلہ بھی ساتھ ساتھ پیش تھا اور بوجہ عدم واقفیت قوانین و قواعد انگریزی ان
لوگوں کو اپنے حقوق کے تلف ہو جانے کا خوف لگا ہوا تھا اس لئے مہاراجہ مان سنگھ تعلقہ دار مہدونہ نے
انجمن تعلقہ داران کے قیام کی کوشش کی۔ مقاصد و اغراض انجمن کو بر لانے کے لئے ایک قابل قانون دا ر
اور مقنن کے مشورہ اور صلاح کی ضرورت تھی چنانچہ وہ اپنی اعلیٰ قانونی قابلیت کے لحاظ سے اس بلند پایہ انجمن
کے مشیر قانونی بنائے گئے۔ تعلقہ داران اودھ کے حقوق کی حفاظت اور ان کی شان امارت قائم اور برقرا
رکھنے میں جو کوششیں انھوں نے کیں اور جو کارہائے نمایاں حصول مقصد کے محاظ سے انھوں نے انجام
تعلقہ داران اودھ کی جماعت ان کے احسان سے سبک دوش نہیں ہو سکتی۔

اگر ایک طرف انجمن کے مشیر قانونی کی حیثیت سے تعلقہ داروں کے طبقہ میں ان کی قابلیت کا اثر ب
رہا تھا تو دوسری جانب ان کی کامیاب وکالت کو اس قدر فروغ ہوا کہ صوبہ اودھ کا بچہ بچہ ان کے نام سے
واقف ہو گیا۔ وہ اپنے زمانہ کے بڑے بلند پایہ وکیل تھے۔ جسٹس محمود مرحوم جو منشی صاحب کو اپنے نامور وا
کے دیرینہ مراسم کی بنا پر عم مکرم کہہ کر مخاطب کیا کرتے تھے۔ لکھنؤ میں کئی مرتبہ انھوں نے کہا کہ "میرے چچا
سر تا پا اصول قانون ہیں اور میں نے اس صوبہ میں کوئی قانون داں ان کا ایسا نہیں پایا"۔ وہ مہاراجہ
پورتھلہ کے بھی مشیر قانونی تھے اور انھیں کی کوشش سے جب مہاراجہ رندھیر سنگھ نے اہل خاندان کو بجائے
تقسیم ریاست کے نقد ہی گزارہ دینا چاہا تو لارڈ لارنس نے اس کے خلاف سفارش کی لیکن جو درخواست
منشی صاحب نے مہاراجہ کی طرف سے لکھ کر انگلستان بھیجی انجام کار فیصلہ منشی صاحب کی نوشتہ درخواست
کے موافق ہوا۔ اور وائسرائے کی سفارش مسترد کی گئی۔ ۱۸۶۶ء اور ۱۸۶۸ء کے درمیان اودھ کے ہر لوکل
قانون کے صدور کے وقت وہ بہ حیثیت قائم مقام وسفیر تعلقہ داران اودھ کے حقوق کے محافظ و نگراں رہتے
ہائی کورٹ الہ آباد و جوڈیشل کمشنر اودھ کی عدالتوں کے الحاق کی کوشش میں گورنمنٹ نے قانون

بنانا چاہا تو انھوں نے اس تجویز کی سخت مخالفت کی اس تجویز کی مخالفت میں ایک با اثر جلسہ لکھنؤ میں منعقد ہوا جس کے نتیجہ میں گورنمنٹ کو اس خیال سے دست کشی کرنی پڑی۔

۱۸۸۸ء میں انھوں نے سر سید احمد خاں کا ساتھ اس تحریک میں دیا جو انھوں نے نیشنل کانگریس سے جُدا گانہ مخصوص مسلمانوں کے لئے جاری کی تھی۔ ان کی پختہ رائے یہ تھی کہ ہندوستان ابھی اس راستہ پر چلنے کے لئے تیار نہیں ہے اور نہ مسلمان ایسے تعلیم یافتہ ہیں جس پر کانگریس ان کو لے جانا چاہتی۔

قدیم تہذیب کی پابندی، شائستگی، فراخ دلی اور مہمان نوازی ان کے خاص جوہر تھے انھوں نے وکالت کے ذریعہ سے بے اندازہ دولت پیدا کی جس کا بہت بڑا حصہ اُنھوں نے مخلوق کی حاجت روائی و مہمان نوازی میں صرف کیا۔ ان کے دسترخوان پر سوا سو آدمیوں سے کسی وقت کم نہ ہوتے تھے جو خود کھاتے تھے وہی دوسروں کو کھلاتے تھے ان کا مطبخ ہر وقت گرم رہتا تھا۔ ان کی سخاوت، فیاضی لکھنؤ میں ضرب المثل ہے۔ اسی بنا پر مزاحاً ایک مرتبہ حضرت علامہ مولانا عبدالحی صاحب مرحوم فرنگی محلی نے ارشاد فرمایا تھا کہ لوگ کہتے ہیں کہ منشی امتیاز علی بڑے سخی ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ وہ بخیل ہیں کیوں کہ جو کچھ خدا ان کو دیتا ہے وہ اس کے بندوں کو بانٹ کر اپنے لئے عاقبت کا خزانہ جمع کر رہے ہیں اور جو خزانہ جمع کرے وہ بخیل ہے۔

وہ تعلیم عامہ خصوصاً مسلمانوں کی تعلیم کے بڑے حامی اور مددگار تھے۔ اودھ میں صنعتی تعلیم کے لئے انھوں نے خصوصیت کے ساتھ کوشش کی اور اپنے صرف سے اس وقت چند طلبہ کو انگلستان بھیجنا چاہا جب صنعتی تعلیم پر کسی قسم کی توجہ اور خیال نہ تھا۔ مگر افسوس کہ ان کی خواہش ناکام رہی اور کوئی طالب علم ان کو نہ مل سکا۔

اپنے وطن کاکوری میں ایک مدرسہ جاری کیا جس کے لئے پچاس روپیہ ماہوار کی آمدنی وقف کی مدرسہ کی تعمیر کے لئے نصف روپیہ خود دیا۔ بقیہ گورنمنٹ ایڈ سے صرف ہوا۔

مولوی فتح محمد صاحب سے اُردو میں کتاب خلاصۃ التفاسیر لکھوائی جو تمام عربی فارسی مستند تفاسیر قرآن پاک کا عطر ہے جس کی پانچ ضخیم جلدیں ہزار ہا روپیہ کے صرف سے طبع کرائیں اور تقسیم کیں لکھنؤ و نواح لکھنؤ کی متعدد کہنہ مساجد کی مرمت کرائی۔ بہ زمانہ وزارت بھوپال سیہور چھاؤنی میں ایک مسجد اپنے صرف سے تعمیر کی۔ سر سید احمد خاں صاحب مدرسۃ العلوم علی گڑھ کے لئے جب تیا چندہ وصول کرنے کی کوشش کرتے تھے تو ان کی عادت تھی کہ اپنے خاص دوستوں کے نام سے خود چندہ لکھ کر ان سے اس قدر وصول کر لیا کرتے تھے۔ یہی دستور العمل منشی صاحب کے ساتھ بھی قائم رہا مشہور اسٹریچی ہال کی تعمیر میں ان کے چندہ کا

نمایاں کتبہ موجود ہے۔

۱۸۸۷ء میں سرسید نے لکھنؤ میں انعقاد کانفرنس کی خواہش ظاہر کی۔ کانفرنس کا یہ دوسرا سالانہ جلسہ تھا لیکن جب لوگوں کی بے التفاتی سے سرسید کو لکھنؤ میں کانفرنس ہونے کی توقع نہ رہی تو انھوں نے منشی صاحب سے تحریک کی چنانچہ خود انھوں نے کانفرنس کو لکھنؤ میں مدعو کیا اور بڑی عالی حوصلگی سے تمام اخراجات انعقاد اجلاس و مہمانداری اپنے ذمہ لئے۔ انتالیس سال گزر جانے کے بعد آج اس اجلاس کے دیکھنے والے جو بچ رہے ہیں وہ منشی صاحب کی مہمان نوازی اور پُرتکلف دعوتوں کے حالات بطور افسانہ بیان کرتے ہیں۔

۱۸۹۲ء میں سرسید نے مدرسۃ العلوم کے لئے امداد حاصل کرنے کی غرض سے مشہور سفر حیدرآباد اختیار کیا تو منشی صاحب نے سرسید کو اثناء سفر میں قیام بھوپال کی دعوت دی۔ چنانچہ سرسید نے اپنے رفقائے سفر مولانا حالی، مولانا شبلی، نواب حاجی اسمٰعیل خاں مرحوم وغیرہ کے ساتھ بھوپال میں قیام کیا۔ اور اس پہلی منزل میں اس زمانہ کے لحاظ سے دس ہزار روپیہ کی گراں قدر رقم سرکار خلد آشیاں نواب شاہ جہاں بیگم صاحبہ کی طرف سے تعمیر مسجد کے لئے دی گئی۔ دو ہزار روپیہ خود منشی صاحب نے دیئے اور ڈھائی ہزار روپیہ کا چیت دوسروں سے دلوایا اور اس طرح پر ساڑھے چودہ ہزار روپیہ سرسید کی جھولی میں ڈالے گئے جو ایسا نیک شگون تھا جس نے آگے چل کر مالوہ اور دکن میں فتوحات کا دروازہ کھول دیا۔

۸۶-۱۸۸۵ء میں ریاست بھوپال کے تعلقات برٹش گورنمنٹ سے آشفتہ اور تلخ ہوئے تو خلد آشیاں نواب شاہ جہاں بیگم صاحبہ نے ان کی قابلیت اور تدبر کا شہرہ سن کر جناب قطب الاقطاب حضرت مولانا شاہ فضل الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ذریعہ سے ان کو وزارت بھوپال پیش کرنے کا ایما فرمایا نیز گورنمنٹ سے تحریک کی جب گورنمنٹ آف انڈیا نے لوکل گورنمنٹ سے رائے طلب کی تو سر آکلینڈ کالون صاحب لفٹننٹ گورنر ممالک متحدہ آگرہ و اودھ نے جو منشی صاحب کے مخلص دوست تھے اس تجویز سے نہ صرف کلی طور پر اتفاق رائے کیا بلکہ یہاں تک لکھا کہ اگر وہ بھوپال کے وزیر ہوں گے تو گورنمنٹ کے فوائد اور تعلقات اس قدر محفوظ رہیں گے جس طرح میرے وہاں ہونے میں ہوتے۔ چنانچہ گورنمنٹ آف انڈیا نے فوراً ان کا تقرر منظور کر لیا۔ دسمبر ۱۸۸۶ء میں لکھنؤ سے بھوپال گئے اور مسند نشین وزارت ہوئے۔

جس زمانہ میں انھوں نے اس اہم خدمت کا جائزہ لیا وہ نظام ریاست کے لحاظ سے بے چینی اور افسردگی کا زمانہ تھا۔ ریاست کا پولٹیکل مطلع نہایت غبار آلود ہو رہا تھا۔ نواب صدیق حسن خاں مرحوم معزول ہو چکے تھے۔ پے در پے دو وزارتیں ناکامی سے ہم آغوش ہو چکی تھیں۔ منشی صاحب نے سب سے

پہلے ریاست اور گورنمنٹ ہند کے تعلقات کو خوشگوار بنانے کی کوشش کی اور اس مقصد میں ان کو خاطرخواہ کامیابی ہوئی۔ چنانچہ ہز اکسیلنسی لارڈ لینڈ ڈون وائسرائے ہند ۱۸۹۲ء میں خود بھوپال آئے اور سرکار خلد آشیاں سے ملاقاتیں کرکے ہر ہائی نس کے درجے کے مطابق ان کی عزت افزائی فرمائی۔ ریاست بھوپال کی تاریخ میں وائسرائے ہند کی یہ پہلی آمد تھی۔ ۱۸۹۳ء میں سرکار خود ملاقات بازدید کے لئے شملہ تشریف لے گئیں۔ منشی صاحب ساتھ تھے۔ وائسرائے نے سرکار عالیہ خلد آشیاں کی مدارات مہماں نوازی میں بذات خود حصہ لے کر ان کی پوری عزت او رتکریم کا ہر موقع پر لحاظ رکھا۔ پھر جب ۱۸۹۵ء میں لارڈ الگن نے وسط ہند کا دورہ کیا تو اس دورے میں انھوں نے بھوپال کو بھی اپنی تشریف آوری سے سرفراز کیا۔

پولٹیکل تعلقات کی اصلاح کے بعد انھوں نے ریاست کے نظم ونسق پر کافی طور سے توجہ کرکے ہر صیغہ کی اصلاح کی کوشش کی ان سے قبل ریاست کی توفیر کا اوسط پچیس چھبیس لاکھ روپیہ سالانہ تھا۔ مگر ان کے جانے کے تین چار برس بعد ہی عمدہ انتظام اور کفایت شعاری سے سالانہ توفیر کی میزان چالیس پینتالیس لاکھ روپیہ تک پہونچ گئی۔ انھیں کے زمانہ میں اعانت شاہی کو لئے فوج مرتب کی گئی جو مثل انگریزی فوج کے آئین و قواعد اور اسلحہ سے آراستہ ہو کر گورنمنٹ انگلشیہ کی مدد کے لئے ہر وقت کمربستہ ہے۔ انھیں کے زمانہ میں انگریزی سکہ ریاست میں جاری ہوا۔

ان کا زمانۂ وزارت گورنمنٹ آف انڈیا کے لئے اطمینان، ریاست کی وفاداری اور ترقی کی کوشش میں بسر ہوا جن کی عمدہ خدمات کا اعتراف بارہا انگریزی گورنمنٹ کی طرف سے کیا گیا۔ اس اہم خدمت کو عرصۂ دراز تک پوری فراست اور نیک نامی کے ساتھ انجام دے کر وہ لکھنؤ واپس آئے۔ مسلمانان لکھنؤ بالخصوص فرقۂ اہل سنت کے وہ معتمد علیہ تھے مقامی حکام نے ہمیشہ ان کو خاص وقعت کے ساتھ دیکھا۔ بظاہر وہ قدامت پسند تھے لیکن تعلیم جدید کے شروع سے حامی و مددگار رہے اور ان کی وسیع النظری اس انقلاب کو دیکھ رہی تھی جو علمی نقطۂ نظر سے دور جدید کا نتیجہ ہونے والی تھی۔ ۱۶ نومبر ۱۸۹۶ء کو انھوں نے رحلت فرمائی اور ایک زمانہ کو اپنے غم والم میں مبتلا چھوڑا۔

منشی صاحب کے صاحبزادہ منشی احتشام علی صاحب[1] اپنی وضعداری موروثی اخلاق اور مہمان نوازی کے لحاظ سے نیز قومی اور ملکی امور میں دلچسپی اور ہمدردی رکھنے کی حیثیت سے کافی شہرت عزت اور امتیاز رکھتے ہیں۔

---

[1] خلاصہ حالات نوشتہ مکرم محترم منشی احتشام علی صاحب رئیس لکھنؤ

خطبۂ صدارت

اے حضرات! آپ نے جو عزت مجھ کو اس مجلس کے پریسیڈنٹ ہونے کی دی جس کے لائق میں اپنے کو نہیں سمجھتا مگر متفقہ رایوں کے بوجھ نے اُس کی منظوری پر مجھ کو مجبور کیا ہے۔ آپ سب صاحبوں کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ میں آج کے دن پر جس میں میں ایسی بڑی مجلس کا جو ایسے عالی مقصد یعنی قوم کی تعلیم کی ترقی کی غرض سے جمع ہوئی صدر انجمن بنایا گیا ہوں ہمیشہ فخر کروں گا اور آپ صاحبوں کے ان متفقہ مہربانیوں کا جنھوں نے مجھے یہ عزت دی شکر گزار رہوں گا۔

اس کے بعد میں آپ صاحبوں کا جو دور اور نزدیک سے قومی ہمدردی کے جوش میں اپنا قیمتی وقت صرف کرنے اور سفر کی صعوبت برداشت کرنے کے بعد تشریف لائے ہیں دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں اور بالخصوص ان صاحبوں کا دوبارہ شکریہ ادا کرتا ہوں جن کو دور دراز ملکوں سے سفر کی زحمت اختیار کرنی اور اپنے ضروری کاموں میں ہرج کرنا پڑا ہے۔ اب میں چاہتا ہوں کہ اجلاس کی کارروائی شروع کی جاوے اور سکرٹری صاحب سب سے اوّل فہرست ممبروں کی اور اُس کے بعد ان رپورٹوں کو جو متعدد اضلاع سے آئی ہیں پیش کریں اور جن بزرگوں نے اُن کو مرتب کیا ہے ان کی نسبت جو کچھ مناسب سمجھتے ہوں بیان فرمائیں اور سکرٹری صاحب اُن رپوٹوں کا مختصر خلاصہ مرتب کریں جو اس اجلاس کی رپوٹ کے ساتھ شامل کیا جائے۔

اجلاس سوم

(منعقدہ لاہور ۱۸۸۸ء)

صدر نجم الہند سردار محمد حیات خاں، خان بہادر سی آئی ای

حالات صدر

سردار محمد حیات خاں سردار کرم خاں پوپلزئی ساکن واہ ضلع راولپنڈی کے بیٹے اور سپاہیانہ اوصاف کے ساتھ قدیم تعلیم و تربیت کا عمدہ نمونہ تھے۔ انھوں نے غدر ۱۸۵۷ء کے ہولناک زمانہ میں برٹش گورنمنٹ کی وفادارانہ اور سرفروشانہ خدمات انجام دی تھیں۔ محاصرۂ دہلی کے وقت خدمات جنگی میں یہ بھی مصروف تھے اور زخمی بھی ہوئے تھے۔

گورنمنٹ نے ان کی خدمات کی کافی قدر کی۔ ملازمت کے لحاظ سے انھوں نے اعلیٰ مناصب و عہدوں پر ترقی پائی اور پنجاب کے اکثر اضلاع میں جوڈیشل کمشنر رہے۔ خان بہادر، سی آئی ای کے خطابات سے سرفراز ہوئے۔ حکومت میں محترم ہونے کے علاوہ عام طور پر پنجاب کی مسلم اور ہندو پبلک میں ان کی توقیر اور عزت تھی اور عوام کی رہ نمائی کے لئے ان کی شخصیت نمایاں طور پر بلند نظر آتی تھی۔ وہ تجربہ کار پُرحوصلہ زمانہ شناس اور اپنے زمانہ کے صاحب تدبیر اشخاص میں شمار ہوتے تھے۔

سرسید احمد خاں نے جس وقت تعلیمی ریفارم کا کام شروع کیا۔ سردار محمد حیات خاں تھوڑے عرصہ کے بعد ہی سے ان کے ہم خیال ہو گئے تھے۔ سرسید کی اور ان کی ملاقات اتحاد خیال کے ساتھ دوستی اور سچی محبت کی اس آخری سرحد تک پہونچی اُن کی بے ریا اخلاص کی اب اس زمانہ میں مشکل سے مثال مل سکتی ہے۔

پنجاب میں وہ سرسید کی تحریک علمی کے سب سے بڑے اور پرجوش علم بردار تھے۔ سرسید کے خیالات کا جو اثر پنجاب نے قبول کیا اور ان کی زبان سے اپنے واسطے "زندہ دلانِ پنجاب" کا مشہور لقب



خان بہادر سردار محمد حیات خاں
صدر اجلاس سوم کانفرنس (لاہور ۱۸۸۸ء)

حاصل کرنے میں مسلمانان پنجاب کامیاب ہوئے۔ سرسید کے ان خیالات کو پھیلانا اور مقبول عام کرنا ان کے دو مشّاددوں سردار حیات خاں اور برکت علی خاں کی پرخلوص اور ان تھک کوششوں کا نتیجہ تھا انھوں نے مدرسۃ العلوم کی تعمیر میں پوری دلچسپی اور شوق کے ساتھ حصہ لیا خود مدد کی دوسروں سے دلوائی اور عمدہ خیالات کی اشاعت کے ذریعہ سے مسلمانان پنجاب کو تعلیم دینے کی کوشش کی۔

سنہ ۱۸۸۴ء میں سرسید نے پنجاب کا مشہور سفر کیا تھا اس وقت سردار صاحب ضلع گورداسپور میں جوڈیشل کمشنر تھے۔ اور انھوں نے سرسید کو وہاں آنے کی دعوت دی تھی۔ ۲۷ جنوری ۱۸۸۴ء کو سرسید اپنی پارٹی کے ہمراہ اسٹیشن گورداسپور پر پہونچے جہاں ان کا پرجوش استقبال کیا گیا اور باشندگان ضلع کی طرف سے جو سپاس نامہ سید صاحب کی خدمت میں پیش کیا گیا تھا اس کو سردار صاحب ہی نے پڑھ کر سنایا تھا۔ قیام گورداسپور کے زمانہ میں سرسید کو کئی ایڈریس مختلف جماعتوں کی طرف سے دیئے گئے تھے۔ من جملہ ان کے اپنی نوعیت کے لحاظ سے جو نیا ایڈریس تھا وہ خاتونان پنجاب کا ایڈریس تھا۔ ہندوستان کی تاریخ جدیدہ میں طبقۂ نسواں کی طرف سے اپنے طبقہ کی اصلاح کی کوشش میں آواز بلند کرنا اور ایک محسن قوم کے کارنامۂ حیات کو شکرگزاری اور احسان مندی کی نظر سے دیکھنا چونکہ اسلام کے طبقہ صنف نازک میں یہ پہلی مثال تھی لہٰذا سرسید کے خیالات دربارہ تعلیم و تربیت نسواں سننے کا اس وقت ہر شخص مشتاق تھا۔

صنف نازک کی کمیٹی نے اپنے اس ایڈریس کے پڑھنے کی خدمت بھی سردار محمد حیات خاں کے سپرد کی تھی۔ چنانچہ جواب ایڈریس کے سلسلہ میں جو مشہور اسپیچ سرسید نے کی وہ نہ صرف خیالات اور رائے کے لحاظ سے بلکہ ادب اردو میں بہترین اضافہ خیالات کے ساتھ آج تک جان سخن ہے۔

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس عمر کے لحاظ سے تیسرے سال میں تھی کہ سرسید نے ۱۸۸۸ء میں لاہور کے جلسہ کے واسطے سردار صاحب کا پریسیڈنٹ ہونا تجویز کیا۔ چونکہ کانفرنس کا ابتدائی دور تھا قدیم خیالات اور تعلیمی تعصبات کو دور کرنے کے لئے معاون اور مددگاروں کی کمی تھی لہٰذا سردار صاحب نے متواتر تین سال تک یعنی ۱۸۸۸ء سے ۱۸۹۰ء تک لاہور، علی گڑھ، الٰہ آباد کے مسلسل تین جلسوں کے فرائض صدارت انجام دینے کی کوشش کی۔ ۱۸۸۸ء میں سب سے پہلے کانفرنس کا اجلاس پنجاب میں ہوا جو زیر سرپرستی انجمن اسلامیہ عمل میں آیا تھا۔ اس انجمن کے سردار صاحب لائف پریسیڈنٹ تھے اور برکت علی خاں صاحب جنرل سکریٹری جن کی کوششوں سے کانفرنس کی غرض و غایت کو پنجاب بھر میں مقبول عام بنانے میں سرفراز ہمت کی۔

اس زمانہ میں صدر مجلس کی طرف سے بڑے بڑے خطبوں کے دینے کا مثل اس زمانہ کے رواج تھا تاہم جو تقریریں انھوں نے اس وقت کی تھیں ہم ان کو ذیل میں لکھتے ہیں تاکہ اُس وقت کے خیالات کا آج کے خیالات سے مقابلہ ہو سکے۔ [1]

خطبہ صدارت

آنریبل سرسید احمد خاں صاحب بہادر و دیگر صاحبان۔ بعد حمد ایزد متعال و نعت سید الابرار صلعم سب سے اول ہم کو اپنی قیصرہ ہند (چیرز) دام ظلہا اور تیز برطانیہ گورنمنٹ کا شکر ادا کرنا چاہیے جس کی عادل سلطنت کے ظل کے نیچے ہونے سے (جس سلطنت میں بلحاظ وسعت سورج نہیں ڈوبتا) یہ امن و امان حاصل ہے کہ اس قدر دور دراز ممالک ہند سے اس قدر علماء و فضلاء و دیگر بزرگان قوم یکجا اس دارالسلطنت صوبہ پنجاب میں واسطے سوچنے طرق تعلیم اپنی درماندہ اور پس ماندہ قوم کے جمع ہوئے ہیں۔ (چیرز) جو برکتیں اور رحمتیں ہماری قوم کو خصوصاً اور میرے پیارے اہل وطن کو عموماً حاصل ہوئی ہیں اُن کے شمار کرنے کا یہ وقت نہیں ہے۔

حضرات! آپ صاحبان نے جو عزت اس وقت مجھ کو دی ہے اُس کے واسطے میں آپ کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔ ایک جلسے کے لئے جس میں ہندوستان کے چیدہ اور برگزیدہ فضلاء رونق افروز ہیں شاید یہ زیادہ موزوں ہوتا کہ اُن صاحبان میں سے کوئی صدر انجمن چنا جاتا اگرچہ میں اپنے تئیں اس اہم ذمہ داری کے قابل نہیں پاتا لیکن امید ہے کہ آپ صاحبان کی لیاقت وفضیلت سے یہ کام بخیر و خوبی سرانجام ہو جاوے گا۔ میں نہایت فخر اور عزت سے اس قرارداد پر کہ ہمارے محمدن ایجوکیشنل کانگریس جس کے مقاصد محض متعلق تعلیم مسلمانان ہیں کوئی پولیٹیکل معاملہ پیش نہیں ہوگا چیرمین اس تیسرے سالانہ محمدن ایجوکیشنل کانگرس کا ہونا قبول کرتا ہوں (چیرز) قبل اس کے کہ میں اس جلسہ کی کارروائی کی نسبت کچھ بیان کروں میرا فرض ہے کہ میں اُن معزز مہمانوں کا جنھوں نے اپنی تشریف آوری سے انجمن اسلامیہ لاہور و اہل پنجاب کو عزت بخشی ہے جس کے لائف سکرٹری ہونے کی عزت

---

[1] اقتباس صحیفۂ زرین مطبوعہ نولکشور پریس وسفرنامۂ پنجاب سرسید احمد خاں

مجھے حاصل ہے۔

صاحبان! میرے خیال میں حاضرین جلسہ جو محض قومی ہمدردی سے قومی خدمت کے لئے جمع ہوئے وہ کسی شکریہ کی خواہش نہیں رکھتے تاہم میں اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ ان صاحبان کو جو دوردراز مقامات پنجاب اور خصوصاً بیرون از حدود صوبہ پنجاب تشریف لائے ہیں۔

انجمن اسلامیہ پنجاب کی طرف سے دل سے شکریہ ادا کروں۔ اب اس موقعہ پر جب کہ میں قوم کی طرف سے شکر ادا کر رہا ہوں نہایت ناشکری ہوگی اگر میں آنریبل سرسید احمد خان صاحب بہادر کے سی ایس آئی (چیرز) کا تمام قوم کی طرف سے اُن کی اُس عظیم الشان اور قابل قدر خدمات کا شکریہ ادا نہ کروں۔

صاحبان! سرسید نے اپنے ناتا کی امت کے ڈ ڈ یاتے جہاز کو طوفان جہالت کے بھنور سے نکالنے میں وہ مسیحائی کی ہے کہ جس کے شکر کے ادا کرنے میں میرے پاس کافی الفاظ نہیں ہیں اور میں خیال کرتا ہوں کہ اس شکر میں میں یا حاضرین جلسہ تنہا شامل نہیں ہیں۔

بلکہ خیبر سے لے کر بھاموں (ملک برہما مفتوحات جدید) تک اور ہمالیہ سے لے کر بحر جنوبی ہند تک جہاں جہاں کلمہ طیب کے پڑھنے والے ہیں وہ اور اُن کی نسلیں ابدالآباد تک مشکور اور ممنون رہیں گے۔ (چیرز)

حضرات! مجھے یقین ہے کہ آپ سب کی دلی خواہشوں کو میں اپنی زبان میں بدل رہا ہوں جب میں نہایت تہ دل سے مسٹر جوزف بک اور اس کے نامدار اور مسلمانوں کے غم خوار سپر رشید چھوٹے مسٹر بک (چیرز) کا شکریہ ادا کرتا ہوں (چیرز)، جو نہایت سچی ہمدردی انسانی سے ایک قابل رحم قوم پر رحم کر کے ہماری تعلیم کی شکستگی اور مایوسی کے طوفان میں ہم کو مدد دینے کے لئے اس مبارک جلسہ میں شامل ہوئے ہیں۔

صاحبان! شاید اس کی چنداں ضرورت نہیں کہ میں اس موقعہ پر محمڈن ایجوکیشنل کانگریس کے مقاصد کا زیادہ تفصیل کے ساتھ ذکر کروں کیوں کہ پچھلے دو سالوں کے اجلاس کی کارروائی شائع ہو جانے سے اس مبارک کانگریس کے اصول و مقاصد پوری تشریح کے ساتھ ظاہر ہو چکے ہیں مسلمانوں کی تعلیمی حالت ایک عرصہ دراز سے روبہ تنزل ہے اور ہماری مہربان گورنمنٹ کی نظر عنایت سے ہماری تعلیم کے جو وسائل اور ذریعے موجود ہیں اُن سے مسلمانوں نے بہت کم فائدہ اٹھایا ہے اس کے مقابل ہمارے پیارے اہل وطن دوسری قومیں تعلیم میں اُن سے سبقت لے گئی ہیں اور آج مسلمانوں اور دوسرے فرقوں کے لوگوں میں تعلیمی معاملات میں بہت بڑا فرق نظر آتا ہے۔ اگرچہ خدا کا شکر ہے کہ ہماری قوم میں بعض بعض اہل کمال موجود ہیں خاص کر مشرقی علوم کے

استاد اکثر پائے جاتے ہیں تاہم علوم وفنون جدیدہ کے فاضلوں کی تعداد ہماری قوم میں بہت ہی کم ہے اور عام طور پر اعلیٰ تعلیم مسلمانوں میں گویا مفقود ہی یہ تو ہماری دنیوی تعلیم کا حال ہے۔ لیکن مذہبی کا حال اس سے بھی زیادہ نازک ہے۔ وہ ہمارے پرانے مکتب اور تعلیم گاہیں کہ جہاں سے سال بسال ایک خاطر خواہ تعداد علماء و فضلاء کی دستارِ فضیلت پہن کر قوم کا باعث فخر ہوتے تھے اب اُن تعلیم گاہوں کا نام و نشان بھی نہیں۔

حفاظ قرآن شریف کی تعداد بھی اب دن بدن کم ہوتی جاتی ہے اور یہ سب باتیں قوم کے واسطے سخت ادبار نکبت کا باعث ہیں۔ گویا یہ خرابیاں محمڈن ایجوکیشنل کانگریس کی محرک ہوئیں۔ جو اہل الرائے قوم کے خیال میں نہایت ضروری امر ہیں۔ صوبہ پنجاب میں جس کی دار الخلافۃ لاہور میں آج اس مبارک کانگریس کا تیسرا جلسہ ہے اُس کے مسلمانوں کی تعلیمی حالت کا بالخصوص ذکر کرنا مجھے مناسب معلوم ہوتا ہے۔ صوبہ پنجاب کی آبادی ایک کروڑ نوے لاکھ ہے جس میں سے اٹھانوے لاکھ مسلمان ہیں اور بانوے لاکھ دیگر اقوام ۸۷-۸۸ء میں اس صوبہ میں انگریزی کے آرٹس کالج میں صرف ۶۲ مسلمان طالب علم تھے اور ۲۳۰ ہندو و سکھ صاحبان میڈیکل کالج میں صرف ۱۱ مسلمان اور ۴۷ ہندو و سکھ تھے۔ اس حساب سے گویا آرٹس کالج میں مسلمان طالب علم بمقابلہ دیگر اقوام کے ۱/۴ تھے اور میڈیکل کالج میں بھی قریباً اُسی نسبت سے مردم شماری کے لحاظ سے مسلمان بمقابلہ دیگر اقوام پنجاب میں ۶ لاکھ زیادہ ہیں اس صورت میں یہ نسبت اور بھی زیادہ افسوس ناک ہے۔ اس سے آپ صاحبان اعلیٰ تعلیم کا اندازہ کہ ہماری قوم کس پستی میں پڑی ہوئی ہے کر سکتے ہیں۔

ادنیٰ تعلیم میں مسلمانوں کی حالت دیگر اقوام کے مقابلہ میں اچھی نہیں۔ پرائمری، ٹریننگ، آرٹ، لا، میڈیکل حرفت اور دیگر خاص اسکولوں میں مسلمانوں کی تعداد ۱۵ اور ۴۶۰ تھی اور طلباء ہندو و سکھ صاحبان تعداد میں ۱۴۰۵۷ گویا ادنیٰ تعلیم میں بھی ہماری حالت اوروں کی بہ نسبت ۱/۲ ہے ۱۰۔ سے ... درجہ کے انگلو ورنیکولر اسکولوں میں مسلمان فی صدی ۱/۲ ہیں اور صاحبان ہندو و سکھ طلباء کی تعداد فی صدی ۱ ۱/۲ ہے۔ سرکاری اسکولوں میں مسلمان طلباء فی صدی تین ہیں۔ اور ہندو و سکھ صاحبان قریباً فی صدی سات اس سے آپ صاحبان ہمارے صوبہ کی ادنیٰ تعلیم کا موازنہ کر سکتے ہیں۔

نیز اس سے یہ بات بھی ظاہر ہو جاتی ہے کہ مسلمانوں نے سرکاری وسائل تعلیم سے بمقابلہ اپنی ہمسایہ قوموں کے کس قدر فائدہ اُٹھایا ہے۔ ایک وہ زمانہ تھا کہ ہماری قوم میں اہل کمال کی وہ کثرت تھی کہ ہر ایک قریہ و دیہہ میں علماء و فضلا کی ایک معقول تعداد پائی جاتی تھی۔ مسلمانوں کے دار العلوم میں نہ صرف مسلمانوں کو ہی علم حکمت سکھلایا جاتا تھا بلکہ دوسری قوموں کے لوگ بھی ان میں تحصیل علم کرتے تھے ہماری

اُس زمانہ کی فضیلت و حکمت ضرب المثل ہے۔ بغداد اور قرطبیہ کے دارالعلوم آج تک زمانہ میں مشہور ہیں اور اُن سے جو کثیر التعداد بے مثل فضلا نکلے اُن کے نام مسلمانوں کی سنہری حروف میں لکھے ہوئے ہیں اور قوم کے دلوں میں نقش سنگ کی طرح منقش ہیں اور ہمیشہ رہیں گے۔ مگر آج اس قوم کی وہ حالت ہے کہ ڈھونڈے سے بھی کوئی اُن بزرگوں کا ہم پلہ نہیں ملتا۔

صاحبان۔ جن وجوہات سے ہماری حالت اس درجہ تک پہونچ گئی ہے ان کے مفصل بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے کیوں کہ وہ اظہر من الشمس ہیں۔ پرانے طریقہ تعلیم کے بدل جانے سے مسلمانوں کی طبیعت اوچاٹ ہوگئی اور نیا طریقہ تعلیم انھوں نے اپنے مناسب حال نہ سمجھا۔ نیز انگریزی زبان کی تعلیم سے جو جملہ علوم و فنون جدیدہ کا مخزن ہے مسلمان بوجوہات چندور چند علٰحدہ رہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہم آج اپنی قوم کو علوم و فنون جدیدہ کے فاضلوں سے قریباً خالی پاتے ہیں۔

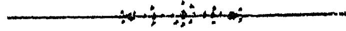
پنجاب کی تعلیمی حالت کی کمزوری کے بعض خاص وجوہات ہیں زمانہ قدیم سے پنجاب ہندوستان کا دروازہ رہا ہے۔ اور جو جو پولٹیکل انقلاب اور جنگی کارروائیاں ہوتی رہی ہیں اُن سب کا میدان یہی صوبہ رہا ہے۔ اس واسطے اس کے باشندوں کو نہ تو وقت اور نہ فرصت ملی ہے کہ وہ تحصیل علوم و فنون میں مثل باشندگان دیگر صوبہ جات کے ترقی کر سکتے۔

جب مسلمانوں کی حکومت کا پنجاب میں خاتمہ ہوا تو یہ صوبہ ایک ایسی گورنمنٹ کے ماتحت رہا کہ جس کے زمانہ میں علم کا گویا چرچا ہی نہ رہا اس باعث سے بھی پنجاب کے مسلمان تعلیم میں اور بھی کمزور رہ گئے مگر خدا کا شکر ہے کہ اب ہم ایک ایسی عادل قیصری گورنمنٹ کے زیر سایہ ہیں کہ نہ کسی بے امنی کا اندیشہ نہ کسی قسم کی رکاوٹ تحصیل علم دینی و دنیوی میں ہے۔ اب جو کچھ کہ وجہ ہے وہ صرف ہماری ہی غفلت اور افلاس ہے۔

ہماری مہربان گورنمنٹ کی پالیسی کے مطابق سرکاری اسکولوں میں مذہبی تعلیم نہیں دی جاتی اس واسطے جو مسلمان طالب علم ان اسکولوں میں تعلیم پاتے ہیں ان کی دینی تعلیم رہ جاتی ہے۔ اس موقعہ پر میں ملک پنجاب کے مسلمانوں کی جانب سے سچے دل کے ساتھ گورنمنٹ پنجاب کا شکریہ ادا کرنے سے باز نہیں رہ سکتا کہ اُس نے اس کمی کے کس قدر پورا کرنے کا انتظام فرمایا ہے۔ ہماری مقدس درسگاہیں جیسا کہ میں نے اوپر بیان کیا ہے۔ ہماری ہی کم توجہی کے باعث سے قریباً مفقود ہیں۔ ایسی حالت میں ہماری مذہبی تعلیم جو کچھ کہ ہے ظاہر ہے اور اس تعلیم میں کمی ہونے سے جو بڑا اثر ہماری قوم پر ہو سکتا ہے اس کو غالباً ہر ایک اہلِ دل بخوبی سمجھ سکتا ہے جب تک کہ ہم سب متفق ہو کر اس پر غور نہ کریں اور وہ وسائل و اسباب جن سے کہ یہ خوفناک کمی پوری ہو سکتی ہے مہیا نہ کریں گے۔ ہماری دینی و دنیوی حالت درست نہیں

ہو سکتی۔ اس غرض سے آج ہم یہاں جمع ہوئے ہیں اور مجھے امید قوی ہے کہ آپ صاحبان کی توجہ و غور سے ایسی صائب تجاویز قرار پاویں گی کہ جن کے عمل درآمد سے ہماری تعلیمی ضروریات پوری ہوں گی۔ اخیر میں اس دعا کے ساتھ کہ خداوند کریم ہماری قوم کے تعلیمی مقاصد کو روز افزوں ترقی دے کر گورنمنٹ قیصری کی نمک حلالی و فرماں برداری میں ثابت قدم رکھے ختم کرنا چاہتا ہوں۔

اے بھائیو قوم کے ناخدا کے ساتھ شامل ہو کر قومی جہاز کو بحر جہالت سے کنارہ پر لگانے میں سب ہمت مدد کریں۔ اب میں خدا کے پاک نام سے محمڈن ایجوکیشنل کانگریس کے تیسرے اجلاس کو باضابطہ کھولتا ہوں اور صاحب سکرٹری کو اجازت دیتا ہوں کہ وہ کارروائی پیش کرے۔ (بڑی دیر تک نہایت زور سے چیرز)



اجلاس چہارم

(منعقدہ علی گڑھ ۱۸۸۹ء)

صدر نجم الہند سردار محمد حیات خاں بہادر سی آئی ای

نوٹ:- حالات صدر اجلاس سوم (مندرجہ صفحہ ۴۴) کے ذیل میں درج ہو چکے ہیں اور اجلاس چہارم ۱۸۸۹ء کے افتتاح کے وقت بمجبوری سردار صاحب تشریف نہ لا سکے۔ اس وقت سرسیدؔ کی تحریک سے اور حاضرین اجلاس کے اتفاق سے خان بہادر محمد برکت علی خاں صاحب نے جو سرسید کے مخلص دوست تھے فرائض صدارت انجام دیئے اور موصوف نے حسب ذیل تقریر کی۔

اسپیچ خان بہادر محمد برکت علی خاں صاحب اجلاس

یہ ایک اتفاقیہ امر ہے جو میں نے یہ کرسی لی ہے۔ میرے دوست خان بہادر سردار محمد حیات خاں اس وقت کی گاڑی میں نہیں آئے مگر ابھی تار آیا ہے کہ وہ گیارہ بجے کی گاڑی میں آجاویں گے۔

میں سب صاحبوں کا جنھوں نے اس وقت مجھے یہ عزت بخشی ہے دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں گو اس وقت مجھ کو رنج ہے کہ میرے معزز سردار محمد حیات خاں اس وقت غیر حاضر ہیں۔ مگر مجھ کو اس بات کی خوشی ہے کہ میں اس قومی کام کو اپنے معزز دوست کی نیابت کے طور پر انجام دے رہا ہوں۔

اب میں محمڈن ایجوکیشنل کانگریس کے چوتھے اجلاس کو باضابطہ کھولتا ہوں۔

اور اعلان کرتا ہوں کہ محمڈن ایجوکیشنل کانگریس کا چوتھا سالانہ اجلاس کھولا گیا اور سکرٹری سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ کارروائی اجلاس کو شروع کریں۔

اجلاس پنجم

(منعقدہ الہ آباد ۱۸۹۱ء)

صدر نجم الہند سردار محمد حیات خاں، خان بہادر سی آئی ای

نوٹ۔ صدر صاحب کے حالات خطبہ سوم کے ساتھ درج ہو چکے ہیں۔ (ملاحظہ ہو ص ۴۴)
خطبۂ صدارت حسب ذیل ہے۔

خطبۂ صدارت

صاحبان، برادران، اور اے میرے پیارے ہند کے اہل وطن! ایک ایسے بڑے قومی جلسہ میں اور باوصف اس امر کے کہ ہماری قوم کے علماء اور فضلا اور فصحا اریٹر اس جلسہ میں تشریف رکھتے ہیں جن کی لیاقت خدا داد کا نہ صرف ہم مسلمانوں کو ہی فخر ہے بلکہ تمام اہل ہند کو جو اُن کے حالات سے واقف ہیں صدق دل سے اعتراف ہوگا۔ مجھ کو باتفاق رائے اس جلسہ عظیم کا پریسیڈنٹ منتخب کرنا میرے لئے باعث فخر اور عزت ہے۔ اگرچہ من آنم کہ من دانم۔ میں اپنے تئیں اس لائق نہیں سمجھتا۔ لیکن یہ محض آپ صاحبان کا جو اپنی قوم کے لیڈر اور پیشوا ہیں حسنِ ظن اور عنایت ہے کہ میری اور میرے ساتھ پنجاب کی عزت افزائی فرمائی ہے کہ متواتر تین سال سے مجھ کو یہ فخر دیا گیا کہ میں محمڈن ایجوکیشنل کانگریس کی میٹنگ کو پریزائڈ کروں۔ کچھ تو اس وجہ سے کہ میں اپنے تئیں اس کے لائق نہیں سمجھتا ہوں اور کچھ اس وجہ سے کہ میری رائے میں ہر میٹنگ کے واسطے ہر سال پریسیڈنٹ جدید منتخب ہونا بہتر ہوتا۔ میری آرزو تھی کہ سال حال کی اس مجلس بزرگ کا پریزیڈنٹ کوئی اور بھائی مقرر ہوتا۔ مگر نتیجہ سے معلوم ہوا کہ مقدر نے اس دفعہ بھی یہ عزت میرے حصہ میں لکھی تھی۔

آپ یقین مانیں کہ تا بزیست میری زندگی کے خوشی کے دنوں میں سے آج کا دن خوش تر یادگار میرے دل میں رہے گا۔ میں بڑے فخر سے اس عزت کو قبول کرتا ہوں اور آپ صاحبان کا اپنی قوم کے ایک

ناچیز خادم کو اس عزت کے لئے جس سے ایک محب قوم شخص کے واسطے کوئی بہتر عزت نہیں ہو سکتی منتخب کرنے کا تہ دل سے شکر ادا کرتا ہوں۔

صاحبان! آج سے پہلے اس قومی تعلیمی کانفرنس کے چار جلسے ہو چکے ہیں۔ پہلا جلسہ علی گڑھ میں ہوا ستاسی ممبر شریک تھے۔ دوسرا اجلاس لکھنؤ میں ہوا جس کے میزبان اور پریزیڈنٹ ہماری قوم کے فخر منشی محمد امتیاز علی صاحب حال مدار المہام بھوپال تھے۔ اور جس میں ایک سو تیئیس ممبر شامل ہوئے تیسرا جلسہ بمقام لاہور ہوا جس میں دو سو اٹھاون ممبر اور بہت سے وزیٹر شامل تھے کہ جس کی میزبان انجمن اسلامیہ پنجاب اور اس کے مہتمم میرے پیارے بھائی محمد برکت علی خاں بہادر سکرٹری انجمن موصوف تھے۔ چوتھا اجلاس ہمارے قومی گھر یعنی مدرسۃ العلوم علی گڑھ میں ہوا جس کے میزبان میرے آنریبل فرینڈ جسٹس سید محمود تھے اِن کل اجلاسوں کی آمدنی چندہ جس قدر ہوئی بعد وضع اخراجات ضروری ہر اجلاس کے حسب اقتضاء رائے اراکین اس قومی تعلیمی مجلس کے اسکالرشپ فنڈ میں جمع کی گئی۔

اب یہ پانچواں اجلاس بمقام الٰہ آباد جو صدر مقام اضلاع شمال و مغرب واودھ کا ہے منعقد ہوتا ہے۔ اس اجلاس کے لئے میں خداوند کریم کا شکر ادا کرنے کے بعد اعلان کرتا ہوں کہ تعداد ممبران پچھلے چار اجلاسوں سے بہت بڑھ گئی ہے یعنی تقریباً آٹھ سو ممبر اب تک ہو چکے ہیں اور جس کے کل چندے اور ڈونیشن کی میزان قریباً پچھلے چاروں اجلاسوں کی برابر ہے اور یہ سب بعد منہائے اخراجات ضروری متعلق کانگریس قومی فنڈ تعلیم میں جمع ہوگا۔ اب میں اپنی قوم کے فخر سر سید سکرٹری سے باادب تمام پوچھتا ہوں کہ آیا اب بھی وہ پنجاب کو زندہ دل کہیں گے جس سے گو مجھے بہت خوشی ہے مگر جو شوق سال حال کے اجلاس میں ہمارے شمالی مغربی اضلاع کے بھائیوں نے ظاہر کیا ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ وہ بدرجہا پنجاب سے بھی زیادہ زندہ دل ہیں۔ میں خدا سے التجا کرتا ہوں کہ ہندوستان کے کل مسلمان اپنی قومی تعلیم کی ترقی کے لئے کہ یہی ایک کنجی ہماری گم شدہ خزانہ علمی کے دوبارہ حاصل کرنے کی ہے بدل و جان توجہ فرما دیں اور تعلیم کی گھوڑدوڑ میں جو پیچھے ہو گئے ہیں پیش قدمی کی کوشش کریں۔

صاحبان! آپ یقین مانیں کہ زمانہ کا انجن ہم کو اس رفتار موجودہ پر چلنے سے پیس دے گا۔ جاگو اُٹھو اور آگے بڑھو خدا اُن کی مدد کرتا ہے جو اپنی آپ مدد کرتے ہیں۔

صاحبان! آپ بخوبی جانتے ہیں اور میں بحیثیت پریزیڈنٹ اور نیز اس لحاظ سے کہ میں خود اور نیز بہت سے دیگر اصحاب موجودہ سرکاری عہدہ دار ہونے کی عزت رکھتے ہیں اس امر کو ظاہر کرنا سب سے مقدم اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ اس جلسہ کو صراحتاً یا کنایتاً کوئی تعلق کسی پولیٹکل اور مذہبی مباحثہ سے

ہرگز ہرگز نہیں ہے۔ یہ کانگریس صرف بغرض ترقی تعلیم مسلمانان قائم کی گئی ہے اور اس کے اغراض اسی حد تک محدود ہیں کہ جہاں تک ان کا تعلق ترقی تعلیم مسلمانان سے ہے۔ چنانچہ جو مقاصد اس تعلیمی کانگریس کے قرار دیئے گئے ہیں وہ میں آپ کو پڑھ کر سناتا ہوں۔ اور وہ یہ ہیں :۔

اس کانفرنس کو کسی پولیٹیکل امر سے یا کسی قسم کے مذہبی مباحثہ سے کچھ تعلق نہ ہوگا اور اس کے مقاصد حسب تفصیل ذیل ہونگے مسلمانوں میں یورپین سینسز و لٹریچر کو پھیلانے اور وسیع حد تک ترقی دینے اور اس میں نہایت اعلیٰ درجہ کی تعلیم تک اُن کو پہنچانے پر کوشش کرنا اور اس کی تدبیروں کو سوچنا اور ان پر بحث کرنا۔ مسلمانوں کی تعلیم کے لئے جو انگریزی مدرسے مسلمانوں کی طرف سے جاری ہوں ان میں مذہبی تعلیم کے حالات کو دریافت کرنا اور بقدر امکان عمدگی سے اس تعلیم کے انجام پانے میں کوشش کرنا۔

جو لوگ علوم مشرقی و دینیات کی تعلیم قدیم طریقہ پر ہماری قوم کے علماء سے پاتے ہیں اور اسی کو اُنھوں نے اپنا مقصد قرار دیا ہے اُن کے حالات کی تفتیش کرنا اور ان میں اس تعلیم کے قایم اور جاری رہنے کی مناسب تدابیر کا عمل میں لانا۔ عام لوگوں میں جو عام تعلیم قدیم مکاتب کے ذریعہ سے جاری تھی اس کے حالات کی تفتیش کرنا اور ان میں جو تنزل ہوگیا ہے اس کی ترقی اور عام لوگوں میں عام تعلیم کے مناسب وسعت کی تدابیر اختیار کرنا۔

جو مکاتب عام لوگوں کے لڑکوں کے لئے قرآن مجید پڑھنے کے تھے اور جو سلسلہ قرآن مجید کے حفظ کرنے کا تھا اور جن کا اب بہت کچھ تنزل ہوگیا ہے اُن کے حالات کی تفتیش کرنا اور اُن کے قایم رکھنے اور استحکام دینے کی تدابیر اختیار کرنا۔

اور میں بحیثیت پریزیڈنٹ آپ سب ممبران کو متوجہ کرتا ہوں کہ تمام کارروائی اور مباحثہ میں ان مقاصد سے تجاوز نہ فرمائیں

حضرات ! ہرگاہ یہ جلسہ تعلیمی محض مسلمانوں کی ترقی تعلیم کے واسطے ہے جو مملکت ہذا میں پانچ کروڑ رعایا قیصرِ ہند ہیں جس کی سلطنت اس قدر وسیع ہے کہ جس میں سورج نہیں ڈوبتا اور جو ہر طرح اس شہنشاہ عادل کی نمک حلالی اور وفاداری پر نہ صرف قایم ہی رہنا بلکہ بشرط ضرورت جاں نثاری کرنے کو اپنا فرض سمجھتے ہیں اور چند بواعث ناگزیر یا یوں صاف کیوں نہ کہوں کہ اپنی شامت اعمال سے تعلیم میں بہت پیچھے رہ گئے ہیں وہ ہر ایک صوبہ کی لوکل گورنمنٹ اور مقامی حکام کی مدد اور توجہ کے محتاج ہیں اور میں نہایت خوشی سے آپ صاحبوں کے سامنے بیان کرتا ہوں کہ صوبہ پنجاب کی لوکل گورنمنٹ نے جوبلی وظائف مسلمانوں کی تعلیم کے لئے مقرر فرمائے اور بعد اس کے سکھ اور راجپوت پیشہ قوموں کے لئے جو تعلیم میں پیچھے رہ گئے ہیں ایسے ہی مراعات کو توسیع دی جس سے دل ما روشن چشم ماشاد ہم سب کو خوش ہونا چاہیئے۔

اور ہمارا اصول انسانی ہمدردی کا یہ ہونا چاہیئے کہ جب ہم اپنی کمی کو پورا کریں تو ہمارے پیارے اہل وطن میں سے جو فرقہ اس نعمت عظمیٰ سے پیچھے رہ گیا ہو۔ اس کو تن من دھن سے برادرانہ مدد دیں تاکہ دولت تعلیم سے ہمارے تمام اہل وطن یکساں مالامال ہوں۔ یا خدا تو ایسا ہی کر آمین۔

صاحبان ! ہندو اور مسلمانوں کے باہم چولی دامن کا تعلق ہے جو کسی طرح جدا نہیں ہوسکتے ہماری قوم کے

پانچ کروڑ لوگوں میں سے میرے خیال میں فی صدی پچانوے ایسے شخص ہوں گے جن کا خون خاک ہند سے پیدا ہوا ہے۔ صاحبان کسی مہذب ملک مہذب قوم میں مذہب یا مشرب انسانی ہمدردی کو چھوڑ نہیں سکتا۔

میری آرزو ہے کہ تمام قیصری رعایائے ہند صرف اپنے مذہبی معبدوں میں تمیز ہو سکیں۔ ہندو مندروں اور شوالوں میں، عیسائی چرچ اور گرجوں میں، مسلمان مسجدوں اور خانقاہوں میں مگران متبرک مکانوں سے باہر تمام بھائی بھائی ہوں۔ اور جب تک حب وطن کا جوش اس درجہ تک نہ پہونچیگا کہ کنٹری مین کی عزت کو اپنی عزت سمجھیں تب تک ہاف سولائزڈ کا کلنک ہم سے دور نہیں ہوگا کیوں کہ ہم اور ہندو ایک ہی خاک ہند کی پیدائش ہیں۔

ہم کو سر آکلینڈ کالون آپ کے صوبہ کے ہر دل عزیز لفٹنٹ گورنر کی اعلیٰ بیدار مغزی اور تدبر سے توقع ہے کہ وہ اپنی قیصری رعایا کے درماندہ گروہ کی دستگیری کریں گے اور اپنی گورنمنٹ کو پنجاب گورنمنٹ کی طرح فیاض ثابت کریں گے۔ جو کچھ اب تک انھوں نے تعلیم کے بارہ میں توجہ فرمائی اس کی بیٹنگ تہ دل سے شکر گزار ہے۔

صاحبان! میں یقین کرتا ہوں کہ تمام صادق دل جنٹلمین اور شرفا خواہ وہ کسی قوم کے ہوں اور کسی مشرب کسی فرقہ رعایائے قیصری میں سے ہوں ان کو ہماری قوم کی پس ماندہ حالت دیکھ کر ہمارے مقاصد کے ساتھ دلی ہمدردی ہے اور میری رائے میں یہی جوہر انسانی ایسا ہے جس کا نام اخلاق روحانی کہا جا سکتا ہے۔ اس کا نمونہ کسی اور بہتر طریقہ سے میں پیش نہیں کر سکتا کہ جو چٹھی آنریبل جسٹس اسٹریٹ (جن کے واسطے ہماری دعا ہے کہ آئندہ اجلاس میں ہم کو سر ڈگلس اسٹریٹ کہنے کا موقعہ ملے) آپ کو پڑھ کر سنائی جائے۔ پریسیڈنٹ کے فرمانے سے مسٹر تھیوڈور بک نے وہ انگریزی چٹھی اور سکریٹری نے اس کا اردو ترجمہ اجلاس میں پڑھ کر حاضرین کو سنایا جو حسب ذیل ہے۔

الہ آباد مورخہ ۲۱ر دسمبر ۱۸۹۰ء

مائی ڈیر سر سید احمد

میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے ممبروں کا جنھوں نے مجھ کو اس جلسۂ کانفرنس میں مدعو کیا شکریہ ادا کرتا ہوں مگر حاضری سے قاصر ہوں کیوں کہ جن تاریخوں میں جلسۂ کانفرنس شروع ہو گا یعنی ۲۸-۲۹-۳۰ر کو میں الہ آباد میں نہ ہوں گا تاہم میں امید کرتا ہوں کہ آپ لوگ بغیر کسی خیال کے مجھ کو اس بات کے کہنے کی اجازت دیں گے کہ میں دل سے امید کرتا ہوں کہ جیدہ جیدہ خیالات اور مباحثے جو اس جلسہ میں پیش ہونگے نہایت عمدہ اور باعمل نتیجہ اس خاص گروہ مسلمانان کے لئے جو ملکہ معظمہ قیصر ہند کی رعایا میں پیدا کریں گے جن کی علمی ترقیوں کی غرض آپ کے اس قدر مفید اور زمانہ دراز کی زندگی کی کارکردگی ہے۔ جس کام میں کہ آپ اس قدر بدل سرگرم ہیں اس میں آئندہ ترقی کے علامات عیاں ہیں۔ چھوٹے غرور و تعصب و تنگ دلی کی رکاوٹیں جس کے پردہ میں زمانہ حال میں چند سال پیشتر تک ذی رتبہ اور شریف مسلمان تعلیمی فوائد کی طرف سے مخالفت اور سرد مہری اختیار کرتے تھے جب کہ دیگر اقوام ان فوائد

میں بہرہ ور ہوتی تھیں۔ وہ رکاوٹیں جلد جلد دور ہوتی جاتی ہیں۔ ان لوگوں کے لئے جو ہماری مسلمان رعایا کو عمدہ عمدہ عہدوں پر ممتاز دیکھنا اور ریاست کے تمام عہدوں میں داخل ہونا اور نیز ہر پیشہ میں شامل ہونا پسند کرتے ہیں۔ بڑی مبارک بات ہے اس سے ان کو سبق مل گیا۔ ان ترقیوں کے دنوں میں ہر شخص اور تمام اشخاص کو جلدی یا دیر میں سبق یاد کرنا چاہیئے کہ غرور کا یہ نتیجہ ہے اور یہ کہ جس بات سے تعلیم سے انکار ہے وہ دیگر لوگوں کے تجربے اور عقل کے شگوفے ہیں۔

اس تعصب سے زیادہ کوئی اور بات بڑھ کر قاتل نہ ہوگی کہ اس بات کا سمجھنا اور اس پر عمل کرنا کہ جس سے یہ مفہوم ہو کہ یہ اصول اور اُن کی عمدگی کا نہایت ہی بلند نتیجہ ہے۔

میں جانتا ہوں کہ میں نے کوئی غلطی اس کے سمجھنے میں نہیں کی جب کہ میں خود آپ سے اور ممبران کانفرنس سے یہ امر بیان کرتا ہوں کہ بہت سے ان میں سے اور خاص کر آپ مجھے بخوبی جانتے ہیں کہ میں ہر طرح کی ذات کے خیال سے مبرا ہوں اور مجھے نہایت ہی فخر اپنی دلی توجہ کا منجانب کانفرنس اُن خاص امور میں جن میں آپ اور وہ مشغول ہیں ہوگا۔

آپ کا سر سید احمد نہایت ہی دلی دوست

ڈکلس اسٹریٹ

صاحبان! ہم آپ کو اپنی اس تعلیمی کانفرنس سے جن برکتوں کی توقع ہے اور جو مفاد ہم کو حاصل ہوتے ہیں اُن میں سے یہ فائدہ کچھ کم قابل قدر نہیں ہے جو ہر سال ہماری قوم کے علماء اور فضلا کے قیمتی لکچروں اور قومی مضامین کی تحریروں سے حاصل ہوتا ہے جو اس میٹنگ میں پڑھے جاتے ہیں۔ پچھلے سالوں میں ہمارے لائق پروفیسر مولوی محمد شبلی صاحب اور مولوی حافظ نذیر احمد صاحب اور مولوی الطاف حسین صاحب حالی کی بیش بہا تحریروں سے قوم متمتع ہوئی ہے۔ اور اس سال کے اجلاس میں جو بات نہایت خوشی اور بے انتہا مسرت بخشنے والی ہے وہ ہمارے جلیل القدر اور فاضل بے بدل نواب محسن الملک محسن الدولہ منیر نواز جنگ بہادر مولوی سید مہدی علی صاحب کی شمولیت ہے (جو ہر ایک مسلمان کا فرض ہے) اور اپنے بے نظیر علم و فضل سے قوم کو فائدہ بخشنے کے لئے تیار ہیں۔ نواب صاحب کی کوئی تحریر یا تقریر سننے کے لئے قوم کے اشتیاق کی کوئی حد باقی نہیں رہی تھی۔

اس تعلیمی کانفرنس کا شکر ہے جس کے ذریعہ سے یہ دیرینہ تمنا اب پوری ہونے والی ہے۔ دوسری ایسی خوشی کی بات ہمارے قابل عزت اور واجب الادب اور عالم و فاضل پروفیسر مسٹر آرنلڈ صاحب کا لکچر دربابِ مسلمانانِ مجمع الجزائر وچین ہے جس کے سننے سے سامعین کو فاضل پروفیسر کی قابلیت کی



نواب حاجی محمد اسحاق خان بهادر
صدر اجلاس ششم کانفرنس (علی گڈه سنه ۱۸۹۱ ع)

داد دینے کا موقع ملے گا۔ ہماری قوم کو پروفیسر ممدوح کی اس محبت اور ہمدردی کا جو وہ ہماری قوم کے ساتھ رکھتے ہیں شکرگزار ہونا چاہیئے۔

اے صاحبان اب میں خداوند پاک رحیم وکریم کا نام لے کر اعلان کرتا ہوں کہ پانچواں اجلاس محمدن ایجوکیشنل کانفرنس کا کھولا گیا اور صاحب سکرٹری کو اجازت دیتا ہوں کہ وہ کارروائی شروع کریں۔

اجلاس ششم

(منعقدہ علی گڑھ ۱۸۹۱ء)

صدر نواب حاجی محمد اسحٰق خاں صاحب پنشنر ڈسٹرکٹ وسشن جج سابق آنریری سکرٹری مدرسۃ العلوم علی گڑھ

حالات صدر

نواب اسحٰق خاں غفران مآب نواب عظیم الدولہ سرفراز الملک محمد مصطفےٰ خاں صاحب مظفر جنگ دہلوی متخلص بہ حسرتی وشیفتہ تعلقہ دار جہانگیر آباد ضلع بلند شہر کے تیسرے صاحبزادہ تھے۔ نواب عظیم الدولہ بہادر اپنے علم وفضل، زہد وورع، اخلاق وعادات اور بلند پایہ شاعری کی حیثیت سے نیز اپنے درجۂ امارت کی خصوصیات سے تہذیب وامارت دہلی کے آخری دور میں ان باکمال لوگوں میں سے تھے جن کی ذات گرامی سے خود ان کا زمانہ ان پر فخر اور ناز کرتا تھا۔ دولت وثروت کے پایۂ رفیع پر پہونچکر اور علم وفضیلت کا درجہ حاصل کرنے کے بعد ان کی خدا ترسی، خاکساری اور ان کی سیرت کا معمولی سا واقعہ بھی اس زمانہ میں تحیر اور تعجب پیدا کرنے کے لئے کافی ہے اس لئے کہ قدیم تہذیب اور اخلاق کہن کی بساط بالکل الٹ چکی ہے۔ پرانے سانچوں کا وجود باقی نہ رہنے سے جس میں قدیم سکے ڈھلتے تھے بازار میں ان کا چلن معدوم ہے۔ قوم کی خصلت کہن،

اس کی گزشتہ تہذیب، قدماء کی شاہ راہ عمل کی نشانیاں اگر ڈھونڈھنے اور تلاش کرنے سے مل سکتی ہیں تو ان کا ذکر اٹے مٹے اور پراگندہ کاغذوں میں ہی کہیں کہیں باقی رہ گیا ہے۔ اب کون ہے جو ان حقائق اور کیفیتوں سے گزر کر دورِ حیات کی کامیابی کے لئے ان پر بھی کچھ غور کرے اور سوچے، اور جن کے مطالعہ سے پھر سوسٹی میں جان پڑنے کی امید ہو۔ اب تو جس انجمن کو ٹٹولو حیات سے خالی اور افسردگی و افشردگی متاعِ زندگی ہے

حریفاں بادہ ہا خوردند و رفتند
تہی خمخانہ ہا کردند و رفتند

نواب محمد اسحاق خاں کی پیدائش ۱۸۶۰ء میں ہوئی۔ برگزیدہ اور نامور باپ کی آغوشِ شفقت میں پرورش کے سامان ہوئے۔ جب مکتب نشینی اور پڑھنے لکھنے کے دن آئے تو منتخب اساتذۂ فن کے زیر تعلیم و تربیت کئے گئے۔ خوش طالعی اور خوش بختی کا اس سے زیادہ کیا ساز و سامان ہوگا کہ خواجہ الطاف حسین حالی جیسا استاد ملا جس کی فطری نیکی، پاک خصلت، علمی فضیلت کو ایک زمانہ جانتا اور پہچانتا ہے۔ جن کی ایک ذات بیسیوں درس گاہوں کا نچوڑ، سینکڑوں اساتذۂ فن کی جان اور مجموعۂ اخلاق و کمال کے لحاظ سے مجسمۂ یونیورسٹی تھی۔ چنانچہ ابتدائی اور ثانوی تعلیم کا زمانہ زیر تربیت مولانا حالی گزرا اور اردو فارسی، عربی کی تعلیم گھر پر رہ کر جہانگیر آباد میں ختم کی۔ پدر بزرگوار کی وفات کے بعد گھر سے باہر نکلے اور آگرہ کالج میں داخل ہو کر اول درجہ میں انٹرنس پاس کیا۔ اور جب تئیس ۲۳ برس کی عمر ہوئی تو ذاتی لیاقت اور خاندانی وجاہت کے لحاظ سے سول سروس میں منتخب ہوئے اور سب سے پہلے اسسٹنٹ مجسٹریٹی کے عہدہ پر تقرر ہو کر ضلع مظفر نگر میں تعینات ہوئے۔ رفتہ رفتہ مناصب میں ترقی اور کامیابی برابر ہم رکاب رہی حتی کہ مستقل طور سے سشن جج کے عہدے پر فائز ہوئے، ۱۸۹۶ء میں ہز ہائی نس نواب صاحب بہادر والی ریاست رامپور نے ریاست کی مدار المہامی کے لئے طلب فرمایا اور پانچ برس تک اس اہم خدمت کے فرائض بہ طریق شائستہ انجام دے کر اپنے اصل عہدۂ ججی پر واپس آ گئے۔ ۱۹۱۱ء میں بہ ارادۂ حج و زیارات مدینۂ طیبہ ایک سال کی رخصت لی مکۂ مکرمہ مدینۂ طیبہ کے سفر سے سعادت دارین حاصل کر کے شام، بیت المقدس، حلب، بیروت کے مقدس مقامات کو بھی دیکھا۔ ۱۹۱۲ء میں اس طویل سفر سے واپسی ہوئی ۱۹۱۳ء میں نواب وقار الدولہ وقار الملک مولوی محمد مشتاق حسین صاحب نے بوجہ علالت مسلسل عہدۂ آنریری سکرٹری مدرسۃ العلوم علی گڑھ سے قطعی طور پر مستعفی ہونے کا فیصلہ کر کے اپنی جانشینی کے واسطے نواب محمد اسحق خاں صاحب کو انتخاب کیا مدرسۃ العلوم چوں کہ قوم کا ایک بڑا سرمایہ تھا اس لئے مدرسۃ العلوم کے آنریری سکرٹری کی عزت اُس کا درجہ اُس کا مرتبہ اور اُس کے اہم فرائض کی ذمہ داریاں جو ایک طرف قوم سے دوسری طرف حاکمان اعلیٰ سے

مربوط کئے ہوئے تھیں اس منصب کے لئے ایک بلند اور جامع صفات ہستی کی خدمات کے طالب رہتی تھیں نواب وقار الملک کے اس انتخاب کو عام طور پر اعتماد اور بھروسہ کی نظر سے دیکھا گیا اور با وجود دیکہ نواب محمد اسحٰق خاں صاحب کی میعاد ملازمت میں پانچ سال باقی تھے اور اس وقت ریٹائر ہونے میں حق پنشن میں ایک معقول کمی واقع ہوتی تھی لیکن نواب وقار الملک بہادر کے اصرار قوم کی توجہ اور مدرسۃ العلوم کی خدمت کے خیال سے اُنھوں نے قبل از وقت پنشن لے لی اور نواب وقار الملک کو سبک دوش کر کے اس خدمت پر آئے جہاں بظاہر وہ سب سے بڑے تھے لیکن بہ باطن سب کے چھوٹے اور قوم کے خدمت گزار اُنھوں نے بغایت دل چسپی، محنت، شوق، اور صبر و تحمل کے ساتھ اس قومی خدمت کے فرائض انجام دیئے

مدرسۃ العلوم کو روز پیدائش سے اور اس زمانہ تک بڑی بڑی جلیل القدر ہستیوں کا خیر مقدم کرنا پڑا حتیٰ کہ ملک معظم اور ملکہ معظمہ غفران مآب امیر حبیب اللہ خاں شاہ افغانستان بھی اپنی اپنی باری پر تشریف لائے لیکن ہر وقت اور ہر زمانہ کی یہ تمنا اور آرزو رہی کہ اعلیٰ حضرت حضور نظام اپنے قدوم میمنت لزوم سے سرزمین مدرسۃ العلوم کو افتخار بخشیں لیکن اس وقت تک پوری نہ ہوئی تھی۔

مشیت ایزدی نے یہ شرف نواب صاحب کی قسمت میں بخشا تھا کہ وہ سرکار عالی کا خیر مقدم کریں۔ چنانچہ مدتوں بعد نخل آرزو میں امید کا پھول پھولا اور نواب صاحب کی درخواست اور التجا کو بندگان عالی نے منظور فرمایا۔ ۱۹۱۷ء میں اعلیٰ حضرت اسپیشل خاص کے ذریعہ سے معہ خدم و حشم رونق افروز کالج ہوئے۔ یہ ورود مسعود اور اس دن کی دل فریبیاں تاریخ مدرسۂ قومی کا صفحۂ زرین بن کر رہیں گی۔ یونیورسٹی میں عثمانیہ ہوسٹل کی رفیع الشان عمارت اس ورود ہمایوں کی یادگار ہے۔ اعلیٰ حضرت نے ایما فرمایا تھا کہ نواب صاحب حیدر آباد آئیں ممدوح کا پختہ ارادہ تھا کہ وہ ارشاد اقدس کی تعمیل کریں۔ سرکار عالی کے قومی درس گاہ میں تشریف لانے اور نواب صاحب کی حیدر آباد کی روانگی کے متعلق بیت العلوم کو ظل سبحانی کی توجہ سے بڑی بڑی امیدیں ہو گئی تھیں لیکن افسوس کہ قضا و قدر کے حکم نے بیک چشم زدن بہت سی خواہشوں کا خاتمہ کر دیا۔

اسی زمانہ میں نواب صاحب کا مزاج جادۂ اعتدال سے ہٹ گیا۔ صحت دن بدن خراب ہوتی چلی گئی بالآخر افاقہ ہوا کہ دفعتاً کرسی پر بیٹھے بیٹھے حرکت قلب بند ہو جانے سے روح جسد فانی سے پرواز کر گئی۔ نعش میرٹھ سے لے جا کر دہلی میں نزدیک نظام الدین اولیاؒ پہونچائی گئی اور اپنے بزرگوں کی ٹہر وائر میں سپرد خاک ہو گئے۔ ان کی موت نے ایک عالم کو افسردہ کر دیا اور سوسائٹی سے روح کی شگفتگی اور دل چسپی کا سامان جاتا رہا۔

نواب صاحب نے امارت و ثروت کی گود میں پل کر آنکھ کھولی اور ہوش سنبھالا تھا۔ جب

نوجوانی کی عمر کو پہونچے تو اورنگ حکومت پر سرفرازی پائی لیکن تمام مدارج زندگی میں منکسر المزاجی خوشخوئی اور خاکساری ان کا شعارِ زندگی رہا۔ وہ نہایت بااخلاق خندہ رو اور شگفتہ مزاج تھے۔ غرباء پر مہربان اور ان پر شفقت فرماتے تھے، فیاضی سیر چشمی بلند نظری ان کی موروثی فطرت تھی۔ خوش خوراک و خوش پوشاک تھے۔ چہرے سے امارت اور سرداری کی شان عیاں تھی۔ بظاہر یوروپین تمدّن و معاشرت کے گرویدہ معلوم ہوتے تھے لیکن ان کی فطرت سلیم "درویش صفت کلاہ تتری دار" کی پوری طور سے مصداق تھی۔ وہ ابتداء عمر سے نہ فقط نماز روزے کے پورے طور سے پابند تھے بلکہ راتیں جو آرام و سکون کے لئے ہیں جب کہ ایک عالم محوِ خواب نوشیں ہوتا تھا ہم نے خود دیکھا ہے کہ نواب صاحب کئی کئی گھنٹے خلوت کدے میں سر بہ سجود نظر آتے تھے۔ انھوں نے دلِ بریاں اور چشمِ گریاں پائی تھی۔ ماہ ربیع الاول مبارک میں نہایت اہتمام اور حوصلے کے ساتھ ان کے یہاں محفل میلاد کا اہتمام ہوتا تھا اور جب تک مجلس میلاد ختم نہ ہولیتی تھی وہ برابر ادب کے ساتھ دست بستہ باچشم پُرنم کھڑے رہتے تھے۔ علماء ملت اور بزرگانِ دین کا احترام نہایت خوش عقیدتی کے ساتھ کرتے تھے مدرسوں اور خانقاہوں کی ماہانہ امدادیں مقرر تھیں۔

ایک مرتبہ ہم نے خود اپنی آنکھوں سے استاد کے ادب و احترام کا واقعہ دیکھا ہے۔

وہ مدرستہ العلوم کے سکرٹری ہیں اپنی کوٹھی سے لینڈو میں سوار ہو کر داخل احاطۂ بورڈنگ ہاؤس ہوتے ہیں۔ ظہور وارڈ کے قریب سے گزر کر دور سے دیکھتے ہیں کہ مولانا حالی پیدل آرہے ہیں۔ وہ بیس قدم کے فاصلے سے گاڑی کو روکتے ہیں اُتر کر مولانا کو سلام کرکے مزاج پرسی کرتے ہیں اور دریافت کرتے ہیں کہ آپ کہاں تشریف لئے جاتے ہیں۔ ادھر سے اصرار ہوتا ہے کہ گاڑی پر سوار ہو لیجئے وہ فرماتے ہیں کہ منزل کے قریب ہوں چند منٹ میں جہاں جاتا ہوں پہونچ جاتا ہوں۔ آخرکار نواب صاحب کا اصرار غالب آیا مولانا سوار ہوئے داہنے ہات پر انھیں بٹھایا۔ بائیں پر خود نشست کی اور جہاں وہ جانا چاہتے تھے وہاں لے جاکر اتار دیا۔

دوسرا واقعہ چشم دید نہیں سماعی ہے۔

حاجی منشی ممتاز علی خاں صاحب جامع اوراق "عود ہندی" (رقعات غالب) کنبوہان میرٹھ کے مشاہیر خاندان کے بلند پایہ بزرگ تھے۔ غدر سے پہلے اٹاوہ میں تحصیلدار تھے اور اٹاوہ ہی کو مسکن بنالیا تھا۔ نواب شیفتہ مرحوم کے خاص دوستوں میں سے تھے۔ نواب اسحٰق خاں حیثیت مجسٹریٹ ہو کر اٹاوہ میں تعینات ہوتے ہیں۔ نوعمری، نوخیزی کے ساتھ حکومت کے عہدے کا تعلق ہوتا ہے۔ باپ کے تعلقات دوستی کے لحاظ سے حاجی صاحب کی خدمت میں بھی حاضر باشی کا سلسلہ قائم ہے۔ اِدھر سے نیاز اُدھر سے تازہ کا

دستور العمل جاری ہے۔ ایک دن معمولی خانگی واقعہ پر حاجی صاحب نے جن کا دیوان خانہ صبح و شام مستفاد اٹاوہ کا دربار معلوم ہوتا تھا بر ملا عام مجلس میں نواب صاحب کو اس طرح سے ڈانٹا اور اظہار ناراضی کیا جس کو موجودہ زمانہ کی تہذیب اور معاشرت کسی طرح برداشت نہیں کر سکتی۔ نواب صاحب پاس ادب کی وجہ سے جواب تو کیا دے سکتے تھے خموش ہو کر اُٹھ کھڑے ہوئے نوجوانی اور حکومت کا سرور خیال کر دیا ملال کا نتیجہ ایک عرصہ تک خاں صاحب کے یہاں پھر نہ گئے۔ اتفاق سے جنرل عظیم الدین خاں مرحوم مدار المہام رام پور بتقریب میلہ نمایش اٹاوہ آئے نواب صاحب کے مہمان ہوئے اگلے دن حاجی ممتاز علی خاں صاحب کی مزاج پرسی اور سلام کا تہیہ کر کے ان کے یہاں چلنے کو تیار ہوئے۔ نواب صاحب سے کہا کہ تم بھی چلو انھوں نے انکار کیا۔ وجہ انکار پر جب اصرار ہوا تو نفس معاملہ کی حقیقت کھولی بالآخر جرنیل صاحب نے کہا اگر تم نہ چلوگے اور خاں صاحب سے معافی نہ مانگوگے تو میں تمھارے گھر سے اُٹھ جاؤں گا۔ غرض دونوں سوار ہوئے۔ خاں صاحب کے مکان پر پہونچے اور جرنیل صاحب نے دست بستہ نواب صاحب کے ترک آمد و شد کے قصور کی معافی چاہی۔ ان کا معافی چاہنا تھا کہ خاں صاحب نے آنسوؤں کی جھڑی میں نواب صاحب کو چھاتی سے لگایا۔ کلمات شفقت ادا کئے۔ پھر کیا تھا یہ بھی پھوٹ کر رونے لگے۔ سکوت کا عالم مجلس پر طاری ہو گیا۔ تھوڑی دیر میں جب یہ کیفیت فرو ہوئی تب جا کر کہیں دوسری باتوں کی نوبت آئی

دیکھو! یونیورسٹیوں کی کثرت، اساتذہ کی فراوانی، جمعیت طلبہ کی فوجی قوت اور مظاہروں کے سامان تو قدم قدم پر ملتے ہیں لیکن اُستادی اور شاگردی کے مخلصانہ تعلقات کی باپ کے یاروں کے احترام کی کہیں یہ مثالیں بھی اب نظر آتی ہیں اب اُستاد تو اُستاد ایک باپ کو بھی جس نے اپنے خون پسینے کی کمائی سے اپنی کھیتی کو پروان چڑھایا ہو اور خوش قسمتی سے اولاد تعلیم و تربیت سے بھی آراستہ بھی جاتی ہے کیا اس کو بھی اولاد کی طرف سے ادب و احترام کے بارہ میں اس قسم کی توقعات ہو سکتی ہیں۔

سر سید مرحوم کے زمانہ سے لے کر ان کے جانشینوں میں نواب صاحب چوتھی پشت میں ستھے۔ علی گڑھ میں اُنھوں نے اپنے زمانہ کی دو بڑی مہتم بالشان یادگاریں چھوڑی ہیں۔ ایک مدرستہ العلوم کی مسجد کی تکمیل اس کا اعلیٰ درجہ کا پینٹنگ اور دیدہ زیب گل کاری آیاتِ پاک اسماء باری تعالیٰ درود و سلام کی کتابت اور ان کے طغرے۔

مشہور ہے کہ کسی فرنگی عورت نے تاج محل آگرہ کو دیکھ کر کہا تھا کہ اگر آج میرا مقبرہ کوئی ایسا بنا دے تو میں اس وقت مرنے کے لئے تیار ہوں اسی طرح علی گڑھ میں بعض لوگوں کو کہتے ہوئے سنا گیا کہ بھائی آج مسجد میں گئے تھے۔ نماز کی تو عادت نہیں وہاں جا کر بے اختیار جی چاہا کہ یہاں تو نماز پڑھ لو چنانچہ وضو کیا اور نماز پڑھ لی

اگر نواب صاحب کی خاص توجہ اور مذاق تعمیر اس طرف مائل نہ ہوتا تو آج یہ مسجد عروس مساجد نہ سمجھی جاتی اور بے نمازیوں کا نماز پڑھنے کو جی نہ چاہتا۔

دوسرے حضرت امیر خسرو کی مثنویات اور دیگر تصانیف کی صحت کے ساتھ طباعت ان پر نقد و تبصرہ کا اہتمام کلام خسرو کی صحت اور صفائی کے لئے کتب قدیمہ کی تلاش۔ کتب خانوں کی چھان بین۔ ادیب کامل اور فاضل زمانہ لوگوں کا مقدمہ نگاری کے لئے انتخاب اور سب سے بڑھ کر ان کو اس جاں کاہی کے لئے آمادہ کرنا اور پھر اس مقصد کے لئے زر کثیر کی فراہمی۔ غرض اس مہم کو ان کی توجہ ان کے اتر ان کی کوشش نے سر کئے بغیر نہ چھوڑا اور کئی برس کی مسلسل کوشش میں تصانیف خسرو کا ایسا صحیح مجموعہ تحقیق اور تفتیش، صحت صفائی اور طباعت کی خوبیوں کے لحاظ سے قوم کے ہاتھ میں دے گئے جس کی وجہ سے علمی دنیا ان کے اس کارنامے کو ہمیشہ عزت کے ساتھ دیکھے گی۔ لہ

لہ۔ خاکسار جامع اوراق کی درخواست پر نواب محمد اسمٰعیل خاں صاحب ایم ایل سی رئیس میرٹھ نے خدمت اکبر نواب صاحب مرحوم نے حالات تحریر کر کے بھیجے۔ بعض واقعات اور حالات کے مشاہدہ کا خود مجھ کو موقع ملا اور بعض حالات معتبر لوگوں کی زبانی معلوم ہوئے۔

خطبۂ صدارت

اے حضرات اہل وطن و دیگر صاحبان! پروگرام کے ملاحظہ سے آپ کو واضح ہوا ہوگا کہ اول اس نشستم جلسۂ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے لئے آنریبل سید امیر حسین خان بہادر سی آئی ای کا پریسیڈنٹ مقرر ہونا تجویز ہوا تھا۔ لیکن نہایت افسوس ہے کہ وہ بسبب ناسازی مزاج تشریف نہ لا سکے۔ اب آپ صاحبوں نے مہربانی فرما کر مجھے اس خدمت جلیلہ کے واسطے تجویز فرمایا ہے۔ میں بلاشبہ آپ صاحبوں کی اس عنایت کا بے انتہا شکر گزار ہوں کہ آپ نے مجھ سے بے سرمایہ شخص کو اس عظیم الشان جلسہ کے صدر انجمن ہونے کی عزت بخشی ہے۔ یہ شکریہ بے شک واقعی اور دلی ہے کس واسطے کہ بہت سے اصحاب اس جلسہ میں ایسے موجود ہیں جو مجھ سے کہیں زیادہ قابلیت اور فوقیت اور برتری رکھتے ہیں۔ ایسی حالت میں جو آپ صاحبوں نے مجھے پریسیڈنٹ ہونے کے لئے منتخب فرمایا ہے۔ اس کو میں اپنا کمال فخر و عزت تصور کرتا ہوں ہر چند یہ ایک ایسی خدمت ہے کہ جس کے انصرام کو میں اپنی لیاقت اور قابلیت سے بہت دور سمجھتا ہوں لیکن آپ صاحبوں کی مہربانی اور عنایت سے مجھے پوری امید ہے کہ آپ اندلخیش کو جو کہ خاصہ اکابر قوم کا ہوتا ہے میرے

حق میں کام فرماویں گے۔ اور میں اس امر کی کوشش کروں گا کہ جہاں تک مجھ سے ممکن ہے اپنی خدمت کو ادا کروں ؎

ما را کجاست ارزش رحم التفات تو
شد عام آں چناں کہ تمنا بما رسید

آپ سب صاحب واقف ہیں کہ سال گزشتہ میں جو پانچواں جلسہ کانفرنس کا الہ آباد میں منعقد ہوا وہ کس خوش اسلوبی اور خوبی شان و شوکت سے انجام پذیر ہوا۔ کیا اس سے زیادہ اور کوئی بات خوشی کی ہوسکتی ہے کہ جس کام کا آغاز نہایت جانفشانی اور دل سوزی سے کیا جاوے وہ آخر کار حسب مراد و کامیابی ختم ہو جاوے اور یہ بہت بڑی خوشی کا مقام ہے کہ تعداد ممبران جو اس جلسہ میں شرکت کی غرض سے دور دراز مقامات سے سفر کر کے جمع ہوئے تھے بہت کثیر تھی۔ مجھے پچھلے سال کی رپورٹ دیکھنے سے تمام و کمال کارروائیاں اس جلسہ کی معلوم ہوئیں اور جو فاضلانہ اور فصیح اسپیچیں کی گئی تھیں ان کے دیکھنے سے بدیں وجہ کہ وہ کیسی موثر اور مفید ہیں مجھے اس قدر مسرت اور انبساط ہوئی ہے کہ میں اس کا اندازہ نہیں کر سکتا مگر یہ خوشی مجھے صرف اسی سے نہیں ہوئی کہ اس جلسہ میں کثیر التعداد ممبر جمع ہوئے تھے اور ان کی وجہ سے جلسہ پرشکوہ ہو گیا تھا بلکہ خوشی ہونے کی واقعی یہ بات ہے کہ ہمارے قوم کے حضرات نامور کو بہبودی قوم کے خیالات پیدا ہوئے جس سے ہماری آئندہ امیدوں اور خواہشوں کے بر آنے کی کامل توقع ہوتی ہے لیکن اس سے بھی زیادہ خوشی کی یہ بات ہوگی کہ گو کسی جلسہ میں ممبروں کی تعداد کم ہو لیکن خود بخود ہمارے اہل وطن اور اہل قوم کے دلوں میں ایسے جلسوں میں شریک ہونے کا اور اپنی بہبودی اور اصلاح کا خود شوق پیدا ہو اور وہ قومی کام کو اپنے ضروری سے ضروری کاموں پر مقدم تر اور بالاتر خیال کریں۔ تاہم مجھے سالہائے ماضیہ کے جلسوں کے حالات دریافت ہونے سے قوی امید ہوتی ہے کہ اب اس پودہ کی جڑ مستحکم ہو گئی ہے اور بلاشبہ اب قریب تر وہ وقت آنے والا ہے کہ یہ پودہ بار آور ہونے لگے گا اور ہم اس سے بہرہ ور ہوں گے۔ اس بات کا بھی تذکرہ نامناسب نہ ہوگا کہ امسال جو طرز مہمان داری اور دعوت بدلا گیا ہے اور جملہ اخراجات خورد و نوش خود ممبروں اور وزیٹروں نے اپنے ذمہ لئے ہیں یہ بلاشبہ ایک نہایت عمدہ تحریک و تجویز ہے اور اس سیدھے سادے طریقہ کی کارروائی کو میں اپنی رائے میں پہلی اینٹ خیال کرتا ہوں جو کانفرنس کی بنیاد میں اس کے استحکام کے لئے رکھی گئی ہے۔ اس طریقہ پر جس قدر کام کی ترقی ہوگی وہ اصلی ترقی ہوگی۔ ایک انگریزی شاعر نے بہت عمدہ طور سے اپنے خیالات ایسے ہی امر کی نسبت انگریزی الفاظ میں ظاہر کئے ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ شخص کس طرح توقع کر سکتا ہے

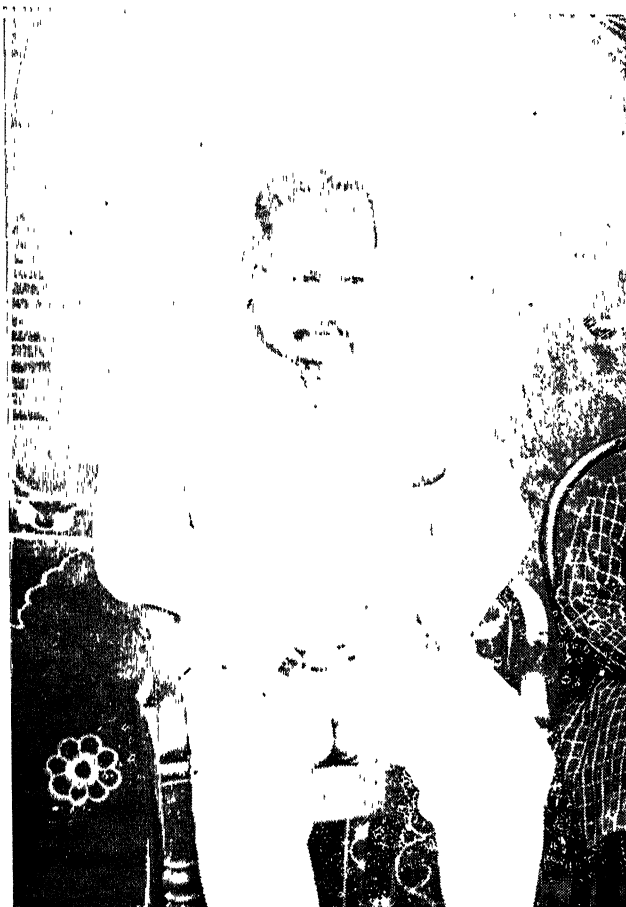
کہ اُس کے لئے اور لوگ مکان رہنے کے واسطے تیار کریں زمین اُس کی خور و نوش کے لئے کاشت کریں اور جب وہ اس کی خواہش ظاہر کرے تو اُس کے ساتھ محبت کریں جب کہ وہ خود اپنی خبرگیری نہیں کر سکتا جس قاعدہ کا میں نے ذکر کیا ہے اس کا پہلا نتیجہ یہ ہے کہ میں اخبار وں میں دیکھتا ہوں کہ اہل دہلی کی یہ خواہش ہے کہ آئندہ سال دہلی میں جو ایک زمانہ میں مخزن علما و فضلا تھا کانفرنس کا اجلاس ہو۔

الہ آباد کے اجلاس کانفرنس کو بلاشبہ بڑی مبارکبادی ہے کہ اس میں نہایت خوبی اور عمدگی سے اس بات پر کامیاب بحث ہوئی کہ فارسی زبان یونیورسٹی کی تعلیم سے خارج نہ ہوا اور نہ فارسی عربی کو مخلوط کر کے دونوں کی تعلیم کو خراب کیا جاوے۔ اس طریقہ تعلیم کے جاری ہونے سے جو نقصان ہماری قوم کو پہنچتا اور جو دیگر خرابیاں واقع ہوتیں اُن کا مفصل بیان اُن اسپیکروں نے جو کہ اس بحث میں شریک تھے کیا تھا اور مجھے اس بارہ میں آپ صاحبوں کی زیادہ سمع خراشی کرنے کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی البتہ یہ کہوں گا کہ اس بحث کا بہت عمدہ اثر ہوا ہے اور اگر کانفرنس نہ ہوتی اور اُس وقت یہ طریقہ تعلیم جاری کر دیا جاتا تو مسلمانوں کا صریح نقصان تھا جس کے رفع کرنے کے واسطے شاید بہت زیادہ زمانہ درکار ہے ٹکنیکل ایجوکیشن کی نسبت جو بحث ہوئی وہ نہایت مفید تھی ان بحثوں سے جو کامیاب نتیجے حاصل ہوئے وہ قوم کے لئے نہایت مبارک ہیں اور مجھے امید ہے کہ ان کا مفصل بیان ہمارے آنریبل سکرٹری صاحب کی رپورٹ میں ہوگا۔

مجھے آپ کو اس امر کے اطلاع دینے سے بھی بہت خوشی ہے کہ امسال بھی نہایت عمدہ اور مفید لکچر ہوئے اور تحریرات پیش ہونے کی امید ہے۔ سب سے زیادہ قابل غور اور قابل بحث وہ رزولیوشن ہے جو مسٹر بک نے انگلستان میں طالب علموں کو تعلیم کے لئے بھیجنے کی نسبت پیش کیا ہے اور مجھے امید ہے کہ تمام ممبر اُس پر بخوبی غور کریں گے اور بخوبی اس پر مباحثہ ہوگا کیوں کہ اس امر کا بخوبی مباحثہ ہو کر طے ہونا قوم کے لئے نہایت مفید ہوگا۔

اب مجھے چند الفاظ کارروائی کانفرنس کی بابتہ اور کہنے ہیں پروگرام جو اجلاس کی کارروائی کا ہے اُس میں دیکھتا ہوں کہ قواعد کارروائی اجلاس اور قواعد کانفرنس پیش ہونے کو ہیں سکرٹری صاحب نے بیان کیا ہے کہ وہ قواعد واسطے غور کے سب ممبروں کو تقسیم ہو چکے ہیں۔ مجھے اس کی نسبت کچھ کہنا ہے مگر جب سکرٹری صاحب اُن کو پیش کریں گے تو میں اپنا خیال آپ کے سامنے پیش کروں گا۔ اس وقت میں اُس کی نسبت کچھ کہنا نہیں چاہتا۔

اور اب مجھے اس بات کا اعلان کرنے سے بہت خوشی ہے کہ اجلاس ششم کانفرنس کھولا گیا اور سکرٹری صاحب سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ اُس کی کارروائی شروع کریں۔



مولوی محمد حسب اللہ اسکوائر
صدر اجلاس ہفتم کانفرنس (دہلی سنہ ۱۸۹۲)

اجلاس ہفتم

(منعقدہ دہلی ۱۸۹۲ء)

صدر مولوی حشمت اللہ صاحب ایم اے، آئی سی ایس

حالات صدر

مولوی حشمت اللہ کے دادا مولوی کفایت اللہ متوطن حیدر آباد دکن اپنے زمانہ کے بڑے خوشنویس فارسی و عربی کے علوم سے بہرہ ور تھے اور جن کا پیشہ معلمی تھا۔ انھوں نے ترک وطن کرکے روہیلکھنڈ (بانس بریلی) میں سکونت اختیار کرلی تھی۔ ان کے بڑے بیٹے منشی عظمت اللہ نے قابلیت علمی کے ساتھ ناموری اور شہرت حاصل کی۔ انگریزی زبان کے ذریعہ سے علوم جدیدہ کے حاصل کرنے میں انھوں نے اس وقت پیش قدمی کی جب کہ عام طور پر مسلمان انگریزی زبان اور انگریزی اسکولوں سے ناآشنائے محض تھے جنھوں نے بی اے کے درجہ تک تعلیم پائی تعلیم کے بعد بریلی کالج میں پروفیسر اور بعد کو انسپکٹر تعلیم مقرر ہوئے۔ غدر ۱۸۵۷ء کے بعد جب تعزیرات ہند کا ترجمہ کرنا من جانب گورنمنٹ قرار پایا تو اس غرض کے لئے اس زمانہ کے قابل اصحاب میں سے اس کام کے لئے علامۂ مولوی نذیر احمد دہلوی اپنی عربی دانی اور منشی عظمت اللہ علوم انگریزی کی واقفیت کی وجہ سے منتخب ہوئے تھے تعزیرات ہند کا ترجمہ فن ترجمہ کے لحاظ سے جس پایہ کا ترجمہ ہے وہ اپنی جامع صفات کے لحاظ سے آج تک بے نظیر ہے۔ گورنمنٹ نے قابل مترجموں کی پوری پوری قدردانی کرکے اس زمانہ کے لحاظ سے حکومت کا بڑا عہدہ یعنی ڈپٹی کلکٹریاں دونوں کو عطا کی تھیں۔

انھیں منشی عظمت اللہ کے بیٹے مولوی حشمت اللہ تھے جو ۱۸۵۷ء میں پیدا ہوئے۔

حسب دستور شرفا، مولوی حشمت اللہ کی ابتدائی تعلیم گھر سے شروع ہوئی گھر پر مکتب قائم ہوا جس میں وہ ان کے بھائی کنبے محلے کے دوسرے لڑکے پڑھا کرتے تھے اپنے خداداد ذہن اور شوق کی وجہ سے پندرہ برس کی عمر میں فارسی اور عربی کے وہ فارغ التحصیل طلبہ میں شمار ہونے لگے۔ بمقابلہ عربی کے فارسی سے انھیں فطری مناسبت تھی اس وقت تک انھوں نے انگریزی کا ایک لفظ بھی نہ پڑھا تھا۔ بلکہ ان کو اس زبان کے سیکھنے سے ایک طرح کا تنفر اور اس کی طرف سے بارہا بدذوقی کا اظہار کر چکے تھے حالاں کہ ان کے پیدا ہونے سے بہت پہلے انگریزی ان کے گھر میں داخل ہو چکی تھی اور ان کے باپ بی اے تک تعلیم پا کر خود کالج کے پروفیسر بن چکے تھے۔

ان کا انگریزی زبان سے شوق کرنا اور اس کے حاصل کرنے کا واقعہ بھی لطیفۂ غیبی سے کم نہیں۔ واقعہ یہ تھا بریلی میں کرکٹ میچ ہوا اور باہر سے ٹیم کھیلنے آئی۔ شہر کے بہت سے تماشائی بھی فیلڈ کے ارد گرد جمع تھے۔ ان میں مولوی حشمت اللہ بھی موجود تھے۔ ایک تماشائی کے پاس گیند آئی اور اس نے چھپا لی ٹیم کے ایک انگریز ممبر نے دیکھ لیا اور گیند لے کر اس کے ٹھوکریں مارنا شروع کیں۔ مولوی حشمت اللہ ایک ہندوستانی کو اس بے دردی کے ساتھ پٹتا ہوا دیکھ کر بہت متاثر ہوئے اور دوڑ کر اس انگریز سے لپٹ گئے لوگوں نے جب یہ ہنگامہ دیکھا تو درمیان میں پڑ کر بیچ بچاؤ کر دیا اور معاملہ رفع دفع ہو گیا اور وہ فوراً میچ سے اپنے گھر واپس آ گئے۔ اس واقعہ نے جو کیفیت ان کے قلب پر پیدا کی وہ اس امر کا احساس تھا کہ غیر اقوام کے مقابلہ میں جب تک علمی اور جسمانی قوتوں کا نشو و نما نہ کیا جاوے گا کمزور قومیں طاقتور قوتوں کے مقابلہ میں ہمیشہ دبی رہیں گی اور پٹتی رہیں گی۔ لہٰذا ایک طرف تو حکومت کی زبان کو ذریعہ ترقی سمجھ کر انھوں نے انگریزی پڑھنے کی طرف توجہ کی دوسری طرف جسمانی ترقی دینے کی غرض سے انھوں نے اکھاڑے میں کشتی لڑنا اور قدیم طرز کی ورزش کرنا اختیار کیا اور اپنے دوسرے ساتھی لڑکوں کو بھی ترغیب دی۔

مولوی حشمت اللہ بلا کے ذہین تھے انھوں نے فارسی عربی، انگریزی میں جو کچھ پڑھا اور سیکھا اپنے ذوق طبیعت کی وجہ سے انھوں نے استادوں سے بہت تھوڑی مدد لی باقی تمام تحصیل علم ان کی دماغی محنت اور ذہانت کا نتیجہ تھیں یا تو انگریزی سے نفرت کی تھی جب شوق ہوا تو صبح سے شام اور شام سے صبح کر دی نتیجہ یہ ہوا کہ چھ مہینے کے اندر پرائیویٹ طریقہ سے مڈل کا امتحان دیا اور وظیفہ لے کر کامیاب ہوئے۔ اس کے بعد انٹرنس کے امتحان کی تیاری میں مصروف ہوئے۔ اس وقت ان کے والد بستی میں ڈپٹی کلکٹر تھے۔ انٹرنس کا امتحان دینے بستی سے گورکھ پور گئے اور کس شان سے گئے۔ ریل ڈیل تو تھی نہیں۔ اونٹ گاڑیاں آتی جاتی تھیں۔ شام کو سوار ہونے سے پہلے ایک چلم اور چند

موسم قیصار خرید اونٹ گاڑی کے ایک کونے میں جا بیٹھے ۔ چلم میں بتی لگا روشن کرکے پرچہ پڑھنے میں مصروف ہو گئے تمام رات اونٹ گاڑی اپنی منزل اور یہ منزل علم کے طے کرنے میں مصروف رہے جس صبح گورکھپور پہنچے امتحان کے کمرہ میں بیٹھے اور کل طالب علموں میں اول آئے ۔ اب ایف اے کی باری آئی ۔ الہ آباد پہنچے اور میور سنٹرل کالج میں داخل ہوئے ۔ نواب صاحب رامپور نے کالج کے ایسے طالب علم کو جو ایک مضمون عربی میں لے یونیورسٹی کو بجائے [illegible] روپیہ ماہوار کا وظیفہ دیا تھا چونکہ کالج بھر میں کوئی طالب علم عربی داں نہ تھا اور ان کی عربی قریب تکمیل ہو چکی تھی وظیفہ مذکور انہیں نے حاصل کیا ۔ چار سال الہ آباد میں رہ کر ایف اے اور بی اے کی سندیں لے ایم اے کی تیاری میں مصروف ہوئے ۔ ایم اے کا امتحان دینے کلکتہ گئے ۔ عربی کا پرچہ آخر دن کے لئے رکھا گیا تھا جتنے ساتھی تھے ان کا امتحان ختم ہو چکا تھا صرف عربی والوں کا رہ گیا تھا ان کے ساتھ کلکتہ کا چڑیا گھر دیکھنے چلے گئے ۔

جب واپس ہوئے تو قریب ایک گھنٹہ کے لیٹ ہو گئے دیکھا تو کمرہ میں داخلہ بند ہے بہت پریشان ہوئے بمشکل تمام اجازت دی گئی بیٹھے قلم ہات میں لیا پرچہ دیکھا لکھنا شروع کیا اور وقت مقررہ سے تین گھنٹہ قبل فارغ ہو کر باہر آ گئے ۔ مآل کار کلکتہ یونیورسٹی سے عربی میں اول آئے مزید برآں ایک سونے کا تمغہ اس کامیابی پر انعام میں پایا ۔

ایف اے میں یا بی اے میں فلسفہ اور فارسی اور ایم اے میں عربی اور انگریزی ان کے خاص مضامین تھے جس سے واضح ہوتا ہے کہ دماغ ہر علم کے لئے موزوں تھا ۔

ایم اے کے بعد بھی امتحان دینے سے سیری نہ ہوئی تھی کہ وکالت کا خیال آیا اور قانون پڑھنے میں مصروف ہو گئے ۔ چنانچہ الہ آباد سے ہی وکالت کا امتحان دیا اور کامیاب ہوئے الہ آباد میں وکالت شروع کی کچھ دن ہی گذرے تھے کہ ایک مشہور ممبر پارلیمنٹ الہ آباد آئے ۔ ان کا لکچر خاص اہتمام کے ساتھ یونیورسٹی میں ہوا ۔ میر اکبر حسین صاحب اکبر الہ آبادی لکچر کے ترجمہ پر مامور ہوئے کیونکہ اس زمانہ میں انگریزی کے سمجھنے والوں کی بہت تھوڑی تعداد تھی ۔ اتفاق کی بات میر اکبر حسین بوجہ علالت شریک لکچر نہ ہو سکے اور اس وقت معلوم ہوا کہ جب لکچر ختم ہوا اور پروگرام کے موافق ان کے ترجمہ کی باری تھی ۔ یہ سوچ بچار ہو ہی رہا تھا کہ اب کیا کیا جائے ۔ اتنے میں مولوی حشمت اللہ کھڑے ہوئے اور کہا میں تقریر کروں گا ۔ اجازت ملنے پر اس خوبی کے ساتھ تقریر کی اور انگریز مقرر کی تقریر کا مفہوم اس خوبی کے ساتھ اردو زبان میں حاضرین کے ذہن نشین کیا کہ اس دن سے ان کی لیاقت اور طلاقت کی الہ آباد میں دھاک بیٹھ گئی اور اس زور شور سے وکالت کو فروغ ہونا شروع ہوا کہ روپیہ کا مینھ برسنے لگا ۔ تقریباً دو سال وکالت کو گذرے تھے کہ پرنسپل میور سنٹرل کالج سے لائق لڑکوں کی آئی سی ایس کے لئے مانگ آئی ۔ پرنسپل نے مولوی حشمت اللہ کا نام تجویز کیا ۔ اور یہ آئی سی ایس کے انتخاب میں آ گئے ۔

باپ اور چچا کی مرضی اور خواہش سے وکالت ترک کی حالانکہ ترک وکالت سے مالی نقصان تھا ۔ ۱۸۸۶ء میں سروس میں داخل ہو کر میرٹھ میں تعینات ہوئے ۔ ابتدائے زمانہ ملازمت میں محکمہ کا امتحان دینے آگرہ گئے ۔ ممتحن کمشنر آگرہ تھے ۔ دوپہر کے کھانے کے

وقت کمشنر نے جس قدر انگریز تھے ان کو اپنے ساتھ کھانا کھلایا۔ کمشنر کے پرچے میں کچھ غلطیاں تھیں جن کو مولوی حشمت اللہ نے اپنے جواب میں نظائر قانون عقلی و منطقی طریقہ سے غلط ثابت کیا اور ان کی تصحیح کی دوسرے دن جب کھانے کا وقت آیا تو کمشنر نے ان کو بھی بلایا لیکن انھوں نے انکار کر دیا۔ وجہ دریافت کرنے پر کہا کہ اول تو کل آپ نے مجھے نہیں بلایا دوسرے آج بھی منجملہ کئی ہندوستانیوں کے صرف مجھ کو آپ نے بلایا ہے۔ اور میں اس امر کو پسند نہیں کرتا کھانے پر نہ جا سکے نہ گئے۔ اسی دوران میں کمشنر نے کہا کہ تم نے اپنے جواب میں میرے پرچہ پر اعتراض کئے ہیں۔ تم کو معلوم ہے کہ فیل اور پاس کرنا میرے اختیار میں ہے۔ انھوں نے کہا کہ میرے اعتراضات صحیح ہیں اور میرے جوابات اگر صحیح ہیں تو آپ مجھ کو ناکامیاب نہیں کر سکتے۔ اس واقعہ کے بعد وہ اس امتحان میں درجہ اوّل میں کامیاب ہوئے۔ عہدوں کے اعتبار سے جنٹ مجسٹریٹ، کلکٹر، سشن جج رہے اور ۱۹۱۷ء میں پنشن لے کر سرکاری ملازمت سے سبکدوش ہو گئے۔

وہ نہایت رحم دل، منکسر المزاج، با اخلاق، فیاض تھے۔ سروس کے زمانہ میں کسی ماتحت کو ان کے ہاتھ سے نقصان نہیں پہونچا وہ ناقابل اہل کاروں کے ساتھ بھی ہمیشہ رعایت ملحوظ رکھتے تھے بعض اوقات عمال کی ناقابلیتی کی وجہ سے خود ان کو تکلیف ہوتی تھی مگر وہ ان کے ساتھ نباہ کر لیتے تھے۔

اکثر انگریزوں سے ان سے ان بن رہی۔ زمانہ ججی میں انگریز کلکٹروں کی اپیلیں ان کے سامنے پیش ہوتی تھیں اور وہ ان کی تجویزوں اور فیصلوں کو مسترد کر کے ان کی قانونی غلطیاں ثابت کرتے تھے ان حالات کی وجہ سے ان کی ترقیوں میں رکاوٹ پیدا ہوئی اور ان کو نقصانات بھی اُٹھانے پڑے۔ لیکن وہ اپنے اصول کے سامنے ان باتوں کی مطلق پروا نہیں کرتے تھے۔

اکثر اوقات دوسروں کی بلا اپنے سر منڈھ لینے میں بھی انھیں عذر نہ ہوتا تھا۔ میرٹھ میں جنٹ مجسٹریٹ تھے ابتدائی ملازمت کا دور تھا۔ بنگالیوں نے سیاسی جلسہ کی غرض سے ٹاؤن ہال مانگا۔ مسٹر رائٹ صاحب کلکٹر مجسٹریٹ نے اجازت دے دی۔ جلسہ کی کارروائی چونکہ اغراض گورنمنٹ کے خلاف تھی گورنمنٹ نے کلکٹر سے باز پرس کی کہ ٹاؤن ہال باغیانہ تحریک کے لئے کس نے دیا۔ اب کلکٹر پریشان تھے اور گھبرا کر مولوی حشمت اللہ سے پوچھا ہے کہ کیا لکھوں وہ جواب میں کہتے ہیں کہ میرا نام لکھ دو۔ انجام کار ان کی ترقی کے کئی درجے توڑ دیئے جاتے ہیں۔

جس زمانہ میں ساڑھے تین سو تنخواہ تھی تنہا سائل یا کسی حاجت مند کی ضرورت پر غور کر کے پوری کی پوری تنخواہ اُسے دیدیتے تھے اور ایک ایک مہینہ کامل فقط دال روٹی کھا کر نہایت خوشی سے گزار دیا کرتے تھے۔

جاڑے کے موسم میں ایسا بھی اتفاق ہوا کہ ایک غریب گداگر کو اپنے اوڑھنے کا لحاف دیدیا۔ اور پیال بچھوا کر اوپر سے قالین اوڑھ کر سو رہے اور رات کاٹ دی۔

جب ترکی اور یونان میں جنگ ہو رہی تھی شہر شہر اور گھر گھر چندہ ہو رہا تھا ان کے پاس روپیہ

دینے کو تیار تھا کوٹھی کا تمام سامان دے دیا۔ حتیٰ کہ پلنگ تک بچھانے کو نہ رہا۔ دوستوں کو خبر ہوئی تو انھوں نے پلنگ بھیجے۔

ہوش سنبھالا تو دس برس کی عمر سے پابند صوم وصلوٰۃ تھے۔ جب میور کالج الہ آباد میں داخل ہوئے نماز پڑھنی چھوڑ دی۔ چالیس برس کی عمر میں پھر ادھر توجہ ہوئی۔ مولوی حاجی احمد رضا خاں صاحب مرحوم بریلوی سے دست بیعت ہوئے۔ اور پھر نماز روزہ کے پابند ہو گئے۔

جذبات سے بھرا ہوا دل پایا تھا۔ قدرتی مناظر سے فوراً متاثر ہو جاتے تھے۔ جہاں اچھا سبزہ دیکھا وجد کی سی حالت طاری ہو گئی جہاں بہتا دریا دیکھا طبیعت قابو سے باہر ہو گئی۔ اچھا گانا سُنا کیف اور سرور چھا گیا۔ عرب جاہلیت کی نظموں سے خاص ذوق لیتے تھے۔ ان کا کلام ان کی روح کی بہترین غذا تھی۔

میور کالج الہ آباد میں پڑھتے ہیں۔ وظیفۂ قابلیت پچاس روپیہ ماہوار ملتا ہے۔ چوں کہ گھر سے فارغ البال تھے، وظیفہ کا روپیہ غریب عزیزوں میں تقسیم کر دیا کرتے تھے۔ دستر خوان پر جب دوسرے لوگ بھی شریک طعام ہوتے اپنا کھانا دوسروں کو کھلاتے۔ خود دال وغیرہ سے پیٹ بھر لیتے۔ شروع زمانہ ملازمت میں پندرہ بیس غریب عزیز، غریب طالب علم وغیرہ ساتھ رہتے۔ سب کا روٹی کپڑا ان کے ذمہ ہوتا تھا۔ طالب علموں کو خود بھی پڑھاتے تھے۔

جب ۱۸۹۱ء میں سرسیّد نے حیدر آباد کا مشہور سفر مولانا حالی مولانا شبلی وغیرہ کی معیت میں کیا تھا زمن جملہ چند رفقاء سفر کے ایک مولوی حشمت اللہ بھی تھے۔ امیر کبیر نواب سر آسمان جاہ بہادر وزیر اعظم کے یہاں سرسیّد اور اُن کے رفقاء کی دعوت تھی۔ ڈنر پر مولوی حشمت اللہ نے بھی دلچسپ تقریر کے ساتھ اس وقت ایک قطعہ نظم کر کے سنایا تھا کہتے ہیں ؎

کس کو معلوم ہے اسلام پہ کل کیا گزرے ۔۔۔ شب کے بیمار کو مہلت بھی ملے یا نہ ملے
حالتِ زار کو احباب سے کہہ دو حشمت ۔۔۔ پھر خدا جانے یہ صحبت بھی ملے یا نہ ملے

مولوی صاحب مرحوم کو جب وہ اٹاوہ میں جج تھے ہم نے بھی دیکھا تھا اور دو مرتبہ ملاقات کی عزت حاصل کی تھی۔ وہ ہر شخص سے جو اُن سے ملنے جاتا تھا اخلاق اور تواضع کے ساتھ پیش آتے تھے۔ باوصف اس کے کہ وہ ہندوستانی تعلیم یافتوں کی جماعت میں اور اس زمانہ کے مسلمان سرکاری عہدہ داروں کی صف اول میں شمار ہوتے تھے۔ ان کا لباس ان کا مکان ان کی معاشرت تہذیب جدید کے گوناگوں لوازمات اور فیشن سے قطعی بے گانہ نظر آتی تھی۔ آخر عمر میں صوفیانہ رنگ غالب آ گیا تھا۔ سماع کے زیادہ دلدادہ ہو گئے تھے۔

۱۸۹۲ء میں سرسید کی نظر انتخاب صدارت کانفرنس کے لئے ان پر پڑی اور وہ دلی کی سب سے پہلی کانفرنس کے صدر منتخب ہوئے۔ اور حسب ذیل خطبہ پڑھا۔

۱۱ر نومبر ۱۹۱۹ء کو آگرہ میں وفات پائی اور متصل مزار شاہ ابوالعلا صاحب رحمۃ اللہ علیہ سپرد خاک ہوئے۔

خطبۂ صدارت

اے قوم کے معززین و محترمین! میں متردد ہوں کہ پہلے شکریہ اس اعزاز کا جو مجھ کو آپ صاحبوں کے کرم نے دیا ہے ادا کروں یا اپنی ناقابلیت پر اظہار ندامت کروں بہرحال یہ میرا آئندہ کے لئے فرض مقدس ہوگا کہ میں تمام عمر اپنی وقف کردوں اس بات کے ثابت کرنے کے لئے کہ شاید میری زندگی کا کوئی لمحہ ہو یا دے کہ میں اس اعزاز کا مستحق ہوں۔ اس کے بعد یہ عرض کرنا ہے کہ یہ جلسہ دہلی کا جلسہ اور افتتاح کانفرنس یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ ہر طرح سے یہ دیباچہ ہے اس استقبال اور آنے والے زمانہ کا جب کہ جس طرح سلطنت اور ملک کے لئے ہمارے بزرگوں نے اپنے عمل دکھائے تھے اسی طرح ہماری دنیوی ترقی اور فلاح کے لئے یہ کانفرنس محمود و مسعود ہوگی اسی کی ابتدا پر ہمارے خیالات کا تمام انقلاب اور ہماری کوششوں کا سارا دارومدار منحصر ہے۔ اب وہ انقلاب کہاں تک مبارک اور محمود ہوگا ہماری کوششوں پر منحصر ہے۔ بڑے خضوع و خشوع کے ساتھ یہ دوبارہ گزارش ہے کہ اس کانفرنس کو یعنی دہلی کی کانفرنس کو احباب اور بزرگانِ قوم معمولی کام نہ سمجھیں۔ یہ وہ جگہ ہے جس کو میں قوم کی عبادت گاہ سمجھتا ہوں۔ اس کے بہت سے اسباب ہیں۔ اول یہ کہ یہ وہی جگہ ہے جہاں ہمارے بڑوں اور بزرگوں نے فتح کے ہتھیار رکھ دیے تھے جہاں سے ایک زمانہ غفلت اور نکبت کا گزرا۔ خدا کا شکر ہے کہ قومی سربزی کے فتح کرنے والے پھر جمع ہوئے ہیں۔ ہم کو اب اپنے ان بزرگوں کی عزت ثابت کرنا ہے کہ جن کے بازوؤں کے زور سے انھوں نے تمام عالم کو مسخر کر لیا تھا۔ آج ہمارا پاک منصب یہ ہے کہ ہم اپنے کو ان کا قائم مقام ثابت کریں۔ اور آیا ہم اس قابل ہیں یا نہیں کہ میدان معاشرت میں اسی زور سے میدان لے لیں۔ اگر شرافت کے دعوے ہیں اور مردانہ حقوق ہیں اس بزرگ قوم کے قائم مقام ہو تو ثابت کرو کہ ہم کچھ کر سکتے ہیں۔ ورنہ خالی دعویٰ کہ ہم بادشاہ کی اولاد ہیں کچھ نہیں۔ بندگی باید پیمبر زادگی منظور نیست۔ آپ لوگوں نے اپنی غفلت و نخوت سے یہ دن دیکھ لیا ہے۔ میں امید کرتا ہوں کہ میرا خطاب خاص نہ سمجھا جاوے گا۔ پہلا شخص ان میں میں ہوں اور میرے بزرگ جنھوں نے قوم کو اس درجہ پر دیکھا، کب تک اس خواب غفلت میں رہوگے

سمجھ میں نہیں آتا۔ بزرگوں کے نام لے لے کر زندگی خوش کرنے کا وقت باقی نہیں رہا۔ ملک روپیہ
تجارت اور اگر غور کیجئے تو چپہ چپہ مسلمانوں کے پیروں کے نیچے سے نکلا جاتا ہے۔ یہ مقام غیرت کا ہے
علم اور فضل عقل اور دانش کے ساتھ زمینداری اور تعلقہ داری کے جتنے میدان تھے سب سے تمہارا نام مٹا
ہے۔ اعزاز دنیا میں سولہ آنہ میں ایک آنہ بھی نہیں رہا۔ شان وشوکت ایک عشر عشیر باقی نہیں رہی۔ الغرض
مسلمانوں نے اپنی غفلت کا کیا کچھ نتیجہ نہیں دیکھا۔ اور سچ یہ ہے کہ ابھی کچھ نہیں دیکھا۔ جب یہ نوبت پہونچی
آخر کو خدا نے ایک مقدس بندہ کے جی میں یہ بات ڈالی کہ قومی اجزاء پریشان کو مرکب ہونا چاہئے مگر بڑے
کاموں کے لئے بڑے دماغ کی ضرورت ہوتی ہے۔ بچہ جب پیدا ہوتا ہے اس کے بعد چھوٹی عمر میں پہلے
جب چاند کو دیکھتا ہے تو پوچھتا ہے کہ چاند کیا ہے۔ اُس کے والدین بتلا دیتے ہیں کہ چاند ہے۔ وہ نہیں سمجھ
کہ اُس میں حرکت کیوں ہے۔ روشنی کے کیا اسباب ہیں۔ اسی طرح وہ لوگ جو اپنے فرائض سمجھ نہیں سکتے ان
کے لئے دشوار ہے۔ یہ وہ جانتے ہیں کہ قوم کے لئے کچھ کرنے کی ضرورت ہے مگر وہ سمجھ نہیں سکتے
جس طرح وہ بچہ ہر چیز کو جو اُس نے نہیں دیکھی ہے پوچھتا ہے۔ اسی طرح وہ لوگ پوچھتے ہیں مگر اُس پیچیدہ کل کے
پُرزوں کو جو قوم کے لئے تیار کی جاوے سمجھنا اُن کے لئے دشوار ہے۔ آج کتنے برس ہوئے جب
سے کانفرنس قائم ہے مگر اب تک قوم ہنستی ہے کہ کانفرنس کی کیا ضرورت ہے اور اُس کا کیا فائدہ ہے۔ کوئی کہتا ہے
کہ سوائے اس کے کہ وقت خراب کیجئے اور سَو دو سَو آدمی شعر وسخن کے لئے جمع ہوں اور کچھ فائدہ نہیں
افسوس ہے ان کا جواب بھی یہی ہونا چاہئے کہ اتنے بڑے کاموں کے سمجھنے کے لئے وقت خاص کی ضرورت
ہے اور ہر شخص سمجھ بھی نہیں سکتا۔ اس بات کو سمجھنا چاہئے کہ افراد ہر چیز کی ہستی اور وجود میں ہوتی ہے
مگر جب اجزا کو مرکب کر دیجئے اس سے مجموعہ کلی پیدا ہوتا ہے اور وہ نتیجہ نکلتا ہے جو افراد میں نہیں ہوتا
دس اینٹوں میں کچھ نہیں ہے۔ جب ملا دیجئے دیوار ہے۔ اسی طرح قوم کی قوت بڑھانے کو یہ پہلا جلسہ ہے
اسی میں مل کر اور یہاں آکر جو مسرت ہو جاتی ہے یہ انھیں سے پوچھئے جو اس میں شریک ہیں۔ علاوہ اس
کے یہ سمجھنے کی بات ہے کہ ہر چیز کا نفع اپنے وقت پر ہوا کرتا ہے۔ اگر آپ چاہیں کہ لڑکا بارہ برس سے پہلے
بالغ ہو جاوے یہ محال ہے۔ اسی طرح سے یہ اعتراض ہے کہ کانفرنس عملی کام کیا کرتی ہے۔ اس کا جواب سنئے
اول ہم کو سب سے پہلے اس بات کی ضرورت ہے کہ ایک جلسہ قومی ہو۔ کل ملک میں کوئی جلسہ قومی نہ تھا۔
اس کا وجود ہی بجائے خود اپنی غایت کو ثابت کرتا ہے۔ کچھ ضرورت نہیں کہ دوسرا نفع مترتب ہو اُس کے
بعد مسئلہ یہ ہے کہ آیا کچھ عملی کام کانفرنس کرتا ہے یا نہیں۔ ہم پوچھتے ہیں کہ عملی کام کے لئے کیسی طاقت کی
ضرورت ہوتی ہے۔ قوم میں اس وقت جتنی دشواریاں پڑ رہی ہیں نہ دولت کی کمی سے ہیں نہ

علم سے نہ جسم سے بلکہ آدمیوں کی کمی سے ہیں ہم کام کرنے کو تیار ہیں خزانہ قدرت کھلا ہوا ہے۔ اپنے راستے بتلا رہا ہے۔ خدا کی رحمت کے دروازے بند نہیں۔ مگر بتلایئے کون کام کرنے والا ہے اس وقت ہم کو ضرورت ہے کہ اردو کتابیں قوم میں رائج ہوں کہاں سے آویں۔ ایک نام نامی ہمارے استاد مکرم شمس العلماء خان بہادر مولوی محمد ذکاء اللہ صاحب کا ہے اُس جادہ کو مولانا شبلی صاحب نے بھی شروع کیا ہے یہی دو ستارے ہیں جو ہمارے آسمان پر چمک رہے ہیں۔ ان کے سوا اور کوئی نہیں۔ اللہ بس باقی ہوس۔ صدہا برس سے ہم کو شکایت ہے کہ تمام عمر عربی فارسی پڑھنے کے بعد بھی چار لفظیں لکھنا یا عربی بولنا نہیں آتا۔ غرض یہ ہے کہ آئے کہاں سے۔ ایک شخص بھی ایسا ہے جو اس فخر کو حاصل کرے کہ عربی کی باقاعدہ درسی کتابیں مرتب ہوں۔ ہم تیار ہیں مگر کوئی مدد کرنے والا نہیں۔ پہلا فرض مبارک انسان کا یہ ہونا چاہیئے کہ جو وعدہ کرے اُس کے پورا کرنے کو فرض سمجھے۔ بدنصیبی سے ہماری زبان اور ہے اور دل اور ہے۔ کتنی غیرت کا مقام ہے۔ میں نے حضرات مختصر آپ کے سامنے گزارش کیا کہ کانفرنس فضول نہیں ہے کوئی شہر اور ملک ایک دن میں مکمل نہیں ہوتا۔ سب سے پہلے ہمارا کام اصلاح خیالات ہے یہی ہمارا بڑا دشمن ہے۔ جس طرح ہر چیز کی جداگانہ حالتیں ہوتی ہیں اور اُن کے رنگ جدا ہوتے ہیں۔ اُسی طرح جداگانہ تعلیم کا نتیجہ ہوتا ہے کہ بھائی اور بھائی قوم میں نکل نہیں سکتے جو مل کر کام کریں یہ نتیجہ ہے خودداری کا جو جداگانہ زندگی بسر کرنے سے پیدا ہوتی ہے۔ ہم نے دیکھا ہے گلی میں مسجد ہے بعض اس میں نماز نہیں پڑھتے۔ کیوں یہ قلا نے کی ہے۔ امام وقت نے پہلے سے نماز شروع کی تو نواب صاحب خفا ہو گئے کہ ہمارا انتظار کیوں نہ کیا۔ حضرات خدا جو کام کرتا ہے وہ اس تدبیر سے کرتا ہے جو اُس نے مقرر کی ہے۔ اب قوم کے کام بغیر اجزا درست کئے ہوئے کرنے محال ہیں جب تک وہ ناہمواریاں جو ایک جگہ ملنے سے ظاہر ہو کر قوم کو آگاہ نہ کر دیں۔ ایک لمحہ فائدہ نہ ہوگا خاطر جمع رکھئے کہ جب تک یہ ناہمواریاں قوم نہ کھوے گی اور قانون معاشرت میں کسی کی اطاعت اپنے ذمہ فرض نہ کرے گی۔ اُس وقت تک کوئی تدبیر قومی کارگر نہیں ہو سکتی۔ خدا خود اس کو پسند کرتا ہے۔ اُس نے اپنی ہی وحدت کو قایم رکھا۔ اگر یہی عالم مختلف قوتوں کے ہاتھ میں ہوتا تو عالم کا قایم رہنا مشکل تھا۔ خدا نے جب یہ طریقہ رکھا تو کیا ڈر ہے کہ انسان اس پر عمل کرے۔ عالم سیاست بھی اسی طریقہ کا تابع ہے چینی وحشی قوموں نے نشو و نما پائی ہمیشہ سرداری کی یہ دولت پائی۔ ترک جری اور بہادر ضرور تھے مگر چنگیز خاں کے منتظر تھے۔ عرب کے شجاع ضرور تھے مگر پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت کا انتظار تھا۔ جب تک یہ قابلیت نہ پیدا ہو جاوے کہ ایک جز دوسرے جز سے مل کر مجموعی قوت پیدا کرے ملکی ترقی ممکن نہیں۔ حضرات قوم اس کی امید ترک کیجئے اس دنیا میں کبھی نہیں ہو سکتا۔ افراط کے طور پر ہر شخص



نواب محسن الملک مولوی سید مہدی علی خان بہادر
صدر اجلاس ہشتم کانفرنس (علی گڈھ سنہ ۱۸۹۳ء)

کوشش کرے گا۔ اور اس میں جو جوش لیاقت ہو گا پھلے گا پھولے گا اور معدوم ہو جاوے گا۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ سب کا رخ ایک جانب ہو تو ایک قوت محرک کو اپنے تابع کیجئے ورنہ اس خیال کو ترک کیجئے۔ غلطی ایک مرتبہ کر کے ترک کر دینا بہتر ہوتا ہے۔ اب میں آپ لوگوں کا زیادہ وقت نہ لوں گا۔ خدا سے دعا کرتا ہوں کہ خدا ہمارے دلوں کو سچائی کی توفیق دے جس کے ذریعے سے جو ہمارے دلوں میں ہو وہی ہماری زبان پر ہو۔ جس کے ذریعہ سے دونوں میں تعلق پیدا ہو جاوے۔ خدا ہم کو اس قابل کر دے کہ ہم سب مل کر قومی خرابیاں رفع کر دیں۔ خداوند عالم ہمیشہ جس کام کی ہدایت دیتا ہے اس کے سامان بھی کر دیتا ہے شخصی کوشش ہمیشہ ایک کی زندگی پر محول رہتی ہے۔ مگر اب حسنِ اتفاق سے قوم نے جلسہ کی شکل میں اپنا وجود لیا ہے ہم کو امید ہے کہ ہمارے اس جلسہ کی صدیوں اور قرنوں عمر ہو۔ اور اس کے ذریعہ سے ہماری بگڑی ہوئی قوم بنے۔ میں اس کانفرنس کے افتتاح کی اجازت دیتا ہوں۔

اجلاس ہشتم

(منعقدہ علی گڑھ ۱۸۹۳ء)

صدر نواب محسن الدولہ محسن الملک مولوی سید مہدی علی خاں منیر نواز جنگ بہادر

حالات صدر

نواب صاحب ۹ دسمبر ۱۸۳۷ء کو اپنے وطن اٹاوہ میں پیدا ہوئے اور اس زمانہ کے دستور کے مطابق فارسی، عربی میں علوم رسمیہ کی تکمیل کی۔ چوں کہ فطرتاً ذہین اور طباع واقع ہوئے تھے اس لئے وہ بہت جلد علوم مشرقی کے فاضل بن گئے۔ پڑھنے لکھنے کے بعد وہ ملازمت کرنے پر مجبور ہوئے اور اٹاوہ کی کلکٹری میں دس روپیہ ماہوار کے محرر تلفت مقرر ہوئے۔ وہ اپنے عروج و کمال کے زمانہ میں اکثر موقعوں پر اپنے گزشتہ حالات کے ذکر میں اس ناقابل التفات ملازمت کا ذکر جوش و فخر کے ساتھ

کیا کرتے تھے اور کہتے تھے کہ ہم نے تو سب سے پہلے ردی چھانٹنے کی نوکری کی تھی۔ تمام تمام دن ردی کے ڈھیر
کا ڈھیر لگاتے گزر جاتا تھا۔ تب کہیں جا کر مہینے میں دس روپیہ ملتے تھے۔

چوں کہ وہ ممتاز نسل کے جوہر گراں مایہ تھے ان کی ذہانت مستعدی اور غیر معمولی فراست کو دیکھ کر اس
زمانہ کے مشہور کلکٹر مسٹر ایلس ہیوم نے جو بعد میں "آل انڈیا نیشنل کانگریس" کے بانی ہوئے، درجہ بدرجہ جلد جلد
ترقیاں دے کر ان کو اپنی پیشی کا سررشتہ دار بنا لیا جس کے کچھ عرصہ بعد ۱۸۶۱ء میں تحصیلداری کے عہدے پر
ترقی پائی جو ان وقتوں کے لحاظ سے ممتاز خدمت تھی۔ اس عہدے پر پہونچ کر ان کو اپنی غیر معمولی انتظامی اور
قانونی قابلیتوں کو ابھارنے اور نمایاں کرنے کا موقع ملا۔ انھوں نے اٹاوہ میں، تحصیل ہیوم گنج وغیرہ کی نہایت
عمدہ عمارتیں بنوائیں۔ شہر میں سیدھی اور چوڑی سڑکیں نکال کر کوچہ و بازار کو پر رونق بنانے میں پوری کوشش
کی۔ ان کے حاکم ان کی قابلیتوں کا اثر روز بروز قبول کرتے جاتے تھے ۱۸۶۶ء میں انھوں نے تحصیلداری
سے ڈپٹی کلکٹری پر ترقی پائی۔ چھ برس تک اس عہدے کے فرائض نیک نامی کے ساتھ انجام دے کر ۱۸۷۴ء
میں مستعفی ہو گئے اور حسب خواہش سر سالار جنگ اول سر سید احمد خاں مرحوم کی سفارش پر آٹھ سو روپیہ
ماہوار کی تنخواہ پر دولت آصفیہ سے وابستہ ہو کر حیدرآباد چلے گئے۔ مختلف مدارج عالیہ پر بیس برس تک
مملکت آصفیہ کی بیش بہا خدمات انجام دیں۔ اور ۱۸۹۳ء میں فنانشیل اور پولٹیکل سکریٹری کے عہدۂ عظمیٰ سے
آٹھ سو روپیہ ماہوار کا وظیفہ لے کر ریاست سے رخصت ہوئے۔

اعلیٰ حضرت حضور نظام نے ان کو محسن الدولہ محسن الملک منیر نواز جنگ کے ممتاز خطابات دے کر وقتاً
فوقتاً انعامات سے ان کی حوصلہ افزائی کی۔ اپنے زمانہ ملازمت میں انھوں نے انتظام مالگزاری و قحط
وغیرہ کی نمایاں خدمات انجام دیں۔ اس سلسلہ میں مقدمہ ٹھیکہ معدنیات کے متعلق ایک گہری سازش کا نواب صاحب
نے انکشاف کیا جس میں انگلستان کے اور ریاست کے مقتدر اصحاب اور اعلیٰ عہدہ دار بھی شامل تھے اس
اہم اور پیچیدہ معاملہ کو سلجھانے کے لئے آپ کو انگلستان کا سفر کرنا پڑا اور ریاست کو اپنی دور اندیشی اور
معاملہ فہمی کی وجہ سے ایک بڑے نقصان سے محفوظ رکھا۔ ان کی اس مدبرانہ سعی و کوشش کا اعتراف نہ
صرف ریاست مذکور کے وزیر اعظم نے کیا بلکہ فارن سکریٹری گورنمنٹ آف انڈیا تک نے ان کی دانائی
تدبر اور فراست پر مہر ثبت کی۔ غرض غایت درجہ کی نیک نامی کامل شہرت اور ہر دل عزیزی کے ساتھ
نواب صاحب نے اپنا زمانۂ ملازمت حیدرآباد میں ختم کیا۔ خداوند تعالےٰ نے نواب صاحب کی ذات
میں شرافت نسب، وجاہت نسب، وجاہت ظاہری کے علاوہ بہت سے اوصاف اور کمالات ودیعت
کئے تھے وہ ایک طرف زبردست پولٹیشن اور مدبر نظر آتے تھے تو دوسری طرف ایک فصیح البیان مقرر

خوش بیان واعظ اور عالمانہ شان کے لحاظ سے کامل انشا پرداز تھے۔ ان کی تقریر جس طرح دل آویز خوش آئند اور دلائل و براہین سے مرصع ہوتی تھی اسی طرح ان کی تحریر کیا باعتبار فصاحت و بلاغت اور کیا بلحاظ مطالب و معانی ایسی دل نشین ہوتی تھی جو دل سے نکلتی تھی اور دل ہی دل میں جاکر اترتی تصنیف و تالیف کے لحاظ سے گو انھوں نے لمبا چوڑا سرمایہ نہیں چھوڑا لیکن ان کے لکچروں کا مجموعہ تہذیب الاخلاق کے مضامین اور بعض مضامین اور بعض رسالے باقیات الصالحات کے ترکہ میں قوم کے پاس موجود ہیں جن کے مطالعہ سے مذہبی، اخلاقی، تمدنی، تعلیمی ضرورتوں میں نوع انسان ہمیشہ ان سے اکتساب خیالات کرسکتی ہے، اور جن کے ذریعہ سے ان کے تبحر علمی اور وسعتِ معلومات اور وسیع الخیالی کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

نواب صاحب کے دل میں قوم کی والہانہ محبت کا جوش اور جذبہ قدرت نے کافی طور سے پیدا کیا تھا۔ سرسیّد احمد خاں نے جس وقت قوم کی اصلاح اور تعلیمی ترقی کی کوشش میں قوم کو علوم جدیدہ کے حصول کی دعوت دی اس کے کچھ عرصہ بعد نواب صاحب ان کے رفیق اور دست و بازو بن گئے۔ قوم کی اصلاح خیال اور مدرسۃ العلوم کو ترقی دینے میں سرسید کو نواب صاحب کے رفیق کا رہنے سے قلمے درمے، سخنے جس جس قسم کی مدد حاصل ہوئی۔ بے شبہ جب تک علی گڑھ تحریک کی ایک اینٹ بھی سلامت رہے گی نواب محسن الملک کے حب قومی جوش ملی میں ایثار علی النفس، حسن تدبیر، کمال ہمدردی کے احسان سے بے نیاز نہیں ہوسکتی۔

اُنھوں نے سرسید کی اس وقت رفاقت کی جب ان کے مددگاروں میں ایک آدھ کے سوا کوئی ان کا یار و یاور نہ تھا۔ اُنھوں نے مدرسۃ العلوم کو ہزارہا کا چندہ اپنی ذات سے دیا اور اپنے اثر سے دلوایا۔ روپیہ سے بڑھ کر ان کی زبردست قوت تحریر و تقریر نے سرسید کی اعانت کی جس کی وجہ سے ان کو اپنے مقاصد کے بر لانے میں بڑی کامیابی ہوئی۔ اصلاح معاشرت کی غرض سے ۱۸۷۰ء میں سرسیّد نے رسالہ تہذیب الاخلاق جاری کیا۔ اس میں جو مضامین نواب محسن الملک کے زور قلم اور فصاحت و بلاغت کا نتیجہ تھے ہندوستان میں انھوں نے تہلکہ برپا کردیا تھا۔ شمس العلماء مولوی ذکاء اللہ انھیں مضامین کی نسبت لکھتے ہیں۔

"نواب محسن الملک جو کچھ لکھتے تھے اس میں ایسی لطافت ہوتی تھی کہ لوگ ان کے مضامین کو پڑھ کر سر دھنتے تھے۔ سرسید پر جو لوگ نکتہ چینی کرتے تھے ان کا جواب وہ ایسی دل رُبا ظرافت اور فصاحت سے دیتے تھے کہ سرسیّد کے حریف دنگ رہ جاتے تھے اور ان سے کوئی معقول جواب نہیں بن پڑتا تھا۔"

سرسید نے ان کی پرخلوص محبت فیاضانہ مالی امداد اور لاثانی قابلیت کی بنا پر جو قیام اور بناء مدرستہ العلوم کے لئے وقف رہیں۔ غرض ان احسانات عظیم کے شکریئے میں لٹن لائبریری کے متصل "مہدی منزل" تعمیر کی۔

جب سرسید نے آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی بنیاد ۱۸۸۶ء میں ڈالی نواب محسن الملک نے اس تحریک کو دل سے پسند کیا کیوں کہ وہ مسلمانان ہند کے خیالات کو ایک مرکز پر لانے کا ذریعہ اسی مجلس کو سمجھتے تھے اور وہ خیال کرتے تھے کہ بغیر کسی ایسی مجلس کے انعقاد کے نہ مسلمانوں کی تعلیمی ترقی کی رفتار بڑھ سکتی ہے، ان کے معاشرتی خیالات کی اصلاح ہوسکتی ہے۔ ۱۸۹۰ء کے اجلاس کانفرنس میں وہ پہلی مرتبہ حیدرآباد سے چل کر الہ آباد میں شریک ہوئے، جس میں انھوں نے ایسا پُرمغز مضمون پڑھا جس کو سُن کر در و دیوار محوِ حیرت بن گئے تھے۔ ان کے اس لکچر کے تین عنوان تھے۔ پہلے حصہ میں مسلمانوں کی ملکی، تمدنی علمی ترقی و تنزّل کی مختصر تاریخ اور ترقی و تنزل کا بیان تھا۔

دوسرے حصہ میں یونان کی ترقی اور زوال، یورپ کے تنزل اور ترقی کا ذکر۔ تیسرے حصہ میں وہ اسباب بیان ہوئے تھے جن سے یورپ نے ترقی کی تھی۔

۱۸۹۳ء میں وہ حیدرآباد سے وظیفہ یاب واپس آئے تو بجائے اپنے وطن کے انھوں نے علی گڑھ کی سکونت اختیار کرکے پورے طور سے سرسید کے کاموں میں شریک ہوگئے۔ اسی سال وہ اجلاس کانفرنس کے پریسیڈنٹ منتخب ہوئے جس کا اجلاس بھی علی گڑھ میں ہونا قرار پایا تھا۔

کانفرنس میں سرسید نے ایک رزولیوشن پیش کیا تھا جس کا عنوان تھا "مسلمان من حیث القوم مردہ ہیں یا زندہ" ان کا خیال تھا کہ قوم مردہ ہے اس لئے کہ جو سعی و کوشش قوم کے بیدار کرنے کی اور اپنی حالت کی اصلاح کی اور علوم و فنون کی طرف مائل کرنے کی اس وقت تک ہو چکی تھی قوم نے اس وقت تک اپنی حالت کا احساس نہ کرکے ان کے نزدیک کوئی توجہ ایسی کہ جس سے بہبودی اور ترقی کی امید ہو نہ کی۔ مدرستہ العلوم کی تکمیل کے خیالات نقش برآب اور اس کی بنیادوں کے خاکے ان کو زیر پا نظر آتے تھے اور وہ یہ خیالات مذکورہ قوم کی ترقی سے مایوس تھے۔ نواب محسن الملک اس امر کے حامی تھے کہ قوم زندہ ہے۔ وہ سرسید کے منصوبوں کی قدر کرتی ہے۔ اس کو اپنے تنزل کا احساس ہے۔ اور اس احساس کے ساتھ وہ ترقی کی طرف مائل ہے۔ اور مدرستہ العلوم جو تکمیل مقصد کا بڑا ذریعہ ہے وہ اس کی تعمیر میں مصروف تھے اس معرکتہ الآرا مسئلہ پر جو دلچسپ اور دلنشین تقریر سرسید کے جواب میں نواب محسن الملک نے کی ہے ان کی پیاری زبان سے جن خوش نصیبوں نے سُنی وہ تو سُنی لیکن آج بھی اس تقریر کے پڑھنے سے

اور ان کے یہ سمجھانے سے کہ قوم با احساس اور منزل ترقی سے ہم کنار رہے، جو سرور او کیف حاصل ہوتا ہے اس کے دیکھنے والے ہی اس کے ذوق آشنا ہو سکتے ہیں۔

سرسید آخر عمر میں بہت بوڑھے ہو گئے تھے مدرستہ العلوم اور دیگر مشاغل کی بدولت اب ان میں اتنی سکت اور ہمت نہ رہی تھی کہ وہ کانفرنس کے مقاصد واغراض کو پورا کر سکتے جس کا نتیجہ یہ تھا کہ کانفرنس کا دائرۂ عمل صوبہ متحدہ کے اندر اندر محدود ہو کر رہ گیا تھا۔ نواب صاحب قومی تعلیم کی وسعت اس کی اصلاح تہذیب و معاشرت، مدرستہ العلوم کی ترقی اور اس ترقی کے ذریعہ سے مسلم یونیورسٹی کا تخیل غرض علمی، عملی ہر حیثیت کو وہ کانفرنس کی عالم گیری میں مضمر سمجھتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے اس مقصد کے لئے پوری ہمت اور کوشش سے باوجود پیرانہ سالی و اضمحلال قوائے مختلف مقامات اور دیار و امصار کا دورہ کیا مجلسیں منعقد کیں، اور ان میں اپنی مشہور فصاحت و بلاغت کے ساتھ تقریریں کر کے اغراض و مقاصد کانفرنس سے لوگوں کو واقف کرنے کی کوشش کی۔ واقعات اور حالات حاضرہ کے لحاظ سے ان کو ان کے جمود پر غیرت دلائی تعلیم کی ضرورت ذہن نشین کی اور وسائل و اسباب کے مہیا کرنے کے راستے بتائے۔ پمفلٹ چھاپے، اخبار میں مضمون لکھے۔ ان کی اس توجہ اور کوشش کو تھوڑا ہی عرصہ گزرا تھا کہ ان کی دل ربا تقریروں اور پرزور نصیحتوں نے قومی توجہ کا رخ بدل دیا اور قوم ان کے قائم کئے ہوئے مرکز کے گرد اکٹھی ہونی شروع ہو گئی۔ انھیں کی توجہ اور اثر سے دور دراز مقامات سے کانفرنس کو دعوتیں آئیں۔ جہاں ہر حصہ ملک کے لوگ آکر شریک مجلس ہوئے۔ سب نے اپنے قومی زوال اور شخصی پستی کو محسوس کر کے دور ترقی میں ابنائے ملک کے ساتھ چلنے کی کوشش شروع کی۔ رنگون، کلکتہ، مدراس، کراچی، بمبئی کی یلغاریں انھیں کے زمانہ اور فتوحات کی یادگار ہیں۔ نہ فقط ان شہروں میں کانفرنس کے کامیاب جلسے ہوئے اور عام قومی خیالات میں قومی ترقی کی خواہش پیدا ہوئی بلکہ مدرستہ العلوم کو کانفرنس کے اثر اور ذریعہ سے لکھو کھا روپیہ کی مالی اور اخلاقی مدد ملی اور مدرستہ العلوم تمام ہندوستان کے مسلمانوں کا مرکز علوم تسلیم کیا جانے لگا اور وہ روز بروز اس نصب العین سے قریب ہوتا گیا۔ جس کا تخیل "مسلم یونیورسٹی" تھا۔ اور اب بحمد اللہ عدم سے وجود اور زندہ ہستی کی شکل میں موجود ہے۔ مسلم یونیورسٹی جیسے مقصد عظیم کے بر لانے میں بے شبہ کانفرنس کی تحریک اور کوشش کا بہت بڑا حصہ شامل ہے۔

۱۸۹۸ء میں سرسید نے انتقال کیا۔ ان کی وفات کے بعد مدرستہ العلوم مختلف مشکلات میں سب سے بڑھ کر قرضہ کی مصیبت میں جکڑا ہوا تھا۔ نواب صاحب سرسید کی وفات سے بڑے غمگین تھے۔ اس واقعہ سے ان کی صحت پر برا اثر پڑا تھا لیکن وہ فوراً اٹھے اور انھوں نے سب سے پہلے کالج کی مالی

حالت کی اصلاح پر توجہ کی۔ سرسید کی یادگار میں سرسید میموریل فنڈ کھولا۔ خود فنڈ کے مہیا کرنے کے لئے دورے کئے جن کی فوری توجہ نے تھوڑے ہی عرصہ میں کالج کو قرضہ کی مصیبت سے نجات دی۔ سید محمود مرحوم کی چند مہینوں کی جانشینی کے بعد نواب صاحب مدرستہ العلوم کے آنریری سکریٹری منتخب ہوئے۔ ان کے زمانہ سیکریٹری شپ میں مدرستہ العلوم نے حیرت انگیز ترقی کی۔ جب ۱۸۹۸ء میں سرسید نے انتقال کیا۔ اس وقت طلبہ کی تعداد (۳۴۳) تھی اور نواب صاحب کی وفات کے وقت ۱۹۰۷ء میں (۸۹۲) اسی طرح ۹۹-۱۸۹۸ء میں کل مدات کی آمدنی بہتر ہزار آٹھ سو تیس روپیہ تھی۔ مگر ۰۷-۱۹۰۶ء میں جو نواب صاحب کا سالِ رحلت ہے ایک لاکھ چوہتر ہزار تین سو اکتالیس روپیہ کی آمدنی ہوئی۔ جو رقومات نقد کی صورت میں ان کو وصول ہوئیں ان کی مجموعی میزان نو لاکھ بیاسی ہزار سے زائد ہے۔ ان کو ملکی اور سیاسی امور میں اپنی قومی پوزیشن کی حفاظت، اور حقوق طلبی کا ہمیشہ خیال رہتا تھا۔ سیاسی امور میں ان کی فکر و کاوش بیشتر صحیح رائے قائم کرتی تھی۔ وہ ملک کی بہتری کے دل سے آرزومند تھے اور اس مقصد کے لئے ان کی دلی خواہش یہ رہتی تھی کہ ہندو مسلمان آپس میں دوست بن کر رہیں۔ وہ ملکی مفاد کو ہمیشہ ان دونوں قوموں کے اتحاد اور آپس کے خوشگوار تعلقات میں مضمر سمجھتے تھے انھوں نے دونوں قوموں کے سمجھدار افراد کو اس نعمت کی قدر سمجھانے میں ہمیشہ دل سوز نصیحتیں کیں وہ نہ صرف ہندو اور مسلمانوں کو بلکہ مدرستہ العلوم کے طلبہ کو موقع موقع سے اس اتحاد اور یگانگت کو برقرار رکھنے کی ہدایت اور نصیحت فرمایا کرتے تھے۔

۱۹۰۰ء میں جب سر انٹانی میکڈانل نے دفاتر سرکاری میں دیوناگری حروف جاری کرنے کا فیصلہ کیا جس سے مسلمانوں کی تعلیم اور لٹریچر پر ضرب کاری لگتی تھی تو نواب صاحب نے ایک جلسہ طلب کیا جس میں "اردو ڈیفنس ایسوسی ایشن" کی بنیاد پڑی۔ اسی سلسلہ میں قیصر باغ لکھنؤ کی بارہ دری میں ایک عظیم الشان جلسہ جو سیاسی نوعیت کے لحاظ سے مسلمانوں کے لئے ایک درد انگیز اور پر جوش جلسہ تھا۔ نواب صاحب نے اردو زبان کی حمایت ضرورت اور گورنمنٹ کو اس کی غلطی پر متنبہ کرنے کے لئے ایسی زبردست تقریر کی جس کا اثر سننے والوں کے دل میں اس وقت تک موجود ہے ۱۹۰۶ء میں جب کونسلوں کی اصلاح کا مسئلہ پیش تھا تو انھوں نے اپنی مشہور عالم فراست کے لحاظ سے فوراً ایک ڈیپوٹیشن مرتب کیا جس نے یکم اکتوبر ۱۹۰۶ء کو لارڈ منٹو کے سامنے ہز ہائی نس سر آغا خاں کی سرگردہی میں ایڈریس پیش کیا۔ اور جس کی وجہ سے منٹو مارلے اسکیم میں مسلمانوں کا حق نیابت جداگانہ تسلیم کیا گیا۔

الغرض نواب محسن الملک اپنی گوناگوں قابلیت اور اوصاف کے لحاظ سے اس جامعیت اور رتبے کے شخص تھے جو اپنی زندگی میں بے مثل اور لاثانی تھے۔ اور ابھی مدتوں تک یہ امید نہیں کی جاسکتی کہ اس سرزمین سے مثل ان کے صاحبِ کمال ہمدرد قوم مدبر زمانہ پیدا ہو۔ ان کی عمر کا بڑا حصہ قومی تعلیم کی ترقی

کی خواہش اور کوشش میں بسر ہوا۔ وہ مناصب جلیلہ کی رفعت اور شان پر پہونچکر ایسے حلیم، بردبار نے اور ان کا اخلاق اس قدر بلند تھا جس کی وجہ سے امیر و غریب ہر درجہ کے افراد برادر ہندو مسلمان عیسائی غرض ہر طبقہ پر ان کی وجاہت اور عالی شان زندگی کا اثر چھایا ہوا تھا وہ غریبوں کے ہمدرد، امیروں کے دوست، طلبہ کے مددگار تھے۔

۱۹۰۷ء میں شملہ گئے۔ عرصہ دراز سے صحت خراب ہو گئی تھی لیکن جو مقصد اور کام پیش نظر تھا اس نے ایک لمحہ کے لئے پیچھا نہ چھوڑا۔ شملہ ہی پر مرض میں زیادہ کا حملہ ہوا جو انجام سبب موت بن گیا۔ ۱۶ اکتوبر کو یہ عالی شان ہستی جو بزم قومی کی روح رواں اور سہارا تھی ہمیشہ کے لئے اس دار فانی سے رخصت ہو گئی۔ یہ ہوش ربا خبر تاروں کے ذریعہ سے اقصائے عالم میں پھیل گئی جس نے فضائے ہند کو تاریک کر دیا۔ سب سے بڑھ کر ماتم کدہ مدرسۃ العلوم تھا۔ ان کی موت پر عزیزوں دوستوں کا تو کیا ذکر گورنروں سے لے کر مزدوروں اور قلیوں تک نے حیرت و افسوس کے آنسو بہائے۔ ہندوستان کا کوئی گوشہ ایسا نہ تھا جہاں ان کے لئے بزم عزا قائم ہو کر صف ماتم نہ بچھی ہو۔ مہینوں ملکی اور قومی اخبارات نے ان کی خوبیوں کا ذکر کیا اور ان کی رحلت کو ملک اور قوم کی بدنصیبی سے تعبیر کیا۔ خاندان برامکہ کی تباہی کے ذکر اور ان کی فیاضیوں کی مدح سرائی میں شاید ہی اتنے مرثئے لکھے گئے ہوں جتنے کہ محسن الملک کی موت کے مرثئے لکھے اور پڑھے گئے۔

خاص اہتمام کے ساتھ لاش تابوت میں رکھ کر شملہ سے علی گڑھ لائی گئی۔ نواب وقار الملک مولوی مشتاق حسین ریلوے اسٹیشن پر پہلے سے تابوت کے منتظر باچشم پرنم کھڑے تھے جنھوں نے اپنے قدیم رفیق اور دوست کو طلبہ کے انبوہ کثیر نے اپنے شفیق باپ کو اور دیگر افراد قوم نے ملت بیضا کے پشتیبان کو غایت درجہ کے سکوت صبر اور ادب کے ساتھ ریل سے اتارا اور مدرسۃ العلوم کی مسجد میں اور سرسید کے پہلو میں ہمیشہ کے لئے سونپ دیا۔

آہ! مہدی علی جیسے شخص اگر آج یورپ میں پیدا ہوئے ہوتے تو خدا جانے ان کی زندگی کے کتنے کارنامے کن کن عنوانوں کے ساتھ منظر عام پر آچکے ہوتے اور ان کی یادگاروں کا وجود خدا ہی کو خبر ہے۔ کتنے بے کمالوں کے کمال اور کتنے بے علموں کے لئے علم و فن کا ذریعہ بنتا۔ لیکن مہدی علی کے جسم اور خون کا تعلق جس قوم سے ہے اس سے اس احساس کی توقع رکھنا ابھی ایک زمانہ دراز تک محالات سے ہے۔

اس یادگار دن کا قائم ہونا ایک طرف ان کے حالات زندگی تک میں کوئی ایسا مجموعہ نہیں جو ان کے

کارنامہ حیات پر کافی روشنی ڈال سکے۔ حالاں کہ کل کی بات ہے کہ وہ بلند و بالا اور شگفتہ شخصیت ہماری آنکھوں کے سامنے تھی اور اس گوہر نایاب سے روشنی لینے کے لئے سیکڑوں چھوٹے چھوٹے جگنو اس کی سادہ اور بے تکلف ملاقات کے لئے منڈلاتے رہتے تھے۔

خدا بھلا کرے محبی مولوی محمد امین صاحب مارہروی مہتمم تاریخ کی مساعی کا جنھوں نے "بشیر پاشائیریز" کے سلسلہ میں مشاہیر قوم کے حالات میں چند مفید رسالے چھاپے۔ من جملہ اُن کے ایک رسالہ نواب محسن الملک کے حالات میں لکھ کر شائع کیا۔

سطور ہذا اسی رسالہ کی تلخیص ہیں۔

خطبۂ صدارت

بزرگانِ قوم و برادران! جو عزت اس وقت آپ نے اس معزز اور قومی جلسہ کے صدر انجمن ہونے کی مجھے بخشی ہے وہ ایک ایسی عزت ہے کہ ہر ایک نامور مسلمان اس پر فخر کر سکتا ہے۔ مجھ سا ناچیز آدمی جس قدر اس پر فخر کرے اور آپ کا شکر وہ کم اور درحقیقت بہت کم ہے۔ مگر جب کہ میں ایک طرف اس معزز خدمت کے مشکل فرائض کو دیکھتا ہوں اور دوسری طرف اپنی ناقابلیت کو، تو چاہتا ہوں کہ اُس بیچارے مومن کی طرح جسے نمازیوں نے زبردستی نماز پڑھانے کے لئے آگے کر دیا تھا اور وہ نمازیوں کو سجدہ میں چھوڑ کر مسجد سے چل دیا، میں بھی موقعہ پاکر نکل جاؤں۔ لیکن چوں کہ ایسے موقعہ کے ملنے کی مجھے امید نہیں ہے اس لئے بُرا ہوں یا بھلا، آپ کے سامنے حاضر ہوں اور بہ تعمیل آپ کے حکم کے اس کرسی پر بیٹھتا ہوں۔ اگر میں اپنی اس معزز خدمت کے فرائض ادا کرنے میں قاصر رہوں تو مجھے امید ہے کہ آپ معاف فرمادیں گے۔

صاحبو! بہ حیثیت صدر انجمن ہونے کے اس وقت میرا پہلا فرض یہ ہے کہ آپ کا خیر مقدم کہوں۔ اور آپ کی تشریف آوری کا شکر ادا کروں۔ مگر میں متردد ہوں کہ آیا آپ مجھے اس کی اجازت دیں گے یا نہیں۔ اس لئے آپ یہاں اس فرض کے ادا کرنے کے لئے آئے ہیں جو قوم کا آپ پر ہے۔ پس ہر ایک متنفس جو یہاں موجود ہے خود میزبان ہے اور خود مہمان۔ خود داعی ہے خود مدعو۔ خود ثنا کرنے اور خود مشکور۔ کوئی ان میں سے اپنی قومی خدمت کا صلہ نہیں چاہتا۔ نہ کوئی اپنے اس فرض کے ادا کرنے پر کسی سے شکر یا اجر کا طالب ہے۔ بلکہ ہر ایک مسلمان دل کی زبان سے کہہ رہا ہے کہ لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا۔ مگر چوں کہ اس وقت اس شہر کے ہر گوشہ سے آپ کے خیر مقدم کی صدا آرہی ہے، اور اس قومی گھر کی ہر در و دیوار سے مبارک باد کی

آواز بلند ہے۔ میرے اختیار میں نہیں ہے کہ میں ان کا ہم صفیر نہ بنوں اور آپ کا خیر مقدم نہ کہوں۔

صاحبو! جس وقت میں ان مجلسوں پر نظر کرتا ہوں جو آئے دن ہمارے یہاں ہوا کرتی ہیں تو مجھے مجلس کے دیکھنے سے جرأت آمیز خوشی ہوتی ہے۔ کل کی بات ہے کہ جب ہم مجلس کا نام سنتے تو بجز تہنیت یا تعزیہ کی تقریب کے کسی اور طرف ذہن منتقل نہ ہوتا۔ نہ سوائے شخصی اغراض کے قومی مقاصد کے لئے لوگوں کے ہونے کا خیال دل میں آتا۔ چند سال پہلے کبھی نے سُنا تھا کہ لوگ کہیں اس لئے جمع ہوئے ہوں کہ قوم کا کام کریں۔ اس کی تنزل یافتہ حالت پر متاسّف ہوں اور اس کی ترقی کی تدبیر کریں۔ لیکن اب حالت دوسری ہے۔ بہت سے مسلمان ایسے پیدا ہو گئے ہیں جو قوم کے لئے کام کرتے ہیں اُس کا خیال رکھتے ہیں اُس کی دردناک حالت پر افسوس کرتے ہیں۔ اُس کی ترقی کے خواہشمند ہیں اور بعضے ایسے بھی نظر آتے ہیں قوم کے اغراض کو اپنے ذاتی فوائد پر مقدم رکھتے ہیں۔ اور بجائے نفسی نفسی کے قومی قومی پکارتے ہیں جس طرح اس اُنیسویں صدی میں بہت سی چیزیں بدل گئیں اسی طرح ہمارے مانوس الفاظ فرض اور دعوت اور مجلس کے معنی بھی بدل گئے اور بجائے ذاتیات کے ان کا اطلاق قومی اغراض پر ہونے لگا۔ اب فرض سے مراد ہے قوم کی بھلائی جو ہر ایک مسلمان پر بقدر اپنی طاقت کے ضروری سمجھی جاتی ہے۔ دعوت کے معنی ہیں کسی قومی کام کے لئے بُلایا جانا اور مجلس کا مقصود ہے قوم کی بہبودی کے لئے لوگوں کا جمع ہونا چنانچہ آج جو بہت سے نیک دل پاکیزہ خیال لوگ دور دراز مقامات سے سفر کی زحمت اُٹھا کر اور اپنے کام کاج ہرج کرکے یہاں آئے ہیں۔ اُس سے کوئی ذاتی فائدہ متصور نہیں۔ نہ کسی خاص شخص کی خوشی منظور ہے۔ بلکہ وہ قومی خیال ان کو یہاں تک لایا ہے اور فقط اس غرض سے یہاں جمع ہوئے ہیں کہ قوم کی ترقی کی تدبیریں سوچیں اپنی اولاد کی تعلیم و تربیت کی تجویزیں کریں۔ اپنی متفرق اور منتشر قوموں کو ایک جگہ جمع کریں۔ خیالات کے تبادلہ سے غلطیوں کی اصلاح کریں اور باہمی صلاح و مشورہ سے قوم کی ترقی کا کوئی سیدھا راستہ نکالیں اس لئے اس مجلس کے دیکھنے سے اور شریک ہونے سے میرے دل کو ایک عجیب تعجب انگیز خوشی ہے اور یہ خوشی اس خیال سے اور بھی زیادہ ہو گئی ہے کہ آج آپ وہاں جمع ہیں جو قومی خیالات کا گھر ہے اور جہاں یہ پیارے اور ہونہار بچے ہمدردی محبت قومی تعلیم و تربیت کے پیدا ہوئے ہیں، اور کانفرنس یہاں ہونا وہی لطف دے رہا ہے جو بچے کا ماں کی گود میں بیٹھنا۔ آپ جانتے ہیں کہ یہ کانفرنس علی گڑھ کا پیارا بچہ ہے۔ اس شہر کو اُس سے مادری محبت ہے۔ اُس کی محبت سے امیدیں اُس سے وابستہ ہیں۔ آج وہ نہایت خوش ہے کہ اُس کا پیارا بیٹا ادھر اُدھر کی ہوا کھا کر تازہ و توانا۔ صحیح و تندرست۔ اس وقت اُس کی گود میں بیٹھا ہوا کھیل رہا ہے۔ اور اُس کی آٹھویں سالگرہ کے جشن میں اتنے دوست و احباب جمع ہیں۔

صاحبو! میری یہ خوشی کچھ خیالی نہیں ہے بلکہ اس کا ایک خاص اور قوی سبب ہے۔ میرے نزدیک جس طرح کہ کانفرنس قومی ترقی کے لئے نہایت مفید ہے۔ ویسا ہی کانفرنس کا یہاں ہونا اس کے اغراض اور مقاصد کے لئے فائدہ بخش ہے۔ اس لئے کہ اس کا اصلی مقصود ہے مسلمانوں کی ترقی اور وہ منحصر ہے اعلیٰ تعلیم پر اور یہ وہ مسئلہ ہے جس کو ہم مسلمان نہایت مشکل اور لاینحل سمجھتے ہیں اور جس کی عظمت اور وقعت ہماری ہمتوں کو توڑ دیتی ہے۔ اور جس کے اسباب جمع کرنے کا ہم ارادہ تک نہیں کرتے۔ اور اُسی مسئلہ کا سمجھانا اور اُسی مشکل کو آسان کرنا، اور اُسی کا شوق پیدا کرنا اور اُسی کی ہمت دلانا ہمارا اصل مقصود ہے، اور یہ مقصود دوسری جگہ سیکڑوں رزولیوشن کے پیش کرنے اور ہفتوں مباحثہ کرنے اور مہینوں لکچر دینے سے بھی حاصل نہیں ہو سکتا۔ جیسا کہ یہاں دو تین دن رہنے اور کالج کے ملاحظہ کرنے اور طالب علموں کی حالت دیکھنے سے حاصل ہو سکتا ہے۔ قومی تعلیم کے مشکل مسئلہ کے معنی نہایت آسانی سے یہاں سمجھ میں آسکتے ہیں۔ اُس کی مشکلات جن کا رفع ہونا ناممکن سمجھا جاتا ہے۔ یہاں حل شدہ دکھلائی دیتے ہیں اور قومی قوت اور قومی عزت کا نمونہ اور قومی ترقی کی تدبیر کی مجسم صورت یہاں نظر آ رہی ہے۔

یعنی وہ کالج جس میں دماغی تعلیم کے ساتھ مذہبی اور اخلاقی تعلیم بھی دی جاتی ہے۔ یہاں لڑکوں کی تربیت کا خیال اور اُن کے اخلاق کی درستی کا لحاظ اور اُن کے چال چلن کی نگرانی کی جاتی ہے جہاں انگریزی پڑھنے والوں میں، قومی ولولے اور اسلامی جذبات بھی پائے جاتے ہیں اور یہاں قومی قوت کے اجتماع اور سیلف ہیلپ، کا عمدہ نتیجہ دیکھنے میں آتا ہے۔ اور یہاں کا طالب علم ہونا پبلک اور گورنمنٹ دونوں کے نزدیک عمدہ تعلیم پاکیزہ خیالات پسندیدہ اخلاق قومی محبت اور گورنمنٹ کی وفاداری کی کافی سند سمجھی جاتی ہے اس حیرت انگیز کارخانہ کو دیکھ کر ممکن نہیں ہے کہ لوگوں کے دلوں میں جوش نہ آوے، اور آئندہ کے لئے ہمت پیدا نہ ہو اور اپنی متفقہ کوششوں کو کام میں لانے کی رغبت نہ ہو۔ پس اے میرے دوستو۔ ان خیالات سے میں آپ کا یہاں جمع ہونا اور قومی ترقی کی تدبیریں یہاں بیٹھ کر کرنا زیادہ پسند کرتا ہوں۔ اور یہاں آنے پر آپ کو مبارکباد دیتا ہوں۔

اے میرے دوستو! اگر صرف آپ کا خیر مقدم کہہ کر اپنی کرسی پر بیٹھ جاؤں تو میں اس فرض کے ادا کرنے میں اپنے آپ کو قاصر سمجھوں، جو بحیثیت صدر انجمن ہونے کے مجھ پر ہے۔ مجھے ضرور ہے کہ میں اس کانفرنس کے اغراض و مقاصد کی نسبت جو غلط فہمیاں اور اس کی کارروائیوں پر جو نکتہ چینیاں ہو رہی ہیں ان کا کچھ تذکرہ کردوں۔

صاحبو! آپ کو معلوم ہے کہ ہماری اس کانفرنس کے اغراض کی نسبت غلط فہمیاں بھی ہوئی ہیں۔ اور اُس کی کارروائی پر نکتہ چینیاں بھی کی جاتی ہیں۔ نکتہ چینی کی نسبت ہم کو تعجب نہ کرنا چاہئے۔ اس لئے

کہ جو لوگ کوئی بڑا کام کرتے ہیں وہ معصوم نہیں ہوتے۔ نہ اُن کی کارروائی غلطی، خطا اور نقص سے خالی ہو سکتی ہے۔ اور گو کیسی ہی لیاقت، محنت اور ایمانداری سے وہ اپنا کام کریں نکتہ چینی کا موقع ضرور باقی رہتا ہے علاوہ بریں نکتہ چینی فی نفسہ نہایت مفید بلکہ ایک قسم کی مدد ہے۔ بشرطیکہ نیک نیتی سے کی جاوے۔ ہمارا یہ مجمع خود نکتہ چینی کے لئے قائم ہے، اور نکتہ چینی ہی اُس کا اصل مقصود ہے تاکہ جو غلطی ایک کے خیال میں ہو وہ دوسرے کے خیال سے اصلاح پاوے۔ اے صاحبو پھر ہماری کارروائیاں ہمارے مباحثے اور ہماری تجویزیں، طلبیت عام ہیں۔ اور ہر ایک شخص کو اُس پر بُری بھلی رائے ظاہر کرنے کا حق ہے۔ ہم ہر ایک کی بات دل سے سننے کے لئے تیار ہیں۔ اور ہم ہر ایک نکتہ چینی پر خیر مقدم کہنے کو تیار ہیں مگر ہاں اُس وقت ہم کو افسوس ہوتا ہے جبکہ ہماری کانفرنس کے اغراض و مقاصد دیدہ و دانستہ غلط بیان کئے جاتے ہیں اور بے دردی سے اس کی تضحیک کی جاتی ہے۔

صاحبو! بڑا اعتراض کانفرنس پر یہ ہے کہ کوئی عملی فائدہ اس سے قوم کو نہیں ہوا۔ میں خیال کرتا ہوں کہ کانفرنس پر یہ الزام عاید ہو ہی نہیں سکتا اس لئے کہ تعمیل اُس کی مقصود اور اس کی قدرت سے خارج ہے۔ جو لوگ کانفرنس پر یہ اعتراض کرتے ہیں، غالباً اُنھوں نے کانفرنس کے اشتہار اور پہلی سال کے پہلے رزولیوشن کو بھی ملاحظہ نہیں فرمایا۔ پہلا رزولیوشن جو ۱۸۸۶ء میں جناب سر سید احمد خاں بہادر نے پیش کیا وہ یہ تھا "کہ مسلمانوں کی ترقی تعلیم میں قومی اتفاق اور قومی امداد سے کوشش کی جاوے اور ہر سال ان اُمور پر غور کرنے کے لئے مختلف اضلاع کے لوگوں کا ایک جلسہ ہوا کرے۔" اس رزولیوشن کے پیش کرتے وقت سر سید احمد خاں نے یہ فرمایا تھا کہ "گو ہم ایک قوم مسلمان کہلاتے ہیں مگر ایک جگہ کے رہنے والے دوسری جگہ کے رہنے والوں سے ایسے ہی ناواقف ہیں جیسے کہ کوئی اجنبی قوم ایک دوسرے کے حال سے ناواقف ہو۔ کوئی ذریعہ ہمارے پاس ایسا نہیں ہے کہ مختلف اضلاع کے لوگ کسی موقع پر آپس میں ایک جگہ جمع ہوں۔ ایک کے حال سے دوسرے کو آگہی ہو۔ ہم آپس میں مل کر اپنے خیالات جو قومی تعلیم اور قومی ترقی کی نسبت ہوں دوسروں پر ظاہر کر سکیں۔ اور جو غلطی ہمارے خیال میں ہو، وہ دوسروں کے خیال سے بخوبی اصلاح پاوے۔ اس مقصود کو جو کہ کانفرنس کے قایم کرتے وقت ظاہر کیا گیا تھا، پھر سید صاحب نے اپنے پچھلے سال کی رپورٹ میں ان لفظوں میں بیان فرمایا کہ "اس کانفرنس کا کام یہ ہے کہ آپس میں صلاح و مشورہ سے بالاتفاق جم غفیر مسلمانوں کے اس بات کو قرار دے کہ کیا امر مسلمانوں کی بھلائی، اور اُن کی قومی ترقی کے لئے مفید ہے اور سب پر ظاہر کرے اور اُن کے فوائد کو قوم کے دلنشین کرے۔ ان کی تعمیل ہونی کانفرنس کی قدرت اور اختیار سے باہر ہے یہ خود قوم کا کام ہے کہ جس تجویز کو خود انھوں نے قوم کے لئے مفید

قرار دیا ہے اُس کے عمل درآمد میں کوشش کریں۔ پس جس قدر افسوس ہو وہ قوم کی حالت پر ہونا لازم ہے
کانفرنس تو مثل ایک دُنیاوی واعظ کے قوم کی بھلائی کی باتوں کو بیان کرتی ہے۔ وہ قوم کو جتلاتی ہے۔ اُس کی خراب
حالت سے اُس کو مطلع کرتی ہے اُن پر عمل کرنا اُس کی تکمیل کے لئے کوشش کرنا، قوم یا بزرگانِ قوم پر منحصر ہے
مگر کانفرنس جو کچھ کرتی ہے اُس سے زیادہ کرنے کی وہ طاقت نہیں رکھتی۔" یہ بیان سید صاحب کا کانفرنس
کے اغراض و مقاصد اختیار کرنے کی نسبت ایسا صاف ہے کہ اس سے ہر شخص خیال کر سکتا ہے کہ صرف تجویز
کرنا اور تدبیر بتانا اس مجلس کا کام تھا، نہ کسی تجویز کا تعمیل کرانا۔ اس پر اگر کوئی کہے کہ مجلس نے کچھ کام نہیں
کیا وہ بعینہ ایسا ہی جیسا کوئی قانون بنانے والی کونسل کی نسبت کہے کہ اُس نے کوئی مقدمہ فیصل نہیں کیا۔
یا عمارت کی نقشہ بنانے والے پر یہ الزام لگا دے کہ اُس نے مکان نہیں بنایا۔ یا ڈاکٹر پر اعتراض کرے کہ
اُس نے نسخہ لکھا مگر بیمار اچھا نہ ہوا۔ ہاں اگر کوئی یہ کہے کہ مجلس کا قایم کرنا ہی بے سود اور لغو تھا تو یہ
اور بات ہے۔ مگر میرے نزدیک ایسی مجلس کی نہایت ضرورت تھی۔ اُس کے اغراض اور مقاصد بہت عمدہ
ہیں اس نے بہت عمدگی سے اپنا کام کیا اور قوم کو بہت فائدہ پہونچایا اس میں نہایت مفید رزولیشن
پیش کئے گئے۔ بہت خوبی سے اُس پر بحثیں ہوئیں۔ نہایت آزادی سے رائیں دی گئیں، اور بے نظیر
لیاقت سے تقریریں کی گئیں اور بہت سی تجویزیں قوم کو بتائی گئیں۔ اگر قوم کی حالت پیش نظر رکھ کر کانفرنس
کی کارروائی پر غور کیا جاوے۔ اور پچھلے سات برس کی روئدادیں انصاف سے دیکھی جاویں تو میرے
نزدیک کانفرنس کی کارروائی نہایت اطمینان کے لائق اور اس کی کامیابی مبارک بادی کی مستحق ہے۔

ہمارے پاس کانفرنس کی بدولت اس وقت ایک ایسا اچھا رکارڈ ہے اور دفتر موجود ہے جس کا جمع ہوتا
بغیر کانفرنس کے ممکن نہ تھا۔ اُس نے ہمارے لئے ایسا سامان اور مواد مہیا کر دیا ہے کہ اگر ہم اُسے کام
میں لاویں تو ہم بہت جلد ترقی کر سکتے ہیں۔ حقیقت میں کانفرنس نے قوم کے لئے راہیں تیار کر دی ہیں
اور تمام مشکلات کو اُن کے سامنے سے دور کر دیا ہے۔ اگر قوم اس پر چلنا شروع کرے تو وہ آج منزل مقصود
کو پہونچ سکتی ہے۔ اور نہ صرف راہوں کے تیار کرنے ہی پر اُس نے قناعت کی بلکہ قوم کو چلنے کی بھی
رغبت دلائی۔ غفلت کے بُرے نتیجے اُسے بتائے۔ سُست پڑے رہنے سے جو مصیبتیں اُس پر گزریں
وہ ظاہر کیں۔ پیچھے رہ جانے سے جن دردناک آفتوں میں وہ مبتلا ہونے والی ہے اُس کا ڈر دلایا۔
بزرگوں کی کہانیاں سُنا کر اس کے دل بڑھائے۔ گزشتہ زمانہ کی ثروت اور عزت کے قصّے کہہ کر
جوش دلایا۔ تاریخی واقعات بیان کر کے قوموں کی ترقی و تنزل کے اسباب بتائے۔ اوہام اور
تعصبات اور خیالات جو سیدھی راہ پر چلنے کے مانع تھے دلوں سے نکالے۔ میں نہیں سمجھ سکتا کہ کونسی

تدبیر ایسی ہے، جو قوم کے جگانے اور اُس کو ترقی کے راستہ پر چلانے کے لئے چاہئے تھی کہ اُس نے بتائیں کی۔ میرے نزدیک تو اُس نے اپنے فرائض کو بہت اچھی طرح انجام دیا۔ اور نہ صرف وہی کیا جو اسے کرنا چاہئے تھا بلکہ اُس سے بہت بڑھ کر کیا۔ اگر ہم اور باتوں سے قطع نظر کریں اور صرف ان نظموں اور لکچروں اور مضمونوں کو جو کانفرنس میں پیش ہوئے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ کانفرنس کی کوششیں بے کار نہیں گئیں۔ اور لوگوں نے بے فائدہ محنت نہیں کی۔ میں اُن لوگوں کو نہایت بے درد اور نامنصف سمجھتا ہوں جو ان چیزوں کو صرف شاعرانہ نظر سے دیکھتے ہیں اور اُسے قوم کے حق میں مفید نہیں سمجھتے۔ میرے نزدیک وہ لکچر جو مولانا مولوی نذیر احمد صاحب نے کانفرنس میں دیئے ہیں آب زر سے لکھنے کے لایق ہیں اور قوم کے دل کے پتھروں پر نقش کرنے کے قابل۔ آپ یقین کیجئے کہ اگر یہ لکچر یورپ اور امریکہ میں دیئے جاتے اور فرض کرو کہ وہ اس زبان کو سمجھ سکتے تو ہزاروں آدمی صرف اس کے سننے کے لئے جمع ہوتے لاکھوں روپیہ اُس پر نثار کرتے اور اُس سے اتنی آمدنی ہوتی کہ ہمارے محمڈن کالج کا ایک بڑا حصہ تیار ہو جاتا۔

صاحبو! یہ بھی کہا جاتا ہے کہ کانفرنس ایک مجمع ہے صرف نوتعلیم یافتہ اور نئے خیالات رکھنے والوں کا۔ نہ اُس میں علما، نہ مشائخ شریک ہیں، نہ امرا اور بزرگان قوم اس میں داخل ہیں اور اُس کی تجویزیں صرف ایک محدود اور مختصر فرقہ کی رائے ہیں نہ عام مسلمانوں کی ہیں اس کے جواب میں نہایت ادب سے کہتا ہوں کہ اگر کل قوم تعلیم یافتہ ہوتی، اور زمانہ کی ضرورتوں سے واقف اور اپنی ترقی کے وسائل مہیا کرنے کے لائق تو ایسی کانفرنس کی ضرورت ہی نہ ہوتی اور جب خدا کی مہربانی سے قوم کا ایک بہت بڑا حصہ تعلیم یافتہ ہو جاوے گا تو وہ وقت ہوگا کام کرنے کا نہ سوچنے کا، وہ زمانہ ہوگا ترقی کے نتیجوں کے دیکھنے کا نہ اُس کے اسباب جمع کرنے کا اور رغبت دلانے کا۔ وہ دن ہوں گے مبارکباد دینے کے نہ رونے اور رلانے کے۔ وہ وقت ہوگا فصل کاٹنے اور پھل کھانے کا نہ زمین جوتنے اور بیج بونے کا۔ ہم خود قبول کرتے ہیں کہ یہ مجمع ہے ایسے لوگوں کا جن کے خیالات نئے ہیں، جو تعلیم اور تربیت کا اصول سمجھتے ہیں، جو قومی ترقی کی تدبیریں جانتے ہیں، جن کو اپنی موجودہ حالت میں بہت کچھ اصلاح اور درستی کی ضرورت معلوم ہوتی ہے۔ مگر کوئی مہربانی کر کے مجھے بتائے کہ دنیا کی تاریخ میں کسی قوم نے بغیر ایسے فرقہ کے ترقی کی ہے۔ اور جب تک کہ کوئی قوم ترقی نہ کرے ایسے خیال کے لوگ کہاں کثرت سے پائے گئے ہیں۔

صاحبو! قوم کی ترقی کا آغاز ہمیشہ اسی طرح سے ہوتا ہے کہ پہلے کوئی عالی دماغ مستقل مزاج جس کا دل و دماغ

ایسے کام کے لئے بنایا گیا ہو، قوم کی اصلاح کے لئے آمادہ ہوتا ہے اور ایک ایک دو دو آدمی اُس کی باتیں سمجھنے اور اس کے کہنے پر چلنے اور اس کی تائید کرنے لگتے ہیں اور پھر رفتہ رفتہ اس کا ایک ایسا مختصر گروہ بن جاتا ہے اور وہ لوگ اپنے خیالات پھیلانا اور اپنی جماعت کو بڑھانا شروع کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ اُن کا اثر ساری قوم پر ہو جاتا ہے اور قوم ترقی کے درجہ پر پہونچ جاتی ہے۔ مگر صاحبو بغیر خیالات کے بدلنے، اور بغیر کسی شخص پیشوا ہونے اور بغیر کسی ایک مضبوط اور مستعد لوگوں کی جماعت قایم ہونے کے، اگر کسی قوم کی کبھی اصلاح ہوئی ہو، تو مجھے اُس کی نظیر بتایئے۔ غرض کہ صاحبو جو چیز الزاماً ہماری نسبت کہی جاتی ہے ہم اُس پر فخر کرتے ہیں اور کہنے والوں کا شکر۔

رہا یہ امر کہ بزرگانِ قوم اور علماء اور مشائخ اس میں شریک نہیں ہیں اسے میں تسلیم نہیں کرتا۔ جو لوگ ایسا کہتے ہیں ان کو چاہئے کہ ذرا تکلیف گوارا کریں، اور کانفرنس کی فہرست ملاحظہ فرمائیں، اور ایک لحظہ کے لئے اس ہال میں تشریف لائیں، اور مجھے بتائیں کہ اس سے بہتر مجمع مسلمانوں کا اُنھوں نے کہاں دیکھا ہے اور اس عزت اور درجہ کے مسلمان اور کسی قومی مجلس میں کہاں جمع ہوتے ہیں اور اگر فرض کیا جاوے کہ یہ مجلس بے سود اور صرف مجمع چند بگڑے خیالات کے لوگوں کا ہے، تو میں نہایت ادب سے پوچھتا ہوں کہ براہ مہربانی وہ مجلس مجھے بتایئے جو مسلمانوں کے لئے مفید اور سود مند ہو اور جہاں علماء، فضلاء، مشایخ اور اولیاء، امراء، اور دولتمند مسلمانوں کی بھلائی کے لئے جمع ہوتے اور اپنے وقت، عقل، اور دولت کا کچھ حصّہ اپنی قوم کے کام میں بھی لگاتے ہوں۔ اور اُس جگہ کا نام بتایئے جہاں ہم جا کر قوم کی ہمت اور اسلامی محبت اور قومی جوش کا ثبوت اور اُن کی عمدہ تدبیروں اور مفید کاموں کا نمونہ دیکھیں اور قوم کی ترقی کی امید کریں۔ اور ہم یہ بھی نہیں کہتے کہ آپ ہماری قوم کی توجہ دنیاوی ترقی کے کاموں میں دکھایئے اس لئے کہ نجس اور ناپاک چیز مسلمانوں کی توجہ کے قابل نہیں ہے۔ اَلدُّنْیَا جِیْفَۃٌ وَطَالِبُھَا کِلَابٌ یہ کام دنیا کے کتوں کا ہے اور نیچری فرقہ کے دنیا طلب لوگوں کا۔ مسلمانوں کی شان اس سے ارفع و اعلیٰ ہے۔ بلکہ وہ تدبیریں بتلایئے جو اُنھوں نے اپنے پاک اور پیارے دین کے لئے کیں ہوں اور ان کی اُس توجہ کا ثبوت دیجئے جو اُنھوں نے دین کی حمایت، اور اُس کی حفاظت، اور اُس کی اشاعت میں کی ہو۔ مغربی علوم پر خاک ڈالئے، انگریزی کو کفر سمجھئے۔ یورپ کی طرز کے کالج اور اسکولوں کو جانے دیجئے کہ یہ سب وہ چیزیں ہیں جو صرف چند روزہ دنیا کے کام آنے والی ہیں اور مسلمانوں کے اعتقادات اور خیالات کی بگاڑنیوالی مگر وہ مقامات بتایئے جہاں دین اور اسلام کی حفاظت کا بندوبست کیا گیا ہو، اور وہ مدرسے دکھلایئے جہاں دینی علوم کی تعلیم دی جاتی ہو۔ اور ان دارالعلوم کا نشان دیجئے جو بغداد اور قرطبہ کے نمونوں پر قایم

کئے گئے ہوں اور ان علماء کا نشان دیجئے جن کو صرف قوم کی توجہ اور فیاضی نے بچایا اور علمی مشاغل میں مشغول رکھا ہو، اور اُن طالب علموں کو دکھایئے جو صرف قوم کی مدد سے پرورش پاتے اور علم حاصل کرتے ہوں مگر افسوس صد افسوس کہ جہاں تک خیال کیا جاوے اور جس حصہ کو ہندوستان کے دیکھا جاوے، دین اور دنیا دونوں کا یکساں حال ہے۔ اگر ہم دیکھیں کہ مسجدیں آباد ہیں، خانقاہیں گرم ہیں، علماء اور فضلاء کا گروہ بدستور موجود ہے، پُرانے مدارس طلباء سے بھرے ہوئے ہیں تو ہم سمجھیں کہ صرف زہد اور تورع، دنیاوی علوم کی تحصیل، اور دنیاوی مدارس میں مدد دینے کی مانع ہے اور فقط پابندی شریعت کی، مغربی تعلیم کی مزاحم ہے۔ اور دینی خیال دنیاوی ترقی کا سدِ راہ ہے۔ مگر جب ہم دیکھتے ہیں کہ اس کا حال اس سے ہزار درجہ زیادہ برا ہے دینی مدارس قوم کی بے توجہی سے برباد ہیں۔ علماء فضلا بھوکوں مر رہے ہیں۔ دینی علوم کے تحصیل کرنے والوں کو کوئی بھیک کے ٹکڑے تک نہیں دیتا اور اگر کہیں کچھ نیک دل بزرگوں نے کوئی مدرسہ کھڑا کر لیا ہے۔ اور چند غریب طالب علم کابل اور بخارا کے جمع ہو گئے ہیں تو وہاں خاک اڑ رہی ہے اور قوم کی بے خبری کا نوحہ ہو رہا ہے۔ اور استاد و شاگرد دونوں بھوکوں مرتے ہیں تو اسے ہم کیا سمجھیں۔ مانا کہ ہم نے مغربی علوم کا شوق دلا کر مسلمانوں کو خراب کیا۔ مانا کہ ہم نے انگریزی تعلیم و تربیت کے جاری کرنے سے الحاد پھیلایا۔ مانا کہ ہم نے کانفرنس قایم کر کے مسلمانوں کو بہکایا مگر ہم پر طعنہ کرنے والے خدا کے لئے یہ بتا دیں کہ انھوں نے اپنی قوم کے لئے کیا کیا اور اس ڈوبتی ہوئی کشتی کے بچانے میں کون سی کوشش کی اگر ہم نے مسلمانوں کے لئے دیر و کنشت بنایا، مانا کہ گناہ کیا۔ مگر یہ فرمایئے کہ اُن کا بنایا ہوا بیت المقدس کہاں ہے جہاں جا کر ہم سجدہ کریں اگر ہم نے اپنے بھائیوں کے واسطے قومی کانفرنس قایم کی، ہم قبول کرتے کہ ایک بے سود کام کیا مگر ہمارے دوست براہ مہربانی یہ فرماویں کہ انھوں نے قوم کے حال پر مرثیہ پڑھنے، قوم کی مصیبت پر ماتم کرنے پر کون سی مجلس بنائی ہے کہ ہم وہیں جا کر نوحہ کریں اور سر پیٹیں۔ ہم اگر مضر یا بے سود کام کرنے کے گناہگار ہیں، تو قوم کو مرتے دیکھنے اور کچھ نہ کرنے کا ذمہ دار کون ہے؎

گر دسر تو گشتن و مردن گناہِ من | دیدن ہلاک و رحم نکردن گناہ کیست
گیرم کہ وقت ذبح طپیدن گناہِ من | دانستہ دشنہ تیز نہ کردن گناہِ کیست

غرضیکہ اے میرے بھائیو! یہ الزام جو ہم پر لگایا جاتا ہے اور وہ طعنے جو ہم پر کئے جاتے ہیں، نہ دینداری کے خیال سے ہیں نہ مذہب کے لحاظ سے بلکہ درحقیقت غفلت اور کاہلی کا نتیجہ ہے کہ نہ پُرانے طریقوں پر قوم کے لئے کچھ کرتے ہیں نہ دینی کاموں میں اپنی مستعدی کی نشانیاں دکھاتے ہیں نہ نئی راہ پر چلنے کے لئے اُن کا قدم اُٹھتا ہے۔ نہ دوسروں کا چلنا پسند کرتے ہیں۔ غرض کہ نہ خود کریں نہ دوسروں کو کرنے دیں۔ ایسے

لوگوں کی باتیں سُن کر رنجیدہ ہونا اور طعن و طنز سن کر پریشان ہونا ہمّت والوں کا کام نہیں ہے۔

اے میرے بھائیو! کیا آج تک کوئی بڑا کام بغیر طعنوں کی برداشت کرنے اور دل فگار باتوں کے سننے کے کہیں دنیا میں ہوا ہے؟

صاحبو! قومی اصلاح اور قومی ترقی کوئی آسان کام نہیں ہے بلکہ اس دنیا کے تمام کاموں میں اور سب سے زیادہ مشکل، نازک اور تکلیف دہ ہے۔ حقیقی اصلاح اور سچی ترقی، دینی اور دنیوی اصلاح، اور معاش اور معاد کی فلاح، یہ کام صرف پیغمبروں کا ہے۔ مگر دنیوی اصلاح اور دنیوی ترقی بھی ایسی مشکل ہے کہ اس کے لئے بھی خدائے تعالےٰ خاص لوگوں کو پیدا کرتا اور اس کے لائق اُن کے دل و دماغ بناتا ہے۔ مگر پیغمبر ہوں یا مصلحانِ قوم، خدا نے سب کے لئے یہ قاعدہ رکھا ہے کہ ان کی کوشش کو منزلِ مقصود تک پہونچنے میں بہت سے درجے طے کرنے پڑتے ہیں۔ اول اُن کا مضحکہ اُڑایا جاتا ہے اور ایک ناممکن کام کے خیال سے وہ دیوانے ٹھیرائے جاتے ہیں پھر اُن پر طعن و طنز ہوتے ہیں۔ پھر ان پر تہمتیں کی جاتی ہیں، اور اُن کے ارادے بدنیتی پر محمول کئے جاتے ہیں۔ پھر ان کے مقاصد میں غلط بیانیاں کی جاتی ہیں۔ پھر کچھ کچھ باتیں ان کی سمجھ میں آنے لگتی ہیں اور ان کے کاموں کی عظمت اور وقعت کا خیال ہونے لگتا ہے اور آخر مفید سمجھ کر لوگ مدد دیتے ہیں اور اس کی کامیابی دیکھ کر تعجب کرتے اور خود ہی کہتے لگتے ہیں کہ پہلے کیوں ہم ایسا نہ سمجھے، اور کیوں اوّل ہی اس کام میں شریک نہ ہوئے۔

اے میرے بھائیو! یہ وہ واقعات ہیں جو ہر ایک اصلاح کرنے والے کو پیش آتے ہیں اگر آپ کی مجلس کا مقصود قومی اصلاح اور قومی ترقی ہے تو آپ کو بھی تمام درجات کے طے کرنے اور اُن تمام دشوار گزار گھاٹیوں سے گزرنے کے لئے آمادہ رہنا چاہیئے۔ مگر آپ بڑے خوش نصیب ہیں کہ آپ کو ایسے سکرٹری ملے ہیں جو آپ کی طرف سے سب مصیبتیں اٹھا چکے ہیں اُن کا مضحکہ اُڑ چکا، اُن پر طعنے ہوئے، وہ دیوانہ اور سودائی بن چکے، خود غرضی کا الزام ان پر لگ چکا تہمتیں جتنی ہونی چاہیئیں اُن پر ہولیں۔ مسلمان ہو کر وہ کافر بھی ٹھیر چکے۔ ان کے مقاصد میں غلط بیانیوں کی کوئی حد بھی نہیں رہی۔ اب وہ اس درجہ پر ہیں۔ جہاں مصیبتوں کا خاتمہ ہوتا اور اس کے نتیجوں کے دیکھنے کا دور شروع ہوتا ہے۔ اب لوگ ان کے کاموں کی قدر کرتے ہیں ان کی بات سنتے ہیں۔ اُن کی وقعت اور عزت کرتے ہیں اُن کو اپنا رہنما جانتے ہیں۔ پس اے میرے دوستو باوجود ان تمام مشکلات کے طے ہو جانے اور آپ کو ایک فدیہ میں مل جانے کے اگر آپ صرف چند طعن آمیز باتیں سننے سے رنجیدہ ہوں گے اور اس مجلس کی کامیابی کی نسبت شک کرنے لگیں گے تو مجھے تعجب ہوگا۔ آپ کو چاہیئے کہ آپ استقلال سے کام کریں اپنی محنتوں کی کامیابی پر بھروسا رکھیں کیوں کہ جس قدر آپ اپنے فرائض سے

زیادہ واقف ہوں گے، جس قدر آپ میں ہمدردی کا جوش زیادہ ہوگا، جس قدر آپ انسانیت کا زیادہ خیال رکھیں گے، جس قدر آپ قوم کی زیادہ فکر کریں گے اور جس قدر آپ کا علم زیادہ ہوتا جاویگا آپ اپنے آپ کو زیادہ تکلیف میں پاویں گے، اور آپ پر زیادہ مصیبتیں نازل ہوں گی۔

بھائیو عقل، علم اور انسانیت، یہ خود مصیبت کے اسباب ہیں اور ہر شخص کو اس دنیا میں اسی قدر تکلیف اٹھانی پڑتی ہے جس قدر اس میں عقل اور علم ہے۔ کاش ہم انسان نہ ہوتے تو ان مصیبتوں میں سے ایک مصیبت بھی نہ اٹھانی پڑتی۔ یہ وہ امانت خدا کی ہے جسے نہ آسمان اٹھا سکا نہ زمین۔ نہ پہاڑ ہم نے نادانی سے اُٹھالیا۔ اور ظالم وجاہل ٹھیرے۔ اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَۃَ الخ ؎

آسماں بار امانت نتوانست کشید

قرعۂ فال بنام من دیوانہ زدند

صاحبو! مجھے وہ دن یاد ہیں جب ہم لوگ غفلت کی بہشت میں رہا کرتے تھے، نہ اپنی خبر تھی نہ دوسرے کا خیال۔ نہ قوم سے مطلب تھا نہ مدرسے سے غرض نہ مسلمانوں کی دردناک صورت ہم کو دکھا کر نہ کوئی ستاتا تھا، نہ ہائے قوم اور وائے قوم کی آواز ہمارے کان تک پہنچتی تھی نہ کوئی چندہ مانگنے والا تھا نہ کانفرنس میں بلانے والا۔ بے خبری کے نشہ میں مست پڑے ہوئے کہا کرتے تھے ؎

بہشت آں جا کہ آزارے نباشد

کسے را با کسے کارے نباشد

اور اپنے پیشواؤں کے مشکور رہتے تھے جنھوں نے اوہام کا سنگین پہرا علم کے درخت پر کھڑا کردیا تھا اور ہم کو وہاں تک جانے نہ دیتے تھے کہ اس میں ہمارے سر سید سامنے آئے اور یہ آواز دی هَلْ اَدُلُّكَ عَلٰى شَجَرَةِ الْخُلْدِ وَمُلْكٍ لَّا يَبْلٰى، انھوں نے ہم کو علم کا درخت دکھایا اور اس کے پھل کھانے کی رغبت دلائی ان کا یہ کہنا تھا کہ ہمارے بزرگ چلّانے لگے کہ خبردار اس کے پاس نجانا اور ان کی بات نہ سننا۔ "اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ" اور چاروں طرف سے آواز آنے لگی کہ "لَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ" مگر یہ بھی مزاج کے ایسے مستقل اور اپنے ارادے کے ایسے مضبوط تھے کہ ترغیب دیتے اور یہ کہتے رہے کہ تم حقارت کرو یا ملامت، زجر کرو یا توبیخ، میں تو ضرور علم کا پھل اپنی قوم کو کھلاؤں گا اور بغیر اس کے کھلائے نہ مانوں گا۔ آخر انھوں نے اپنا کہا پورا کیا اوہام کا پہرہ علم کے درخت پر سے اٹھا دیا اور لوگوں کو اس کا پھل کھلایا۔ وَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيْهِ جن لوگوں نے وہ پھل کھایا نیکی وبدی کو پہچاننے لگے۔ اور اس گناہ میں غفلت اور بے خبری

کی بہشت سے نکالے گئے۔ وہ اپنے آپ کو ننگا دیکھ کر شرمندہ ہوئے اور اپنی عریانی چھپانے کی فکر کرنے لگے۔ بھائیو یہ مصیبتیں کیوں ہوئیں۔ اگر ہم نیکی و بدی کی تمیز کا درخت نہ دیکھتے اور اپنے بزرگ سرسید کے کہنے سے اس کا پھل نہ کھاتے۔ ایک ان کی بات کے سننے سے یہ ساری مصیبتیں گلے پڑیں۔ اب ہم ہیں اور طرح طرح کی تکلیفیں، قومی ہمدردی، قومی محبت، قومی ترقی، قومی تعلیم، قومی تربیت، قومی اصلاح اور خدا جانے کتنے عذاب۔ گھر چھوڑنا۔ سفر کی مصیبت اُٹھانی۔ کانفرنس میں آنا۔ چندہ دینا اور پھر بُرا بھلا سُننا۔

من گریۂ آتشیں نمی دانستم　　من آہ دل حزیں نمی دانستم
نے نام بمن گزاشتی و نہ نشاں　　اے عشق ترا چنیں نمی دانستم

مگر جب کہ ہم نے خود ان مصائب کو قبول کیا، تو اُسے اب مردانہ وار برداشت کرنا چاہئے۔ تاکہ وہ دوامی راحت، اور لازوال خوشی، ہم کو نصیب ہو جو نتیجہ ان تکلیفوں کا اور ثمرہ ان مصیبتوں کا ہے۔ مگر صاحبو اس کے لئے صبر اور وقت کا انتظار ضرور ہے۔ میں ان لوگوں کو نتیجہ دیکھنے کی امید نہیں دلا سکتا جو صبر نہیں کرتے، اور نہ اُن مایوس طبیعتوں کو پھل کھانے کا متوقع کر سکتا ہوں جو وقت کا انتظار نہیں کر سکتے ایسے لوگ کامیابی کے مستحق نہیں ہوتے۔ زمانہ ان کی خواہشوں سے اپنی رفتار بدل نہیں سکتا۔ قدرت کے قانون میں ان کی بے صبری سے کچھ تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ وقت سے پہلے کوئی بیج اپنا پھل نہیں لاتا نہ کسی کی بے صبری سے کھیتی قبل از وقت تیار ہو سکتی ہے پس اے بھائیو جو لوگ ہماری کانفرنس کے عملی نتائج کے ظاہر نہ ہونے سے مایوس ہوتے اور اُسے غیر مفید سمجھتے ہیں اُن کو کسی کاشتکار سے جا کر سبق لینا چاہئے تاکہ معلوم ہو کہ صرف بیج ڈالنا پھل پانے کا مستحق نہیں کرتا۔ زمین میں بیج ڈالنے سے فصل کے تیار ہونے تک کئی درجے طے کرنے پڑتے ہیں۔ پانی دینا، گھاس صاف کرنا (کسانوں کی اصطلاح میں جس کو نلائی کہتے ہیں) پرند اور چرند سے بچانا ہوتا ہے۔ اور ان سب باتوں کے پورا کرنے کے لئے بہت بڑی محنت درکار ہے اور بہت کچھ صرف کی ضرورت۔ اور سب سے بڑھ کر کھیتی کا آفات ارضی و سماوی سے محفوظ رہنا اور اس کے لئے خدائے ذوالجلال سے دعا کرتے رہنا۔ پھر یہ محنت اور صرف اور انتظار اُتنا ہی زیادہ ہوگا جتنی کہ جنس لطیف اور عمدہ ہوگی۔ میں نے کسی کاشتکار کو نہیں دیکھا کہ وہ ان چیزوں کے تیار کرنے میں جو اس جسم خاکی کی غذا ہے صرف زمین میں دانے ڈال دینے پر قناعت کرتا اور ان تمام ضروری باتوں سے جو کھیتی کے تیار ہونے تک مطلوب ہیں غافل ہوتا اور پیش از وقت اپنی محنت کے نتیجے پانے کی امید رکھتا ہو۔ پس اے میرے بھائیو جس شخص نے روح کی غذا

تیار کرنے کا ارادہ کیا ہو اور جیسی جنس لطیف پاکیزہ اور نازک زراعت شروع کرنے کا ارادہ کیا ہو وہ بیج ڈالنے کے دوسرے دن اگر اس کے پھل کھانے کا متوقع ہو تو سوائے بوالہوسی اور دیوانگی کے اس کی امید کو آپ کیا کہیں گے یہی حال ہماری اس کانفرنس کا ہے کہ چند آدمیوں نے مل کر علم کی زراعت کا ارادہ کیا۔ انھوں نے ایک بڑے گھنے جنگل کو کاٹا اُسے خار دار درختوں سے صاف کیا۔ اس کے ایک گوشہ کو کھیتی کے لائق بنایا اور اب اس میں بیج ڈالا ہے۔ فصل تیار ہونے کا وقت ابھی دور ہے۔ تمام درجے محنت، صرف اور نگرانی اور حفاظت کے ابھی باقی ہیں، اس پر بعض لوگ ایسے ہیں کہ زراعت کے تیار نہ ہونے شاکی، اور اپنی محنت کے پھل نہ ملنے پر مایوس ہیں۔ میرے نزدیک یہ وہ لوگ ہیں جن کو از روئے قانون قدرت کے بالضرور مایوس ہونا چاہیے اور جن کی کامیابی بموجب قواعد قطرت کے ناممکن ہے

عمرہا باید کہ تا یک پنبہ دانہ ز آب و گل   شاہدے را حلہ بخشد یا شہیدے را کفن

روزہا باید کہ تا یک مشت پشم از پشت میش   زاہدے را خرقہ گردد یا حمارے را رسن

اے میرے بھائیو! ابھی ہم لوگ نہایت نازک حالت میں ہیں، اور ہمارا زمانہ نہایت خطرناک ہے ہم امید اور یاس کے بیچ میں چل رہے ہیں۔ جب ہم دیکھتے ہیں کہ قوم کے خیالات میں کچھ تغیر ہو گیا ہے وہ اپنی حالت سے واقف اور اُس پر متاسف ہے اور سب کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی ہے کہ موجودہ حالت دردناک ہے۔ اور اُس کا بدلنا قوم کی زندگی کے لئے ضروری ہے تو ہم کو بہت کچھ امید ہوتی ہے اور پھر جب ہم ایسے گروہ کو دیکھتے ہیں جو قوم کی ترقی کی تدبیروں میں سرگرم ہے اور اُس کی اصلاح اور بہبودی کی فکریں کر رہا ہے، اور اُن میں ایک جوش قوم کی بھلائی کا پیدا ہو گیا ہے تو آئندہ کے لئے اور بھی دل خوش کن امیدیں نظر آتی ہیں۔ مگر جب اس بات پر نظر جاتی ہے کہ بمقابلہ قوم کے یہ فرقہ بہت قلیل ہے اور ابھی اس میں بہت کچھ کرنا باقی ہے تو قوم کی ترقی سے ناامیدی ہوتی ہے۔ اس لئے کوئی نہیں کہہ سکتا ہے کہ ہماری قسمت میں آیندہ کیا لکھا ہے۔ ہم اپنے مقصود پر کامیاب ہوں گے یا ہماری کوششیں ضائع اور رائگاں جائیں گی۔ مگر جس راستہ پر ہم نے چلنا شروع کیا ہے وہ سیدھا راستہ ہے اور سیدھی راہ پر چلنے والا اگر برابر چلتا رہے، بلاشبہ منزل مقصود پر پہونچتا ہے۔ اس لئے ہم کو بھی امید ہے کہ ہم ضرور اپنے مقصد پر کامیاب ہوں گے۔ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُضِیۡعُ اَجۡرَ الۡعَامِلِیۡنَ

اے میرے دوستو! میں نے آپ کا بہت وقت صرف کیا اور میں نے اپنی پریشان تقریر سے آپ کو بہت پریشان کیا۔ میں اپنی کرسی پر بیٹھتا ہوں اور آٹھویں سال کے کانفرنس کے کھلنے کا اعلان کرتا ہوں۔

اجلاس نہم

(منعقدہ علی گڑھ ۱۸۹۴ء)

صدر جلسہ: میاں محمد شاہ دین بی اے خان بہادر بیرسٹر ایٹ لا

حالاتِ صدر

اس زمانہ میں "میاں خاندان باغبان پورہ" کے نام سے جو تعلیم یافتہ خاندان مضافات لاہور موضع "باغبان پورہ" میں متصل باغ شالامار آباد ہے، میاں محمد شاہ دین مرحوم اسی خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ مشہور رہے ہے کہ جب شاہ جہاں نے باغ شالامار کی بنیاد رکھی اور ایوان و قصور بن کر تیار ہوئے تو باغ کی حفاظت اور محلات کی نگہبانی کے فرائض میاں صاحب کے آبا و اجداد کے سپرد کیے گئے اور اسی مناسبت کے لحاظ سے ان کا مقام سکونت جو ایک گاؤں کی حیثیت رکھتا تھا، باغبان پورہ کے نام سے موسوم ہوا جو اب بھی اس نام سے ایک مشہور و معروف تعلیم یافتہ خاندان کی کالونی کی طرح آباد ہے۔ میاں محمد شاہ دین ۱۸۶۸ء میں پیدا ہوئے اور پچاس برس کی عمر پاکر جولائی ۱۹۱۸ء میں فوت ہو گئے۔ ڈاکٹر سر اقبال نے تاریخ وفات لکھی۔

در گلستان دہر ہمایوں نکتہ سنج	آمد مثال شبنم و چوں بوئے گل رمید
می جست عندلیب خوش آئند سال فوت	علامۂ فصیح زہر چہار سو شنید

اس خاندان کی موجودہ تعلیمی ترقی اور اصلاح خیال کا باعث میاں ظہور الدین صاحب کی کوششیں ہیں، جو کامیاب وکیل زمانہ شناس اور صاحب تدبیر شخص ہونے کے علاوہ میاں محمد شاہ دین کے بڑے بھائی بھی تھے۔ مگر جس شہرت اور عزت کے لحاظ سے یہ خاندان اس وقت روشناس عالم ہے



آنریبل مسٹر جسٹس محمد شاہ دین
صدر اجلاس نہم کانفرنس (علی گڈہ سنہ ۱۸۹۴ ع)

وہ میاں محمد شاہ دین کی ہمت افزائی عمدہ خیالات کی رہبری اور ہمدردی کی وجہ سے ہے جنھوں نے اُ
عمدہ تعلیم بہتر اخلاق پاکیزہ خیالات کا بیش بہا نمونہ اپنے خاندان کے سامنے پیش کر کے اس کا درجہ
بلند کرنے میں کافی طور سے مدد کی۔

مسلمانوں میں جب حسنِ عمل کا ذوق تھا اور جب ان کی اخلاقی قوت ترقی پر تھی تو ان میں کا ہر فرد اپنے
قبیلے اپنے کنبے کی عزت اور توقیر کی خیر منا تا تھا اور اس کی اخلاقی اور علمی سطح کو بلند کرنا اپنی زندگی کا مقصد عظ
تصور کرتا تھا۔ برادری اور کنبے کے اغنیا اپنی دولت سے اہلِ علم اپنے علم و دانش سے کم زور د
کی مدد اور ان کے خیالات کی رہ نمائی کر کے اپنے توازن قوت کو برقرار رکھنے کی کوشش کرتے رہتے
تھے اور اس طرح پر ساری کی ساری قوم میں توانائی اور مضبوطی کے جوہر نظر آتے تھے۔ لیکن اب جب
اپنی ذاتی بھلائی کے ذرائع اور اسباب فراہم کرنے میں بھی کوتاہ بینی ہے، اس لئے برادری اور کنبے
کی عزت و ناموس اور ترقی علم و عمل و فلاح دارین کا خیال ہی خیال باقی رہ گیا ہے۔

باندک غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بیسیوں خاندان برادریاں اور گھرانے جو اپنی قابلیت
اور اوصاف کی وجہ سے شہرت دوام کا درجہ حاصل کر چکے تھے علمی بے مائیگی اور اخلاقی پستی نے ا
ان کو ایسا گمنام و بے نشان بنا دیا ہے جن کے اُبھرنے اور ترقی کرنے کی کوئی امید نہیں۔ قطرت الٰہ
سرگرم عمل ہے اور مسلمانوں کے گھرانے قعرِ مذلت میں ہیں کہ فنا ہوئے جاتے ہیں ؎

یاد رکھو دوستو سنت ہے یہ اللہ کی ۔۔۔ جو نہ بدلی ہے نہ بدلے گی الی یوم القرا
جو بڑھے گا حوصلہ اس کا بڑھایا جائیگا ۔۔۔ جو گرے گا اپنے درجہ سے گرایا جائیگا

میاں محمد شاہ دین نے جس طرح اپنے خاندان، اپنے اعزاء، اپنی برادری میں اکتساب علوم کا عز
ارادہ کا جوش پیدا کر کے اور اپنے بہترین فضائل کا نمونہ پیش کر کے ان میں تحصیل علم کی رغبت اور خواہش
کے نتیجہ میں زندہ دلی اور خوش حالی پیدا کرنے کی سعی کی تھی کاش اسی طرح قوم کے دوسرے نامور
تعلیم یافتہ اصحاب اپنے اپنے خاندانوں اور گھرانوں میں اسی قسم کی اصلاح اور کوشش میں مصروف ہوتے
یا ہوں تو مسلمانوں کے تعلیمی تنزل اور اس کی وجہ سے بے کاری، مفلسی اور بے زری کے دور کرنے کا
مسئلہ بڑی حد تک فیصل ہو کر ہر شہر اور قصبہ میں قومی قوت اور زندگی کے خوشگوار آثار ظاہر ہو سکتے تھے

میاں محمد شاہ دین بچپن سے مہذب، متین اور محنتی طالب علم تھے۔ اُنھوں نے ابتدائی تعلیم
درجوں سے بی اے تک تمام امتحانات میں خصوصیت کے ساتھ کامیابی حاصل کی ۱۸۸۶ء میں بغرض تکمیل تعلیم
قانون انگلستان گئے۔ وہ لاہور بار ایسوسی ایشن میں کامیاب بیرسٹر اور ماہر قانون شخص تسلیم ہوتے

سنجیدگی، تہذیب اور متانت رائے کی وجہ سے سوسائٹی میں ان کی خاص طور پر عزت کی جاتی تھی۔ ان کی قابلیت کی شہرت نے ان کو لاہور ہائی کورٹ کا جج بنایا جنھوں نے اس عہدے کی وقعت کے لحاظ سے جج کے فرائض بطریق احسن انجام دیئے اور جس کی وجہ سے برٹش عہدہ دار بھی ان کو امتیاز کی نظر سے دیکھتے تھے۔ شرع محمدی میں ان کی قابلیت خصوصیت سے مسلّم تھی۔

وہ انگریزی اور اردو دونوں زبانوں کے خوش بیان مقرر تھے۔ ان کی تقریریں اصابت رائے کے لحاظ سے بھی خاص طور پر وزن دار ہوتی تھیں۔ وہ بولتے کم تھے اور سوچتے بہت تھے۔ قومی تعلیم اور قومی ترقی کے خیال سے بھی ان کو خاصی دل آویزی تھی اور وہ ہر ایسے کام کو اور ایسے مقصد کو جس کا تعلق قومی بہبودی سے ہو یا خیر عامہ سے جس کا لگاؤ ہو اس کو دل سے پسند کر کے اس کی اعانت میں شریک ہو جاتے تھے۔ وہ شاعر بھی تھے۔ "ہمایوں" تخلص کرتے تھے۔ ان کا کلام باعتبار زبان اور خیالات کی صفائی کے جذبات سے معمور نظر آتا ہے۔

چھبیس برس کی عمر ہی کیا ہوتی ہے۔ عموماً یہ زمانہ تو طالب علمی ہی میں بسر ہوتا ہے۔ لیکن وہ اسی عمر میں ۱۸۹۴ء میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے صدر منتخب ہو کر علی گڑھ آئے اور انھوں نے نہایت بلیغ خطبہ مسئلہ تعلیم پر دیا۔ بوجہ ان کے آثار لیاقت کے خود سرسید مرحوم نے ان کو اس منصب کے لئے منتخب کیا تھا اور یہ انتخاب ان کی قابلیت کے اعتراف میں سب سے بڑی عزت تھی۔

انیس برس بعد ۱۹۱۳ء میں وہ دوبارہ اس مجلس کے آگرہ میں صدر ہوئے۔ ان کے خطبات کے ملاحظہ سے ناظرین کو معلوم ہوگا کہ مسائل تعلیم سے ان کی واقفیت کس قدر گہری تھی۔ ان کی حساس طبیعت اور دماغی افکار کس قدر زود رس تھے کہ جن واقعات و حالات پر مشکل سے دوسروں کی نگاہ پہونچتی تھی ان کا نزدیک نگاہ آثار و علامات سے اس کی حقیقت کو معلوم کر لیتا تھا۔ قدرت نے ان کو غیر معمولی طور پر دماغی قوت عطا کی تھی۔ لیکن اس کے مقابلہ میں جسمانی حیثیت سے وہ ہمیشہ کے کمزور اور لاغر اندام نحیف البتہ پستہ قد تھے۔ اور اس واسطے ان کی صحت بہتر حالت میں نہ تھی۔ حتیٰ کہ پچاس برس کی عمر بھی نہ پائی۔

بے شبہ جدید تعلیم و تہذیب کے لئے وہ ایسی عمدہ مثال تھے جن کی جگہ اب تک خالی نظر آتی ہے اور عرصہ دراز تک امید نہیں کہ اس عالمانہ شان کے باوقار طالب علم ہماری یونیورسٹیاں پیدا کر سکیں جو قوم اور ملک دونوں کے لئے بیش قیمت سرمایہ تھے اور اپنے خاندان اور برادری کے لئے تو ابر رحمت سے کم نہ تھے۔

نوٹ۔ یہ حالات اس مضمون کا اقتباس ہیں جو میاں بشیر احمد صاحب بی اے بیرسٹرایٹ لا خلف میاں شاہ دین صاحب مرحوم کے حالات میں رسالہ ہمایوں جلد نمبر ۱ میں لکھ کر شائع کیا ہے۔

خطبۂ صدارت

جناب سر سید احمد خاں بہادر و دیگر بزرگان قوم! اس وقت جب کہ میں آپ صاحبان کے روبرو اس عظیم الشان کانفرنس کے پریسیڈنٹ کی حیثیت میں کھڑا ہوں حیرت زدہ اور پریشان دل میں دو قسم کے خیالات گزر رہے ہیں۔ ایک تو یہ خیال ہے کہ مجھ سا کم سواد اور بلا علمیت بے سر و سامان آدمی جو کہ اس جلیل القدر عہدہ کے اہم فرائض کے ادا کرنے کے لئے ہر صورت سے نا قابل ہے کیوں کر اس قومی مجمع کے میر مجلس ہونے کے لائق سمجھا گیا اور دوسرے یہ خیال کہ مجھے خود کیوں کر اس قدر گستاخانہ جرات ہوئی کہ آج اپنے تئیں اس قومی گھر میں برگزیدہ اہالیان قوم کی اس مقتدر کانفرنس کی طرف بحیثیت چیرمین مخاطب دیکھ رہا ہوں۔ ایک طرف یہ پار عب قومی اجلاس جس کی شان ایک عالم متبحر کے علمی رتبہ سے بھی بلا شک بدرجہا اعلیٰ ہے اور اس کے مقابلہ میں یہ میری کم استعدادی

ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا

ایسی حالت میں مجھے گویا بازو سے پکڑے ہوئے کھینچ کر کرسی نشینی کی عزت بخشنا، فرمائیے تعجب اور حیرت کا مقام نہیں تو کیا ہے۔ یہ میرے اپنے پاؤں نہیں جو سیکڑوں کوس کی مسافت طے کر کے اس قدر تجملات کا سامان دکھانے کے لئے مجھے اس مقدس بیت العلوم تک لائے ہیں اور نہ ریل ہی کا اسٹیم انجن ہے جو ایک افسردہ دل میں متحرک ارادے کا کام دے سکے۔ ہاں اگر کچھ ہے تو ایک زبردست ہاتھ کا دور سے اشارہ ہے جو اپنی مقناطیسی طاقت سے مجھے بھی اور احباب کے ساتھ اس علمی مرکز کی طرف کھینچ لایا ہے اور جس کی دلفریب کشش کا روکنا شاید ممکن تو ہو مگر میرے دل و جگر کا کام نہیں۔ فی الحقیقت میں اپنے تئیں نہایت خوش قسمت سمجھتا اگر آپ صاحبان کی طرح مقابل کی ایک کرسی پر اس خوشنما ہال کے کسی کونے میں مجھے بھی دو انچہ کی جگہ ملتی جہاں خوب ہلکے دل سے علماء قوم کی نظم و نثر سن کر میں بھی آرام سے کروٹیں بدلتا۔ مگر نہ معلوم کس شامت اعمال کا مارا ہوں کہ پریسیڈنٹ ہونے کی معزز سزا میرے ہی لئے تجویز کی گئی۔ گویا کہ بینایان قوم ایک اندھے کوراچہ بینا کر بھری مجلس میں اس سے پوچھتے ہیں کہ ہمارا آج ذرا ابتلائے جانے کا سیدھا راستہ کون سا ہے مگر

او خویشتن گم است کرا رہبری کند۔

اے برادران اسلام۔ مجھے اس قومی کانفرنس کے صدر انجمن کئے جانے سے جس قدر

عزت حاصل ہوئی ہے اُسے خود اس عزت کے بخشنے والے میرے عنایت فرمایانِ قوم جو اس جلسہ گاہ میں تشریف فرما ہیں بخوبی اندازہ کر سکتے ہیں۔ میں کون ہوں کہ آپ کی شکرگزاری سے عہدہ برا ہونے کی جرات کروں۔ اس بے نظیر عزت کے باعث جو دلی خوشی مجھے اس موقعہ پر حاصل ہوئی ہے اسے میں عمر بھر کے لئے اپنی زیست کی چاشنی سمجھوں گا۔ مگر ہاں معاف فرمایئے گا اس وقت یہ خیال دامن گیر ضرور رہے اور ہمیشہ کے لئے اس کی یاد رہے گی کہ آپ کی عنایت سے مجھے عزت اور خوشی تو ہوئی مگر کاش میرا صدر انجمن ہونا کانفرنس کے لئے بھی عزت و انبساط کا باعث ہوتا۔ آپ کی بزرگانہ شفقت سے اس وقت میرا پلّہ بھاری تو ضرور ہے مگر ڈر ہے کہ مبادا میری ناقابلیت کی وجہ سے کانفرنس کا یہ اجلاس موزوں کارروائی کی میزان میں کہیں پورا نہ اُترے۔ میرے جیسے صدر انجمن کی نسبت اُستاد حالی فرما چکے ہیں ؎

یہ ہے میر مجلس کی چینی کی صورت
ٹٹولو تو ہیچ اور جو دیکھو تو سب کچھ

اے صاحبان! میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ مجھے اس عزت نشان عہدے کے منظور کرنے کی کبھی جرات نہ ہوتی اگر مجھے اس امید کا سہارا نہ ہوتا کہ میرے فرائض منصبی کے ادا کرنے میں آپ میری بے دریغ دوستانہ امداد فرمائیں گے اور اس لئے نہ فقط آپ کی بزرگانہ امداد پر مجھے ہر طرح بھروسا ہے بلکہ میں بکمال ادب آپ سے ملتجی ہوں کہ اگر میری خدمات کی درست بجا آوری میں مجھ سے کسی قسم کی کوتاہی سرزد ہو تو آپ بہ لطف کریمانہ میری عیب پوشی فرمادیں۔

اے برادرانِ قوم قبل ازیں کہ آپ کو مقاصد کانفرنس کی طرف خاص توجہ دلائی جائے میرا سب سے پہلا اور سب سے خوش آیند فرض ہے کہ آپ کی اُس اخوت، قومی استقلال مزاج، علو ہمتی اور سرگرمی کا تہ دل سے شکریہ ادا کروں جن کی بدولت آج ہم اس عظیم الشان ہال میں اس کانفرنس کا نواں اجلاس شروع کرنے کو ہیں۔ مسلمانان ہندوستان کی تعلیمی ترقی کی تاریخ میں خیال کرتا ہوں کہ مبارک ومسعود واقعہ ہمیشہ کے لئے یادگار رہے گا کہ چند بیدار مغز بہی خواہانِ قوم نے ۱۸۸۶ء میں ان بیت العلوم میں ایک ایسی قومی کانفرنس (مومنٹ) کی بنیاد ڈالی جس کا نیک اثر بہت سے مایوس دلوں کے حوصلوں سے بڑھا رہا ہے جس کے طفیل قوم اپنی منتشر قوتوں کو جمع کرنے کے موقعے پیدا کر رہی ہے جس کے باعث ایک ضلع کے اہل دوسرے ضلع اور ایک صوبہ کے مسلمان دوسرے صوبہ کے مسلمانوں سے مل کر تبادلہ خیالات کے ذریعہ سے نہ صرف قومی اتحاد کو مضبوط کرتے ہیں بلکہ اپنی مقامی یا عام تعلیمی

ضرورتوں کے رفع کرنے اور رفتار زمانہ کے مطابق چلنے کی سب سے بہتر عملی تدابیر سوچتے ہیں جس کا
وجہ سے وہ خوش اسلوب زمانہ آنے والا ہے جب کہ بہت سے پنبہ درگوش لوگوں کو عالم بالاسے
رعد کی سی کڑکتی آواز سنائی دے گی ع اُٹھو سونے والو سحر ہو گئی - اور قوم جو ابھی تک کچھ ایسی سو
تھی کہ گویا حشر تک جاگنا اُسے قسم تھا- آنکھیں مل کر میٹھی نیند کی چادر اٹھا کر جب دیکھے گی کہ آفتاب سر
آگیا تو مستوں کی طرح ایک انگڑائی لے گی اس کے اعضاء میں جو خواب کی بیکاری کی وجہ سے کم زور
ہو گئے تھے ایک رسیلی سی حرکت پیدا کی تھی کہ اُن کا متحرک کرنا قوم کو باعث انبساط معلوم ہو گا ا
پھر بالضرور تائیدِ ایزدی سعی اور نیکوکاری کا مادہ قوم کے رگ و پے میں خون کی طرح سرایت کر کے ایک
حیرت زدہ زمانہ کو دکھاوے گا کہ مسلمان کیا تھے اور کیا ہو گئے - از برائے خدا یہ نہ سمجھنا کہ مشرقی مبا
کا یہ بھی ایک نمونہ ہے یا کہ قوم پس ماندہ کی نسبت میدان ترقی میں، میں ایسی جولانیوں کی پیشین گوئی کر
ہوں جن کے لئے قوم فطرتاً بالکل ناقابل ہے - ہم میں اس وقت کون ایسا شخص ہے جو یہ کہنے کا دعویٰ
کرے کہ ہم ہندوستان کے مسلمانوں میں وہ قوتیں موجود ہی نہیں جو ضرورت زمانہ کے مطابق ہر قسم کی ترقی
کرنے کے لئے لابدی ہیں-

کون ہم میں ایسا قوم کا طرف دار ہے جو یہ کہنے کو تیار ہو کہ ہم میں سلف ہلپ کی بالکل طاقت نہیں
ہے یا یہ کہ ہم دوسری قوموں کے مقابلہ میں ہر بات میں ہٹے ہیں کیوں کہ ہمارے پاس نہ زمین ہے نہ سرما
نہ ثروت نہ دماغی اور جسمانی قوت - کون کہتا ہے کہ ہم میں چلنے کی طاقت نہیں - ہے تو ضرور اور چلتے بھی
ہیں - مگر ہائے افسوس عموماً ٹیڑھے راستہ پر جہاں دو قدم بڑھ کر خاردار جھاڑیاں ملتی ہیں اور صاف
میدان کا کوسوں تک پتہ نہیں لگتا - کون کہے گا کہ ہمارے پاس بیل نہیں اور ہل نہیں اور زمین نہیں - ہے تو
سب کچھ مگر ہل چلانے والے کبڈی کھیل رہے ہیں اور بے ہل چلائے مہربان آسمان کی بارش پر
تکیہ کئے بیٹھے ہیں کہ تھوڑی سی تخم ریزی سے کچھ تو ہو رہے گا - اور جب اُن کی دنیا سے نرالی امیدوں
کے برخلاف کوئی کم نرخ غلہ پیدا ہوا تو سر پر ہاتھ رکھ کر قسمت ظالم کو روتے ہیں کہ افسوس عمدہ قسم کے
جو بوئے تھے گندم کیوں نہ ہوئے - اور نہیں سنتے پر نہیں سنتے کہ زمانہ باواز بلند پکار رہا ہے کہ
مکافات عمل کا یہی Eternal law (اٹرنل لا) یہی ایک غیر متغیر قانون ہے - ع

گندم از گندم بروید جَو ز جَو

الغرض اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ قوم میں قومی قوتیں فطرتاً ضرور موجود ہیں اور اُس کے
افراد اپنی قدرتی طاقتیں اپنے ساتھ لے کر پیدا ہوئے ہیں - ان مفرد طاقتوں کو حرکت دے کر ان کا صحیح استعمال کرنا

اور ان کو ایک خاص مرکز کی طرف میلان دیتا جس سے ایک ایسی movement (موومنٹ) پیدا ہو جس کو ہم قومی تحریک کہہ سکیں یہ ہی آج کل کے خیالات کے مطابق ہر فرقہ اور جماعت کے لئے دنیاوی ترقی کا پہلا گر ہے۔ اور مبارک ہے وہ ساعت جب کہ خلوص نیت سے اس گر کے سیکھنے اور سکھانے کے لئے چند پسندیدہ خیال احباب نے ایک قومی مجلس کی بنیاد ڈالی ہو۔ ایسی گہری اور مستقل اور فراخ بنیاد کہ جس پر کسی زمانہ میں ہر قسم کی قومی فلاح کا ایک قصر عالی شان تعمیر ہو سکے۔ ہمارا فرض یہ ہے کہ کیسی ہی دقتیں ہمیں پیش کیوں نہ آئیں ہم اپنے استقلال مزاج کو ہاتھ سے نہ دیں اور اس قومی بنیاد کو دن بدن زیادہ مستحکم کرنے میں اپنی طاقت سے بڑھ کر گرم جوشش رہیں۔ مقام شکر ہے کہ آپ صاحبان نے ایک برس سے دوسرے برس اور دوسرے برس سے تیسرے برس، غرض آج تک ہر سال کانفرنس کے اجلاس میں اپنی تشریف آوری سے نو سال کے لئے خدمت گزاران قوم کو زیر بار احسان فرمایا ہے۔

اور یہ صرف آپ کی سچی قومی ہمدردی اور ہمت مردانہ کا خوش دل نتیجہ ہے کہ کانفرنس کی حالت قریباً ہر سال کے انجام پر رو بہ ترقی ہے۔ آپ کا یہاں تشریف لانا قومی لحاظ سے زیادہ کچھ قابل قدر نہ ہوتا اگر یہاں تک آنے میں آپ کو صرف ہمارے محترم سر سید یا کسی اور بزرگ قوم کی خاطر منظور ہوتی۔ مگر آپ سب اپنے پیارے بچوں کی بہبودی کی تلاش میں اپنے گھروں سے نکلے ہیں۔

اس امید موہوم پر کہ اس بیت العلوم کی خاک چھان کر شاید گوہر مقصود دستیاب ہو۔ خدا آپ کی اس امید کو سرسبز کرے۔ مبارک ہو آپ کو کہ آپ اپنی فلاح میں خود ساعی ہیں اور مشکور رہیں ہم آپ کے کہ آپ نے اپنی آئندہ نسلوں کے شکر گزاری کا سامان مہیا کرنے میں دست ہمت دراز کیا ہے۔ سب سے زیادہ بلاشک وہ مرد میدان مستحق شکریہ ہے جو خدا کی دی ہوئی طاقت سے کسی دوسرے کا نہیں بلکہ اپنا آپ کام کرے۔ اور اگر آپ میں سے ہر ایک صاحب ایسا ہی ہمت مرد میدان ہے تو یہ مجمع نہ صرف ہمارے بلکہ اور زمانہ کے شکریہ کا مستحق ہے۔

اے حضرات! ہمارے یہاں آج جمع ہونے سے جو غرض مقصود ہے اُس سے آپ بخوبی واقف ہیں۔ اس کانفرنس کا اجلاس ہر سال اس بنیاد پر ہوتا ہے کہ ہندوستان کے افسردہ حال مسلمانوں کی ابتر حالت کا باعث قطع نظر دیگر اسباب کے یہ ہے کہ وہ دوسری قوموں کے مقابلہ میں جدید طریقہ تعلیم سے بہت کم فائدہ اٹھاتے ہیں۔

اس کا سبب مختلف اضلاع اور صوبہ جات میں حالات قومی کے لحاظ سے خواہ مذہبی تعصب کہو خواہ

کم استطاعتی اور خواہ محض عدم توجہی۔ لیکن اس کا قابلِ افسوس اور دل خراش نتیجہ یہ ہے کہ سارے ہندوستان میں کوہ ہمالہ سے لے کر راس کماری تک اور پشاور سے لے کر بنگال تک جہاں نظر ڈالو خوش دل اہل اسلام کا نمایاں نشان یہی ہے کہ بلحاظ دنیاوی عز و شان - بلحاظ ثروت اور ہر قسم کی قومی ترقی کے وہ ملک کی ہر ایک جماعت کی نسبت نہایت پس ماندہ ہیں۔ آخر اس عالم گیر پس ماندگی کا باعث کیا ہے شاید اس سوال کا جواب یہی ہو۔ جیسا کہ بعض نکتہ رس علمائے قوم ہمیں اپنے مقدس جوش مذہبی کے وقت بتلاتے ہیں کہ دنیا صرف آزمائش کا مقام ہے۔

اور ہم مسلمان بحکم ایزدی ہر طرح کی دنیاوی مصیبتوں میں اس غرض سے مبتلا کیے گئے ہیں کہ اس خستہ حالی کے عوض میں قیامت کے روز ہم خیر الامم ہو کر دوسری قوموں کی نسبت جو کہ آج دنیاوی عروج کے نشہ سے سرشار ہیں اُس احکم الحاکمین کی سرکار میں بہت بڑھ کر اعزاز حاصل کریں گے۔ شاید یہ جواب ہر طرح سے باصواب بھی ہو لیکن ہم کم بخت دنیا دار مسلمانوں کے لیئے جو کہ اس گہری دلدل میں سبکدوش علماء دین کی طرح صرف ٹخنوں تک نہیں بلکہ سر کے بالوں تک پھنسے ہیں اور کتنی ہی کوشش کریں نکل نہیں سکتے اس جواب کا تسکین بخش ہونا نہایت ہی مشتبہ ہے۔ اور کیا کریں کہ آج کل ہم میں سے ہر ایک کا دل گہرا ہ چلا رہا ہے کہ الدنیا مزرعۃ الآخرۃ کے لحاظ سے دنیا و دین میں جو باہمی تعلق ہے اس کی وجہ سے دنیاوی ترقی قوم کے لیئے دینی سرخروئی کی مستحکم بنیاد ہے۔ اور حالات و زمانہ کو مدنظر رکھ کر دنیاوی ترقی حاصل نہیں ہو سکتی جب تک کہ قوم میں جدید طریقہ تعلیم حاصل کرنے کا گرم جوشی سے مذاق پیدا نہ ہو۔

تعلیم سے مراد اس جگہ اس تعلیم سے نہیں جو ہمارے پرانی قسم کے دیسی مکاتب یا اُن سے زیادہ باقاعدہ درس گاہوں میں فارسی یا عربی زبان دانی اور چند مقررشدہ اور بوسیدہ علوم قدیم کی تحصیل پر ختم ہو۔ اُس طریقہ کی تعلیم جو فوائد قوم کو پہونچا سکتی تھی اپنے وقت اور مقام پر پہونچا گئی۔ اب اس کا شاذ و نادر عربی درس گاہوں میں کہیں کہیں نام و نشان جو کچھ باقی ہے صرف اس لئے ہے کہ ان لوگوں کے لیے جو پرانی سنگ تراشی کے ٹوٹے پھوٹے نمونے دیکھنا چاہتے ہیں۔ چند عجائب خانے قایم رہیں۔ جہاں کہ وہ قدیم زمانہ کے سرشکستہ بتوں کا ملاحظہ کر سکیں۔

اس کانفرنس کے وسیع احاطہ نگرانی میں اگرچہ یہ عجائب خانے بھی داخل ہیں۔ مگر ہماری جانب سے وہ بہر صورت اُس قدر دقت اور توجہ کے مستحق نہیں جیسا کہ وہ قومی گھر ہو سکتا ہے جہاں کہ اس تار برقی اور سٹیم اور گیس کے زمانہ کے مطابق ہر قسم کی موجودہ ضروریات کے پورا کرنے کے لئے سب سے عمدہ اور اعلیٰ نمونہ کے آلات کا ایک وسیع ذخیرہ موجود ہے۔

ایک عرصۂ دراز کے افسوسناک تجربہ کے بعد قوم کو ثابت ہو چکا ہے کہ قدیم قسم کے مشرقی تعلیم کا پھٹا بادبان قومی ادبار کے ہولناک طوفان میں ہماری ڈوبتی ناؤ کو نہیں بچا سکتا۔ اگر ہوش و خرد کو خیرباد نہیں کہہ چکے اور کنارِ عافیت پر پہونچکر کچھ کرکے دکھانے سے عاری نہیں ہو تو آؤ ہماری ڈگمگاتی کشتی کو دیکھو تمھاری دل خراش آہ و زاری کو سن کر ہزار ہا بندگانِ خدا کے بجائے کو مغربی تعلیم کا مبارک لائف بوٹ راج ہنس کی طرح سمندر کی لہروں کو چیرتا آیا ہے تاکہ تم بادِ مخالف کے ستم رسیدوں کو یورپین علوم و فنون کے اسٹیمر تک صحیح و سلامت پہونچادے۔ یہ عظیم الشان اسٹیمر اے کشتی شکستگانِ قوم خوب یاد رکھو، تمھارے لئے خدا کا بھیجا ہوا جہاز ہے جو ڈوبتی قوم کو خود ناخدائی کا کام دے گا۔ اسی کی تم کو نہایت ضرورت تھی ایسا نہ ہو کہ بے اعتنائی کی ترنگ میں بھی بکار خود دیوانہ بن کر کسی کے بلائے بول اٹھو سہ

احسان ناخدا کے اُٹھائے مری بلا
کشتی خدا پہ چھوڑ دوں لنگر کو توڑ دوں

یاد رکھو خدا پر توکل رکھنے کے طریقے، بےکاری اور بےپروائی کے طریقے نہیں ہیں۔ استغناء اُسی ایک ذات کے لئے مخصوص ہے۔ تم اگر ڈوبتے ہو تو ہاتھ پاؤں مار کر کسی چلتی ناؤ میں ہو بیٹھو اور کنارے پر پہونچکر پہلے بصد عجز خدا کا شکر ادا کرو اور پھر مہربان ناخدا کا دل سے شکریہ۔

اے بزرگانِ قوم! مسلمانوں کے لئے مغربی تعلیم۔ اور محض تعلیم نہیں بلکہ اعلیٰ تعلیم کی ضرورت۔ میں خیال کرتا ہوں یہ ایک ایسا مسلم امر ہے کہ اس پر بحث کرنا تضیعِ اوقات سے خالی نہیں۔ اگر گزشتہ سالوں کے پے در پے آٹھ جلسوں کی کشمکش کے بعد آپ میں سے کسی صاحب پر یہ ضرورت ثابت نہیں ہو چکی تو یا کانفرنس محض بے سود ہے اور یا حضرت خود ایک نہایت قوی دل و دماغ لے کر پیدا ہوئے ہیں۔

اور اگر اعلیٰ مغربی تعلیم کی ضرورت مسلّم ہے تو کہہ سکتے ہیں کہ کانفرنس نے آخر کار اپنا بنیادی پتھر جما دیا اور ہم آج اُس پتھر رکھنے کی تقریب پر جمع نہیں ہوئے بلکہ اس غرض سے کہ بنیادی پتھر کے بعد بنیادی عمارت کس طرح سے شروع کرنی چاہیئے۔ اس امر سے کسی شخص کو انکار نہیں ہو سکتا کہ مسلمانوں کی موجودہ تعلیمی حالت کی اصلاح و ترقی کی تدابیر سوچنے اور اُن پر عمل کرنے سے پہلے نہایت ضروری ہے کہ ہم اُس حالت سے پوری آگاہی پیدا کریں ہم کو سرسری طور سے یقیناً معلوم ہے کہ ہندوستان کے ہر حصہ میں مسلمانوں کو دیگر قوموں کے مقابلہ میں بلحاظ تعلیم سب سے ادنیٰ درجہ پر ہونے کی عزت حاصل ہے لیکن ہمیں گزشتہ سال سے پہلے معلوم نہ تھا اور اب بھی کماینبغی معلوم نہیں ہے کہ ہندوستان کے مختلف صوبجات اور اضلاع میں سرکاری اور پرائیویٹ اسکولوں اور کالجوں میں مسلمان بچوں کو بلحاظ تعداد دیگر قوموں کے لڑکوں سے

کیا نسبت ہے جس سے ہم کو ٹھیک طور سے علم ہو سکے کہ بمقابلہ ابتدائی تعلیم کے اعلیٰ تعلیم میں مسلمانان نسبتاً کس قدر کم ہیں اور بلحاظ مقامی حالات کے اس کمی کے کیا وجوہات ہیں اور اس کے بعد ہم اس بات کی فکر کریں کہ وہ مقامی یا عام موانع تعلیم کس طرح سے رفع ہو سکتے ہیں جن کے باعث مسلمانوں کی پستی حدِ اعتدال سے گزر گئی ہے۔

جہاں تک مجھے یاد ہے لاہور کا اجلاس غالباً سب سے پہلا اجلاس تھا جہاں کہ ممبران کانفرنس نے اکثر اضلاع پنجاب اور چند دیگر مقامات کے متعلق کم و بیش مفصل رپورٹ ہائے تعلیم پیش کی تھیں اور ان رپورٹوں کے مطالعہ کرنے سے ہر ایک شخص دیکھ سکتا ہے کہ فی الحقیقت وہ رپورٹیں کارروائی کانفرنس کا فخر تھیں۔

اگرچہ ان رپورٹوں میں اصلاح کی گنجائش ہے تاہم اگر اسی قسم کی کیفیتیں کم از کم شمالی ہندوستان کے سارے اضلاع کی نسبت مرتب کی جاویں اور اس کے بعد ایک سب کمیٹی اُن سب کا انتخاب اس صورت سے کرے کہ ہر ضلع اور ہر صوبہ کی علٰحدہ علٰحدہ تعلیمی حالات کے علاوہ ہر مد میں سب اضلاع اور صوبجات کا آپس میں نسبتاً موازنہ کیا جاوے تو میں خیال کرتا ہوں کہ قوم کے لئے ایک ایسا مکمل آئینہ خانہ تیار ہو جائیگا جس میں ہم سب اپنے خط و خال دیکھ سکیں گے اور دیکھ کر شرمندہ ہوں گے کہ اس زمانہ میں ہم نے اپنے تئیں کیسا سیاہ رو بنا رکھا ہے۔

ہمیں اس بیت العلوم کے فاضل پرنسپل مسٹر بیک کا ممنون احسان ہونا چاہئے کہ انھوں نے اس کانفرنس کے ماتحت اسٹیٹیسٹیکل سیکشن بنا کر اس قسم کی عملی کارروائی شروع کی ہے جو بلا مبالغہ ہماری کارروائی کی جان ہے۔ پچھلے سال ہمارے آنریبل سکرٹری نے اس غرض کے پورا کرنے کے لئے ہر ایک صوبہ کے اضلاع میں کارسپانڈنگ ممبران تجویز کر کے جو نقشہ جات اُن صاحبان کو بغرض خانہ پری بھیجے تھے اور جو کیفیتیں چند اضلاع سے بہ تکمیل اُن کے ارشاد کے اُن کو پہونچی تھیں اُن کے ملاحظہ کرنے سے آپ کو بخوبی واضح ہو سکتا ہے کہ ہماری کارروائی کا یہ جزو کس قدر مفید ہے۔ اور اس لئے اُس خاص سیکشن کو مکمل اور مستحکم کرنا ہم میں سے ہر ایک کا سب سے اعلیٰ فرض ہے۔

کانفرنس کے اس مقصد کے تکمیل کے متعلق یہ امر بھی نہایت ضروری ہے کہ ہم نہ صرف مسلمانوں کی موجودہ تعلیمی حالت سے بذریعہ معتبر اسٹیٹسٹکس جمع کرنے کی واقفیت حاصل کریں۔ بلکہ اُس تعلیمی حالت کا تاریخانہ طرز سے مطالعہ کریں جس سے ہم کو معلوم ہو کہ جدید طریقہ تعلیم کے آغاز سے لے کر آج تک مختلف وقتوں میں تحصیل علوم مغربی کی نسبت مسلمانان ہندوستان کا کیا رویہ رہا ہے۔ آیا پیشتر کی نسبت زمانہ حال میں اُن علوم سے وہ کس قدر زیادہ مانوس ہیں تو پہلے کیوں نہ تھے اور کن وجوہات نے ان کو بدرجہ ضرورت اُن علوم

کے حصول سے باز رکھا۔ ان سب امور کا جاننا ہم سب کے لئے لوازمات سے ہے۔

اور فی الحقیقت نہایت خوش نصیب ہے یہ کانفرنس کہ ایک عالی دماغ اور روشن خیال فاضل نے جن کی خداداد لیاقت پر ہماری قوم سچے دل سے نازاں ہے اس مشکل کام کو ایسا بنایا ہے کہ انھیں کا حصہ ہے۔

میری مراد اس وقت ہمارے فخر قوم جناب آنریبل سید محمود صاحب سے ہے جن کا پچھلے سال کا لکچر بلحاظ شستگی تحریر و فصاحت کلام اور باعتبار تاریخانہ تحقیق اور برجستگی مطالب کے اس کانفرنس کی تاریخ اور اردو قومی لٹریچر میں ہمیشہ کے لئے ایک عظیم الشان یادگار رہے گا۔

اس لکچر میں انھوں نے جو ایک نیا ڈھنگ قوم کو اپنی غفلت اور جہالت کے قبیح نتائج سے آگاہ کرنے کا نکالا ہے اور جس جانفشاں محنت سے انھوں نے ہزار ہندوستان کی پانچوں یونیورسٹیوں کے آغاز سے لیکر آج تک مسلمانوں کی اعلیٰ تعلیم کے متعلق ضروری اعداد جمع کر کے اس تعلیم کے ماحصل کو ڈایگراموں کی شکل میں دکھایا ہے تاکہ ہمارا علمی تنزل ہمیں ایسا محسوس ہو کہ ہم سوتے جاگتے اسے پیش نظر رکھیں۔ یہ نیا ڈھنگ اور یہ جانفشاں محنت ہم میں سے کسی اور مرد خدا کا کام نہ تھا اور اس بے نظیر کام کے لئے ہم اپنے اس مہربان محسن کا جس قدر شکریہ ادا کریں کم ہے۔ ورنہ بجز قومی شکریہ کے قوم ناتواں ہے اور کسی صلہ کی امید کیا ہو سکتی ہے بقول شاعر

برگ سبز است تحفۂ درویش

اے حضرات! ہمیں اپنی موجودہ تعلیمی حالت سے واقفیت بخشنے کے لئے ہمارے ایک اور فاضل محقق اور علامۂ قوم یعنی جناب نواب محسن الملک بہادر نے بھی گزشتہ اجلاس میں اپنی مشہور عالمانہ طرز میں ایک لیکچر دیا تھا جس میں اعداد کے ذریعہ سے قوم کو اپنی حالت سے ایسا آگاہ کیا گیا تھا کہ اُس کا امپریشن ابھی تک دلوں پر نقش برسنگ ہے۔ یہ لکچر معہ اُس دل سوز اسپیچ کے جو آنریبل سکریٹری نے پانچواں رزولیوشن پیش کرتے وقت فرمائی تھی بلاشبہ قوم کی قسمت کا فیصلہ کرنے والا تھا اور اگر پچھلے اجلاس میں ہماری قسمت کا فیصلہ نہیں ہوا تو خدا جانے کب ہوگا۔

ہم مسلمانوں کے گلیڈاسٹون یعنی ہمارے محترم اور مہربان بزرگ مولانا حافظ نذیر احمد خاں صاحب کا لکچر اعداد کی بنیاد پر گو بظاہر مبنی نہ تھا مگر وہ ان بے بہا اصولوں کا قیمتی ذخیرہ ہے جن کو ہماری علمی ترقی کے راستہ پر رہنمائی کا رتبہ حاصل ہے اور جن کی امداد کے بغیر ہم ایک قدم نہیں بڑھا سکتے۔

اے صاحبان! آپ اس میری رائے کو گستاخی سمجھیں یا بے سمجھی کا نتیجہ، مگر میرا یہ خیال ہے کہ جس قسم کے لکچر ہمارے گزشتہ اجلاس میں ہوئے تھے اُن کے مقابلہ میں عموماً معمولی رزولیوشن پر بحث کا ہونا قریباً بے سود ہے۔

اول تو تعلیمی مسئلوں پر بجز خاص واقفیت کے اور غایت درجہ کی غور و فکر کے سوائے رائے زنی کرنے سے وہ فائدہ حاصل نہیں ہوتا جو اس کانفرنس کو مدِنظر ہے اور دوسرے محض رزولیوشنوں کے پاس کرنے ہم لفظی بحثوں کے اس درجہ تک عادی ہو جاتے ہیں کہ انھیں کو اپنے اجلاس کی علت غائی سمجھ کر اصلی مطلب کو بالکل بھول جاتے ہیں۔ رزولیوشنوں کے ذریعہ سے ہم صرف اس امر پر متفق ہوتے ہیں کہ ترقی تعلیم کے لئے ایک خاص صورت میں ہمیں کیا کرنا چاہیئے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ رزولیوشن پاس کرنے کو ہم جمع ہوتے ہیں اور اس کے پاس ہونے پر ہمارے مقصد کی تکمیل ہو گی۔ آپ یہ بخوبی یاد رکھیں کہ محض فصیح لکچروں کے دینے یا سننے اور رزولیوشنوں کی بھرمار سے قوم ناتواں ترقی کا قدم نہیں بڑھا سکتی۔ زبان کے الفاظ فصاحت کے جادو سے اسی جسم میں حرکت پیدا کر سکتے ہیں جس میں خون کا کوئی قطرہ موجود ہو۔

مگر جس قوم کا لہو بالکل پانی ہو چکا ہو اُس پر تمھاری تقریروں کا اثر اگر کچھ ہو بھی تو صرف نقش بر آب ہو گا۔ اس لئے یہ امر ضروری اور نہایت ضروری ہے کہ آپ اس مجمع پر اس حد تک بھروسہ رکھیں کہ وہ آپ کو تعلیم کے متعلق صرف چند اشارات دیتا ہے۔ یہ کانفرنس صرف ایک فنگر پوسٹ یعنی اُنگلی ہے جو بے پوچھے آپ کو سیدھا راستہ بتلاتی ہے اُس راستہ پر تم کو چلانا آہستگی سے یا تیزی سے اُس اُنگلی کا نہیں بلکہ تمھارے پاؤں کا کام ہے کیوں کہ منزل مقصود تک پہونچنا چاہو تو صرف دیکھنے دکھانے سے نہیں بلکہ چلنے سے پہونچو گے

یاد رکھو وہ دل میں چبھتے ہوئے الفاظ جو کہ پچھلے اجلاس میں اسی چمنستان علم کے نغمہ سنج عندلیب مولانا محمد شبلی صاحب کی موثر زبان سے نکلے تھے ؎

گئے وہ دن کہ ہم محتاج تھے عبرت دلانے کے	ہمارا حال خود عبرت فزا ہے آج سر تا سر
گیا وہ وقت جب تھا بس اسی کا نام ہمدردی	کہ دو آنسو بہالیں قوم کی درماندہ حالت پر
ضرورت اب ہی گر ہم کو تو بس ہی اُن بزرگوں کی	کہ جن میں خیر سے کچھ کر دکھانے کے بھی ہوں جوہر
فقط باتیں نہوں کچھ کام بھی بن آئے ہاتوں سے	نہیں جو کچھ وہ مُنہ سے کر دکھائیں اُس سے کچھ بڑھ کر
نہیں گر یہ۔ تو بس اک گرمی صحبت کے سامان ہیں	یہ قومی مرثیے۔ یہ وعظ۔ یہ اسپیچ ۔ یہ لکچر
طلب اور سعی سے کچھ کام بن آئے تو بن آئے	فصاحت اور بلاغت کا بس اب چلتا نہیں منتر
تمھیں جو کام ہیں درپیش گو مشکل سے مشکل ہیں	مگر کرنے پہ آجاؤ تو آساں سے ہیں آساں تر

اے بزرگانِ قوم! میرا ارادہ تھا کہ میں اس موقعہ پر اعلیٰ تعلیم کی ضروریات کے ساتھ اعلیٰ قسم کی تربیت پر جس کے سوائے تعلیم کا اثر ہمیشہ غیر مکمل بلکہ بعض حالتوں میں انسانی ترقی کے لئے نہایت ضرر رساں ہوتا ہی اپنے خیالات کا اظہار کروں۔ لیکن بحیثیت صدر انجمن بھی میں اپنے تئیں کسی صورت سے اس بات کا مستحق قرار نہیں

دے سکتا کہ آپ کے بے بہا وقت اور آپ کی بزرگانہ توجہ کا بیت ساعت میں اپنے صرف میں لاؤں۔

مجھے جو کم و بیش حق اس وقت آپ کی عنایت سے حاصل ہے اُس کو میں نے حدِ اجازت سے بڑھ کر استعمال کیا ہے اور دل ہی دل میں نہایت شرمندہ ہوں کہ ایسی طولانی اور بے سود تقریر سے کس بے جا درجہ تک میں آپ کی سمع خراشی کا باعث ہوا ہوں۔ میں نے اپنے غیر موزوں الفاظ اور ناتراشیدہ جملوں میں جو کچھ کہا ہے اس خیال سے نہیں کہا کہ مجھے اپنی طرف سے کچھ کہنا تھا بلکہ صرف اس وجہ سے کہا ہے کہ کسی طرز میں ٹوٹے یا بھلے چند لفظ بولنا صحیح ہوں یا غلط میرا فرض منصبی قرار دیا گیا ہے۔ اور مسلّم ہے کہ رسمِ دیرینہ کے موافق اس فرض منصبی کے ادا کرنے سے جب تک اس خوفناک کرسی کے نزدیک ہوں مجھے کوئی چارہ نہیں۔ میں جس وقت آپ صاحبان کے روبرو پہلے کھڑا ہوا تھا تو یقین جانئے کہ صدرِ انجمن ہونے کے خیال میں نہیں بلکہ اُس جوشِ عقیدت سے کھڑا ہوا تھا کہ جیسے مرید اپنے مرشد کے حضور میں غلام اپنے مہربان آقا کی خدمت میں اور ایک طفلِ مکتب اپنے اُستادِ کامل کے سامنے سبق سیکھنے کو کھڑا ہوتا ہے۔ آپ کی شفقتِ بزرگانہ اور تلقینِ کامل سے مجھے امید واثق ہے کہ جو سبق ان دنوں میں آپ سے لونگا وہ میرے لئے تا دمِ مرگ مایۂ حیات ہوگا۔

اور اس سبق آموزی کے دوران میں اگر یہ نادان کسی نہج سے سوءِ ادب کا گناہگار ہو تو بلحاظ اُس حسنِ عقیدت کے جو مجھے آپ سے اُستادانِ قوم کی نسبت ہے مجھے یقین ہے کہ اس قصور سے درگزر فرماویں گے۔

خدا کا شکر ہے کہ اس وقت اس خوش نما ٹاؤن ہال میں ایک معقول تعداد قوم کا نام روشن کرنے والے روشن ضمیر بزرگوں کی موجود ہے جن کی بدولت آج ہم اس علی گڑھ کے علمی شالامار باغ میں گویا چراغوں کا میلا تماشا کر رہے ہیں۔

مبارک ہے یہ ساعت جبکہ اس قومی میلہ کے انعقاد سے قومی محبت، قومی ہمدردی اور قومی اتحاد کی گرم بازاری ہے اور جب کہ آپ میں سے ہر ایک قوم پر جان نثار کرنے والا قومی لباس میں خود دل فروش ہے اور خود تماشائی۔ اور جب کہ ہر جانب سے یہ دلخوش کن آواز آرہی ہے ؎

آج رونق پہ ہے اسلام کا مینا بازار
نقدِ دل دے کے کوئی قوم کا سودا لے لے

اے صاحبان! میں حسبِ معمول اعلان کرتا ہوں کہ کانفرنس کا نواں اجلاس کھولا گیا اور جناب سکریٹری صاحب سے التماس کرتا ہوں کہ وہ پچھلے اجلاس کی سالانہ رپورٹ پیش فرماویں۔

اجلاسِ دہم

(منعقدہ شاہجہانپور ۱۸۹۵ء)

صدر نواب محسن الملک بہادر مولوی سید مہدی علی خاں صاحب

نوٹ۔ صدر صاحب کے حالات بسلسلۂ اجلاس ہشتم صفحہ ۹۷ پر بیان ہو چکے ہیں خطبہ صدارت حسب ذیل ہے

خطبہ صدارت

بزرگان قوم! جو عزت آپ نے اس معزز مجلس کے صدر نشین ہونے کی مجھے بخشی ہے اس کا میں دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں اور اس بات کا افسوس کہ میرے معزز دوست جناب سردار محمد حیات خاں صاحب جو اس مجلس کی صدر نشینی کے لئے منتخب ہوئے تھے بوجہ ایک ناگہانی اور دل فگار صدمہ کے تشریف نہ لا سکے اور یہ مجلس ایک ایسے پریسیڈنٹ کے صدر نشین کے دیکھنے کی خوشی اور عزت سے محروم ہو گئی جس نے اپنی قوم کے لئے بہت ہی نمایاں کام کئے ہیں اور جو اپنی وجاہت اور لیاقت اور استحقاق سے تمام مسلمانوں میں معزز و سربلند ہے اور جس نے کئی مرتبہ اس مجلس کی پریسیڈنٹی کے فرائض اس لیاقت اور خوبی سے ادا کئے ہیں کہ وہ ایک عمدہ نمونہ صدر نشین ہونے کا تسلیم ہو چکے ہیں ان کے عذر پر جو نہایت مجبوری اور افسوس سے قبول کیا گیا، جب آپ نے اپنی مہربانی سے مجھے اس خدمت کے لئے منتخب فرمایا تو میں نے کچھ تو اپنی نا اہلیت اور کچھ بیماری کی وجہ سے کئی مرتبہ اس ذمہ داری کی خدمت سے معاف کئے جانے کی خواہش کی مگر جب میرا عذر قبول نہ ہوا اور آپ کے سکرٹری صاحب کا آخری فرمان پہونچا تو میں آپ کے معزز سکرٹری کا آخری فرمان پاتے ہی جس طرح بیٹھا تھا اٹھ کھڑا ہوا اور آپ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ مگر مجھے اندیشہ ہے کہ میری جسمانی صحت مجھے اپنے فرائض

ادا کرنے سے کسی قدر مانع ہو گی اور میں امید کرتا ہوں کہ اگر ہماری اس خدمت کے فرائض ادا کرنے میں خلل انداز ہو تو آپ مجھے معذور سمجھیں گے اور معاف فرمائینگے۔

حضرات ! قبل کسی اور کام کی شروع کرنے کے مجھ پر فرض ہی کہ میں معزز دوست جناب خان بہادر برکت علی خاں صاحب اور دیگر رئیسان وعمائد شاہجہاں پور کا شکریہ ادا کروں کہ اُن کے بلانے اور خواہش سے ہم لوگ یہاں آئے اور علی الخصوص جناب محمد عثمان خاں صاحب کا احسان ہی کہ انھوں نے فرط مہماں نوازی اور حب قومی سے اپنا عالیشان اور پُرآرام مکان ہم لوگوں کے لئے خالی کر دیا اور اس کے وسیع صحن میں وہ رفیع الشان ہال کانفرنس کا عارضی طور پر بنایا گیا ہی کہ جس سے بہتر میں نے اس قسم کے پبلک مجمعوں کے لئے بمبئی اور پونہ میں بھی ہال بنا ہوا نہیں دیکھا اور میں جناب مولوی رفعت علی صاحب کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انھوں نے میری نسبت وہ عنایت آمیز الفاظ فرمائی ہیں جن کا میں مستحق نہیں تھا۔

صاحبو ! ربع صدی سے کچھ زیادہ عرصہ ہوتا ہی کہ جناب خان بہادر محمد برکت علی خاں صاحب کی ملاقات کی عزت مجھے حاصل ہی اس دوستی اور محبت کی وجہ سے جو ذاتی خیال میرا ان کی نسبت ہی اُسے میں اس وقت بیان نہیں کرتا۔ مگر جو حقوق اُن کے قوم پر ہیں اور جس اسلامی حمیت اور قومی ہمدردی سے انھوں نے قوم کی خدمت کی ہی اُن کی نسبت میں صرف اس قدر کہنے کی اجازت چاہتا ہوں کہ اگر مثل اُن کے چند مسلمان قوم کی فلاح اور بہبودی چاہنے والے اور ہوتے، تو آج مسلمانوں کی حالت ہی کچھ دوسری ہوتی اور بجائے نالہ وفغاں کے قوم کی حالت پر خوشیوں کے نعرے چاروں طرف سے سنائی دیتے۔

اے صاحبو ! آپ جانتے ہیں کہ پچھلے سال کی کانفرنس میں ہماری قومی مجلس کا بمقام بمبئی منعقد ہونا قرار پا چکا تھا، اور بمبئی کے معزز مسلمان نہایت مشتاق اور منتظر تھے۔ مگر سید صاحب قبلہ کی بیماری سے جب وہاں کا جانا ملتوی ہو گیا، اور اسی نواح میں کسی جگہہ کانفرنس کا ہونا مناسب معلوم ہوا تو ممالک مغربی وشمالی اور اودھ پہ ہماری نظر تھی مگر افسوس ہی کہ کسی گوشہ سے کوئی آواز ہمارے بلانے کی نہ آئی نہ کسی شہر سے ہم کو دعوت دی گئی۔ مگر میرے معزز دوست ہی کا یہ کام تھا کہ اُنھوں نے روسا شاہجہانپور کو قومی ہمدردی اور اسلامی محبت کا جوش دلایا، اور ان کی تحریک پر اس شہر کے رئیسوں نے اپنی مردانہ ہمت اور فیاضانہ طبیعت سے یہاں کانفرنس کے منعقد کرنے کی تجویز کی اور ہر طرح سے اس کی شان وشوکت سے انجام پانے کے لئے کوششیں کیں۔ جو کچھ میں نے رئیسان شاہجہاں پور کی کوششوں کی کیفیت اخباروں میں دیکھی ہی اس سے معلوم ہوتا ہی کہ اسی شہر کے رئیس ہیں جنہوں نے کانفرنس کے لئے ہر طرح کی محنت اور کوشش کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا یہی حضرات ہیں جنہوں نے قوم کے لئے سفر کیا

محنت اٹھائی، تکلیف گوارا کی۔ لوگوں کو سمجھایا، کانفرنس کے فوائد بتلائے، اور اپنے بھائیوں کے آرام و آسایش کے لئے ہر طرح کا انتظام کیا۔ اور اسی کا نتیجہ ہے کہ آج میں اس عالیشان اور امیرانہ ہال میں ایسا معزز اور پُر رعب مجمع دیکھتا ہوں جن کے چہروں سے قومی حمیت کا جوش نظر آ رہا ہے۔ فَلِلّٰہِ دَرُّھُمْ وَعَلَی اللّٰہِ اَجْرُھُمْ۔

اے حضرات۔ اس کانفرنس کا یہ دسواں اجلاس ہے۔ پہلے اجلاس مختلف مقامات میں ملک پنجاب و شمال مغربی اضلاع و اودھ میں ہو چکے ہیں لیکن یہ پہلی دفعہ ہے کہ قدیم اور مشہور ملک روہیلکھنڈ میں اس کانفرنس کا اجلاس منعقد ہوا ہو، اس لئے آپ مجھ کو اجازت دیجئے کہ چند الفاظ تمہیدی بیان کروں۔

اے حضرات! آپ کو معلوم ہے کہ اس کانفرنس کا مقصد کیا ہے۔ اور اس کے بانیوں اور حامیوں کی کوششیں کس لئے ہیں۔ صاحبو اس کا مقصود قومی ترقی ہے اور مسلمانوں کی فلاح اور بہبودی۔ اور چونکہ زمانہ نے بتا دیا ہے کہ یہ مقصد صرف اعلیٰ تعلیم اور عمدہ تربیت سے حاصل ہو سکتا ہے۔ اور اعلیٰ تعلیم اور عمدہ تربیت کے اصول و قواعد کا بغیر قوم کی صلاح و مشورے کے قرار دینا اگر ناممکن نہیں تاہم غیر مؤثر اور غیر مفید ہے۔ اس لئے ہمارے معزز سیّد نے جس کی عمر مسلمانوں کی ترقی کی فکر اور تعلیم کے مسئلہ پر غور کرنے میں صرف ہو گئی ہے اس مجلس کو قایم کیا اور ہندوستان کے تمام مسلمانوں کو اس میں شریک ہونے، اور اپنی اپنی رایوں کے ظاہر کرنے کا موقع دیا۔ تاکہ باتفاق قوم، مسلمانوں کی ترقی و تعلیم کے اصول و فروع طے ہوں اور کسی ایک شخص کی رائے پر عمل کرنے سے جو غلطیاں ہوتی ہیں وہ نہ ہونے پائیں۔ یہ سوال سال ہے کہ لوگ جمع ہوتے ہیں اور اپنی اپنی رائیں ظاہر کرتے ہیں اور جو کچھ باتفاق آرا قرار پاتا ہے۔ وہ رزولیوشن کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے، اس کو دوسرے لفظوں میں تمثیلاً اس طور پر سمجھنا چاہیئے کہ کانفرنس ایک مجمع ہے، قومی بیماریوں کی تشخیص، اور اس کے لئے دوا تجویز کرنے والوں کا، اور رزولیوشن نسخہ ہے جو باتفاق اطبا لکھا جاتا ہے۔ مگر حضرات افسوس ہے کہ اس نیک کام پر بھی کبھی بے دردی سے ہم پر ملامت کی جاتی ہے کبھی ہماری کانفرنس کی ہنسی اڑائی جاتی ہے کوئی ہمیں بوالہوس کہتا ہے کوئی ہماری کارروائیوں کو فضول اور لغو بتلاتا ہے ہماری اسپیچیں بیہودہ بکواس سمجھی جاتی ہیں۔ اور ہمارے لیکچروں کا مضحکہ اڑایا جاتا ہے اور عملی نتائج نہ ظاہر ہونے کا تو عموماً ہم پر اعتراض کیا جاتا ہے۔

صاحبو۔ ہم خود جانتے ہیں اور اس کا اقرار کرتے ہیں کہ اب تک ہمارے کاموں کا کوئی نمایاں عملی نتیجہ ظاہر نہیں ہوا۔ اور ہماری کوششیں تقریر و تحریر کی حد سے باہر نہیں نکلیں۔ مگر صاحبو اس میں ہمارا

کیا قصور ہے۔ ہم منادی کرنے، اور جوش دلانے اور سمجھانے اور تدبیریں بتانے کے سوا قوم سے کام لینے کا کیا ذریعہ رکھتے ہیں۔ ہم فرماں روا نہیں کہ قوم کو تعمیل پر مجبور کریں۔ دولت ہمارے ہاتھ میں نہیں کہ اپنے خرچ سے درس گاہیں بنادیں، ہم مقلب القلوب نہیں کہ قوم کے دل پھیر دیں۔ ہم کو ایسا منتر یاد نہیں کہ ایک چھڑی ہلانے سے طلسم کا نیا کارخانہ کھڑا کر دیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے نسخوں کے لکھنے سے قوم کی بیماری دور نہیں ہوئی اور جس مرض میں وہ گرفتار تھی اس میں اب تک وہ مبتلا ہے ہم نے قوم کو اُن کے بزرگوں کی شان وشوکت یاد دلائی، اُن کی شان میں قصیدے پڑھے، ان کی موجودہ حالت پر مرثیے سنائے، کبھی دل خوش کن قصے سنا کر انھیں جوش دلایا اور کبھی پُر درد داستانیں سنا کر اُن کو رُلایا، غرض کہ جس طرح سے ہم سے بن پڑا ہم نے اُن میں تحریک پیدا کرنی چاہی۔ مگر افسوس ہے کہ عملی نتیجہ ظاہر نہیں ہوا اور کانفرنس کے حلقے سے باہر نکل کر کسی نے اس کا خیال نہ رکھا۔ ہم کو اس پر مایوسی بھی ہوئی مگر کیا کیجیے اس پر بھی اپنے کام سے باز نہیں آتے اور باوجود مایوسی کے طبیبوں کے بلانے اور نسخوں کے لکھنے کا خیال نہیں چھوڑتے محبت کی ایک آگ سینہ میں بھڑک رہی ہے کہ وہ کسی طرح نہیں بجھتی اور قومی محبت کا درد دل میں سما گیا ہے کہ وہ کسی طرح نہیں جاتا، ملامتیں سنتے ہیں، طعنے سنتے ہیں ناامیدیاں دیکھتے ہیں مگر جو سودا سر میں سما گیا ہے وہ نہیں جاتا ہے

چوں محبت شعلہ در خرمن زند	شوق خاکستر شدن دامن زند
پاک سوز و ہیچ جنس صبر و قرار	سخت تر از موت باشد انتظار
فال بے تابی چو بسمل می زنند	دست در دامانِ قاتل می زنند

لیکن یہ خیال کسی قدر تسلی بخش ہے کہ اگر ہماری دلخراش آوازوں سے چند مسلمانوں نے بھی وہ غار دیکھ لیے جس میں وہ گرتے جاتے ہیں، تو ہماری محنت وصول ہوئی اور اپنی خدمتوں اور کوششوں کا ہم نے صلہ پالیا، اور اس کہنے میں شاید مبالغہ نہ ہوگا کہ گو کانفرنس کی کوششیں کیسی ہی ضعیف اور خفیف ہوں۔ مگر قوم کے دلوں میں کچھ تحریک ضرور پیدا ہو گئی ہے، اسی کو ہم اس مجلس کی کوششوں کا نتیجہ اور قومی زندگی کے نمو کا پہلا درجہ سمجھتے ہیں۔

حضرات۔ کانفرنس کے عملی نتائج ظاہر نہ ہونے پر اعتراض کرنے والوں کے علاوہ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو سرے سے کانفرنس کے قائم ہونے اور مغربی تعلیم ہی کو غیر ضروری سمجھتے ہیں اُن کے نزدیک ہماری ساری تدبیریں مسلمانوں کے لئے نہ صرف غیر مفید ہیں بلکہ ضرر رساں ہیں وہ کہتے ہیں ہم مسلمانوں کو صرف انگریزی پڑھانا چاہتے ہیں تاکہ وہ سرکاری ملازمت کے قابل ہو جاویں، گو وہ دین سے واقف ہوں یا

بے خبر رہیں۔ اُن کے دین و مذہب قائم رکھنے کی ہمیں کچھ پرواہ نہیں۔ ان اعتراض کرنے والوں میں سے بعض ایسے بھی ہیں کہ انگریزی تعلیم ہی کو مذہب کے خلاف سمجھتے ہیں۔ اس لئے کانفرنس کے استحکام اور تعلیم کی اشاعت اور اس مجلس کے مقاصد کی کامیابی کے لئے اس بات کی نہایت ضرورت ہے کہ یہ غلط فہمیاں دور کی جائیں اور تعلیم جیسی ہم چاہتے ہیں اس کی حقیقت ظاہر کر دی جائے اور یہ بات بخوبی بتا دی جائے کہ ہم اندھوں کی طرح سے انگریزی تقلید نہیں کرتے ہیں بلکہ فی الحقیقت اپنے بزرگوں کے طریقہ پر چلتے ہیں اور اُن کے خیالات زندہ کرتے ہیں، تاکہ اس معزز گروہ کو جو اپنے علم و تقدس کی وجہ سے قوم کا پیشوا اور راہ نما ہے معلوم ہو جائے کہ ہمارے اور اُن کے مقاصد ایک ہیں اور ہمارا اور اُن کا اختلاف صرف چند غلط فہمیوں پر مبنی ہے۔

صاحبو۔ ہمارا یہ ہرگز مقصود نہیں ہے کہ ہم انگریزوں کی کورانہ تقلید کریں۔ اپنے بچوں کو صرف وہ تعلیم دلائیں جو فقط دنیا کے لئے مفید ہو اور جس سے وہ صرف گورنمنٹ کی ملازمت کے لائق ہو جائیں، بلکہ ہمارا مقصد اس سے ارفع و اعلیٰ ہے ہم اس قسم کی تعلیم کو ہرگز تعلیم بھی نہیں کہتے۔ ہمارے نزدیک تعلیم کا یہ مقصد نہیں ہے کہ اس سے صرف چند پیشوں کے کام کرنے کی لیاقت حاصل ہو بلکہ تعلیم کا مقصود یہ ہے کہ تمام قوتیں جو خدا نے انسان میں رکھی ہیں وہ نمو پائیں اور نہ صرف انھیں قوتوں کو نمو دیا جائے، جو ہماری جسمانی آسایش کے کام آئیں۔ بلکہ روحانی قوتوں کا کام میں لانا۔ اور دماغ کو غذا پہونچانا تعلیم کا اصلی مقصود ہے۔ بلا شبہ اس قسم کی تعلیم جس سے ہم معاش پیدا کرنے کے لائق ہوں ضروری ہے اور ہماری دنیاوی لذت دور ہونے کے لئے اس کا سیکھنا بھی لازم ہے۔ لیکن اس کے علاوہ ہم وہ تعلیم بھی چاہتے ہیں کہ جس سے اُن کے دل و دماغ روشن ہوں اور علم کو علم کے لئے حاصل کریں۔ اور علاوہ جسمانی آسایش کے، جو فنا ہونے والی ہے اُن چیزوں کو بھی حاصل کریں، جو اُن کی روحانی راحت کے لئے جو کہ ہمیشہ باقی رہنے والی ہے کام آوے۔ اُن میں سچی ہمدردی اور کامل انسانیت پیدا ہو، ان کی زندگی کا مقصد زیادہ اعلیٰ، اور زیادہ پاک ہو اور جس طرح ہمارے بزرگوں نے علم کو علم کے لئے حاصل کیا اور ہمارے لئے وہ اپنے دل و دماغ کو ترکہ چھوڑ گئے۔ اسی طرح ہم بھی علم کو علم کے لئے حاصل کریں، اور اپنے بزرگوں کے ترکہ میں کچھ بڑھا کر آیندہ آنے والی نسلوں کے لئے چھوڑ جائیں اس کے لئے ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے بچے دینی علوم بھی سیکھیں، اور عقلی علوم کی بھی تحصیل کریں۔ اور وہ لوگ بڑی غلطی پر ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ عقلی علوم جس کا بڑا سرمایہ اس وقت انگریزی زبان میں ہے شریعت کے خلاف ہیں ہمارے بزرگوں نے ایسے علوم کو شریعت کے مخالف سمجھنے کے بجائے عین شریعت بتایا ہے۔ اور اس

کے سیکھنے میں ننگ و عار کرنے کے بدلے اس کے حاصل کرنے میں جان و مال کو قربان کیا ہے کیا خوب کہا ہے ہمارے یہاں کے ایک بڑے عالم نے کہ شرع نے موجودات و مخلوقات کی معرفت اور اس کا علم ہم پر واجب کردیا ہے اور بہت سی آیتوں میں ہم پر اس کی تاکید فرمائی ہے۔ اَوَلَمۡ یَنۡظُرُوۡا فِیۡ مَلَکُوۡتِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ نص صریح ہے، اس پر کہ ہم موجودات کی حقیقت دریافت کریں اور اس کے ملکوت سماوات وارض پر غور کریں یعنی جو کچھ کائنات عالم میں خدا نے پیدا کیا ہے اس کا علم حاصل کریں اور چونکہ یہ کام ایک انسان، یا ایک گروہ، یا ایک زمانہ کے آدمیوں کا نہیں ہے اس لئے ہم پر شرعاً واجب ہے کہ ہم ان متقدمین کی تحقیقاتوں سے مستفید ہوں جو ہم سے اول گذرے ہوں، اور ان کتابوں کو دیکھیں جو اس میں تالیف ہوئی ہوں۔ اگرچہ ہمارے مذہب و ملت پر بھی نہ ہوں چنانچہ اس عالم کے الفاظ یہ ہیں فَقَدْ تَبَیَّنَ مِنْ هٰذَا اَنَّ النَّظْرَ فِیْ کُتُبِ الْقُدَمَاءِ وَاجِبٌ بِالشَّرْعِ وَاَنَّ مَنْ نَهٰی عَنِ النَّظْرِ فِیْهَا فَقَدْ سَدَّ النَّاسَ عَنِ الْبَابِ الَّذِیْ دَعَا الشَّرْعُ مِنْهُ النَّاسَ اِلٰی مَعْرِفَةِ اللّٰهِ وَهُوَ بَابُ النَّظْرِ مُؤَدِّیْ حَقَّ الْمَعْرِفَةِ وَ ذٰلِكَ غَایَةُ الْبُعْدِ عَنِ اللّٰهِ تَعَالٰی۔

اور جب کہ ہم مسلمانوں کا یہ دعویٰ ہے کہ ہمارا دین اکمل الادیان ہے، اور ہمارا رسول مبعوث ہوا ہے اِلَی الۡاَسۡوَدِ وَالۡاَحۡمَرِ تو ضرور ہے کہ وہ مذہب کسی خاص گروہ، یا کسی خاص وقت یا کسی خاص ملک کی حالت ہی کے مناسب نہ ہو، بلکہ تمام دنیا کے انسانوں کے طبائع اور حالات کے موافق اور ہر زمانہ کے مناسب ہو۔ اور چوں کہ ظاہر ہے کہ زمانہ ترقی کرتا جاتا ہے نئے نئے علوم ایجاد ہوتے جاتے ہیں نئی نئی تحقیقاتیں ہو رہی ہیں، دماغی قوتوں میں حیرت انگیز ترقی ہوئی اور ہوگی تو ضرور ہے کہ اسلام ہر ترقی یافتہ خیالات کے موافق، اور ہر علم اور تحقیق کے مطابق ہو۔ اس لئے وہی مسلمان سچے اسلام کے دوست ہیں، اور اسلام کے حامی جو اپنے دعوے کو اپنے عمل سے ثابت کریں۔ اور دنیا کی کسی زبان اور کسی علم کے سیکھنے سے پرہیز نہ کریں، بلکہ ان کے سیکھنے کو اپنا فرض، اور اپنے مذہب کی سچائی ثابت کرنے کے لئے ضروری سمجھیں۔ کیا اسلام صرف عوام اور جاہلوں کے لئے ہے، اور کیا وہ کسی خاص زبان یا کسی ایک قوم کے لئے محدود ہے، نہیں ہر گز نہیں، بلکہ وہ ہے کَآفَّةً لِّلنَّاسِ جیسا عوام اور جاہلوں کے لئے ویسا ہی عالم اور فلسفیوں کے واسطے، پس اگر ہم انگریزی سے ڈریں، اور مغربی علوم سیکھنے سے پرہیز کریں تو حقیقت میں ہم اپنے مذہب کو جاہلوں اور عوام کا مذہب سمجھیں گے۔

کیا وہ پاک رسول جس نے فرمایا کہ میں علم کا شہر ہوں۔ اور کیا وہ خدا کا پیغمبر جو علم و حکمت کی تعلیم اور اخلاق کی تکمیل کے لئے دنیا میں آیا وہ صرف عوام اور جاہلوں کے لئے آیا تھا، اور کیا اس کی دعوت صرف عرب

کے وحشیوں اور حجاز کے شتر بانوں کے لئے محدود تھی، کیا وہ اس لئے آیا تھا کہ ایک گروہ جاہلوں اور بے علموں کا قایم کرے، اور علم وحکمت کی روشنی دنیا میں نہ پھیلنے دے، اور اپنے گروہ میں کسی کو عالم، حکیم، اور فلسفی کا خطاب نہ پانے دے۔ اگر کسی کو ایسا خیال ہو تو میں پکار کر کہتا ہوں، اور خدا کو اس پر شاہد کرتا ہوں کہ اسلام اس سے بری ہے پیغمبر اس سے بیزار خدا اس کی تکذیب کرتا ہے۔ لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ط

صاحبو۔ اسلام نے جہل کو تقویت نہیں دی، بلکہ علم کو، اسلام نے حماقت کی تعریف نہیں کی بلکہ عقل کی، اسلام نے جاہلوں کا گروہ تیار نہیں کیا بلکہ عالموں اور فاضلوں اور حکیموں اور فلسفیوں کا، جنھوں نے خدا کی زمین کو حکمت وفلسفہ کی روشنی سے روشن کردیا اور جہل کی تاریکی دنیا سے مٹادی۔

صاحبو۔ ہم اس قوم کے آدمی ہیں جنھوں نے یونان کے علوم زندہ کئے۔ اور ہم اس سلف کے خلف ہیں جنھوں نے علم وحکمت کا یورپ کو سبق دیا ہے، ہمارے ہی آبا واجداد تھے جو صدیوں تک فرنگستان کی استادی کرتے رہے اور ہماری ہی وہ کتابیں تھیں جو عیسائی درس گاہوں میں پانچ سو برس تک جاری رہیں، حکمت وفلسفہ سے روشنی پھیلانی کی عزت جو ہمارے بزرگوں نے پائی وہ صرف غیر قوم اور غیر مذہب والوں کی زبان اور علم سیکھنے کو برا سمجھتے اور خود یونانیوں کی شاگردی اختیار نہ کرتے تو یورپ کی استادی کا درجہ کیوں کر انھیں نصیب ہوتا؟ یونان خدا کا گھر نہ تھا جس کو ہم نے بیت الحکمت جانا، ارسطو وفلاطوں پیغمبر نہ تھے جن کو ہم نے فلسفہ اور حکمت کا استاد مانا۔ مجسطی اور اقلیدس آسمان سے نازل نہ ہوئی تھی جن کو ہم نے دل کا تعویذ بنایا، وہ کن کے علوم تھے اور کن سے ہم نے سیکھے تھے، جن کے جاننے اور سیکھنے سے ہمارے بزرگ حکیم اور فلسفی ہوئے اور امام اور علامہ ٹھیرے، آخر یہ سب علوم غیروں ہی سے ہم نے سیکھے تھے، اور یونان اور فارس ہی سے ہم کو پہونچے تھے، اب کہ ان علوم نے یونانی جامہ اتار کر انگریزی لباس پہنا ہے، تو صرف لباس کی تبدیلی سے ان میں کونسا خلل آیا۔ اور صرف زبان کے بدلنے سے اُن علوم کا سیکھنا کیوں حرام ہوا۔

اے میرے دوستو اور عزیزو۔ مجھے نہایت حیرت ہوتی ہے اور ہنسی آتی ہے جب کہ یہ کہا جاتا ہے کہ مغربی علوم کی تعلیم عیسائیوں اور انگریزوں کی تقلید ہے، اور اسلام کے خلاف، اس لئے دو تین صدیوں کے پہلے ہم علوم کے حامی اور مربی تھے، اور عیسائی اس کے مخالف تحقیق اور آزادی ہمارا حصہ تھا، اور تقلید اور اوہام پرستی ان کا ترکہ۔ یہ صرف زمانہ کا انقلاب ہے کہ ہمارے بزرگوں کا حصہ

انھوں نے پایا اور اُن کے اسلاف کا ترکہ ہم نے لیا ہے

پسرانِ وزیر ناقص عقل ۔۔۔ بہ گدائی بروستا رفتند
روستازادگان دانشمند ۔۔۔ بوزیرئے پادشہ رفتند

جن چیزوں پر آج یورپ کو ناز ہے، تاریخ سے ثابت ہوتا ہے کہ اس کے بانی اور جاری کرنے والے ہم تھے، اور جن باتوں سے ہم جاہل اور ذلیل ہو رہے ہیں یہ عیسائیوں سے مخصوص تھیں۔ اگر ہم اپنے دانشمند بزرگوں کا طریقہ نہ چھوڑتے، تو آج ہماری یہ حالت نہ ہوتی۔ افسوس تو یہ ہے کہ ہم اپنی اور یورپ کی تاریخی حالت سے بالکل بےخبر ہیں۔ اور اصول چھوڑ کر رسموں کے پابند ہو گئے ہیں، تحقیق کا اصول جس پر اسلام کا مدار ہے وہ ہم نے چھوڑ دیا خیال کی آزادی جو اسلام کا پہلا سبق تھا وہ ہم سے جاتا رہا، علم و حکمت جو ہمارا گم شدہ مال سمجھا جاتا تھا اسے ہم چھوڑ بیٹھے۔ تعصب جس کے دور کرنے کے لئے اسلام دنیا میں آیا وہ ہمارے دلوں کا نقش ہو رہا ہے۔ چھوت اور پرہیز جس کا نام ہم نہ جانتے تھے وہ ہندوؤں سے بڑھ کر ہم میں داخل ہے، کیا وہ مسلمان ہمارے ہی سے تعصبات رکھتے تھے جنھوں نے ریگستان عرب سے نکل کر کسریٰ اور قیصر کے ایوان کو ہلا دیا۔ اور کیا ہماری طرح کا چھوت اور پرہیز اُن مجاہدین کا شعار تھا جو حجاز کی پہاڑیوں سے نکل کر اندلس اور روم تک پہونچ گئے تھے۔ کیا اسلام کے منادی کرنے والوں کو علم و حکمت کے نام سے لرزہ آتا تھا کیا ہمارے آبا و اجداد ہاتھ پاؤں ہلانے کو توکل سمجھتے اور من و سلویٰ کے طالب رہتے تھے۔ ہرگز نہیں ہرگز نہیں، سچ تو یہ ہے کہ صرف غفلت اور کاہلی نے ہمارا یہ حال کر دیا ہے کہ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ ہم اُسی قوم کے آدمی ہیں جن کی عزت و اقبال کے پھریرے ایشیا اور یورپ کے میدانوں اور پہاڑوں پر اڑتے تھے، اور جن کے نام سے سلاطین روئے زمین کے کلیجے دہل جاتے تھے، سچ تو یہ ہے کہ نہ اب ہم کو صورت میں مشابہت ہے، نہ سیرت میں مناسبت، کہاں ہے وہ چہروں کی سرخی و سفیدی کہاں ہے وہ بدنوں کی تنومندی اور پھرتی کہاں ہے، وہ طبیعتوں کی آزادی کہاں ہے وہ اسلام کا جوش کہاں ہے وہ قریشی دبدبہ کہاں ہے وہ ہاشمی شوکت کہاں ہے وہ محمدی خلق کہاں ہے وہ اسلامی درد کہاں ہے وہ علوم کی محبت کہاں ہے وہ تعلیم کا چرچا، ایک چیز بھی تو ان میں سے ہم میں باقی نہ رہی۔ ہماری حالتوں میں تغیر آگیا اور ہماری تمام چیزیں بدل گئیں، وہ خون جو ابراہیمؑ کی رگوں کا ہم میں تھا بدل گیا وہ ہڈی جو اسمٰعیل کے خون سے بنی تھی بدل گئی، غرض کہ چہرا بدل گیا، رنگ بدل گیا، صورت بدل گئی سیرت بدل گئی، یہاں تک کہ اگر سچ پوچھو تو اصلی مذہب بھی بدل گیا، تمام وہ جوش جو اُٹھے تھے اس سینے

جنگل سحر جس نے فارس اور تمام سنٹرل ایشیا کو سرسبز اور شاداب کر دیا تھا، ہندوستان میں آکر گنگا او
میں ڈوب گئے۔

صاحبو۔ ایسی حالت میں جو اس وقت مسلمانوں کی ہے مغربی تعلیم سے باز رکھنا، اور زمانہ کی ضرورت اور حالت کے موافق ترقی کرنے سے روکنا، درحقیقت قوم کے ساتھ محبت نہیں ہے، بلکہ ہر شخص کا جسے خدا سمجھ دی ہو یہ فرض ہے کہ وہ قوم کو اس بات کا یقین دلانے میں کوشش کرے کہ تمدنی اور ملکی ترقی کی توقع صرف مغربی خیالات اور مغربی علوم سے ہو سکتی ہے، اور انھیں خیالات کے پیدا کرنے اور انھیں علو کے سیکھنے سے پھر وہ اپنی گئی ہوئی عزت حاصل کر سکتے ہیں، اور اپنی ہمت اور اولوالعزمی کو زمانہ کے مناسب، مفید کاموں میں ظاہر کرنے سے وہ ترقی کے میدان میں فتحیاب ہو سکتے ہیں، اور مغربی علوم کے ساتھ اپنے مذہبی علوم کی اشاعت، اور عربی تعلیم کی ترقی دینے سے وہی درجہ حاصل کر سکتے ہیں جو کہ اُن کے بزرگوں کو تھا۔ بنی نوع انسان میں صرف یورپ ہی نہیں ہے کہ تمام عمدہ صفتیں اور نیکیاں اور علوم و فنون انھی پر ختم ہوں، اور وطن کی محبت، قومی ہمدردی، اور اپنی عزت اور شہرت اور ثواب کا خیال انھیں کو ہو، ہمارے بزرگ بھی یہ چیزیں رکھتے تھے اور گئی گذری حالت میں اب تک ہم بھی کچھ رکھتے ہیں، مذہب رکھتے ہیں، سب سے زیادہ پاک اور سچا!! ہدایت نامہ رکھتے ہیں، مذہب رکھتے ہیں، دین و دنیا میں اعلیٰ سے اعلیٰ ترقی کے درجہ پر پہونچانے والا رسول رکھتے ہیں۔ اسلامی جوش سے بھرا ہوا۔ اولاد رکھتے ہیں ہر قسم کی قابلیت حاصل کرنے والی! طبیعتوں میں فیاضی، اور دماغوں میں اولوالعز بھی کچھ کچھ باقی ہے۔ ایسی حالت میں اگر ہماری کانفرنس کی تجویزوں پر عمل ہو تو کیا وجہ ہے کہ پھر ہم ترقی نہ کریں، اور کیا سبب ہے کہ ہماری ان کوششوں کا جلد یا دیر میں کوئی نتیجہ حاصل نہ ہو۔ مگر یہ ضرور ہے کہ کوشش سچے دل سے ہو اور برابر جاری رہے۔ اور کسی قسم کی مخالفت اور کسی طرح کی دشواری سے ہمت پست نہ ہونے پائے۔

اے حضرات۔ ہم جو یہ خیال کرتے ہیں کہ ہماری کوششوں میں کامیابی نہیں ہوتی غلط ہے بلکہ اصل یہ ہے کہ درحقیقت ہم کچھ کوشش ہی نہیں کرتے، جس کو ہم کوشش سمجھتے ہیں وہ فی الحقیقت بوالہوسی ہے، اوّل تو کاہلی ہم کو کچھ کام ہی نہیں کرنے دیتی اور اگر کرتے ہیں تو اس پر ثابت قدم نہیں رہتے اگر کاہلی اور بوالہوسی ہم سے جاتی رہیں تو ہمارے کاموں کے نتیجے ضرور ظاہر ہوں کیا آپ نہیں دیکھتے ہیں کہ بہت سے لوگ ایسے ہیں کہ جن کے دلوں میں کبھی کبھی اچھے کاموں کا جوش اٹھتا ہے اور لوگوں کو بڑے بڑے کام کرتے دیکھ کر وہ بھی کچھ کرنا چاہتے ہیں، مگر کام کرنے سے پہلے اُس کی

کامیابی کے متوقع ہوتے ہیں۔ اگر لوگوں نے اُن کی تعریف کی، اُن کے کام کو اچھا کہا، تو اُن کا شوق بڑھتا ہے لیکن اگر اعتراضات کی بوچھار ہونے لگی اور رسم و رواج کی مخالفت سے اُن پر طعنے کئے جانے لگے، یا کسی اور قسم کی مشکلات پیش آئیں اور مزاحمتیں ہونے لگیں تو اُن کی ہمت ٹوٹ جاتی ہے، ان کا ولولہ سرد ہو جاتا ہے۔ ایسے لوگوں کو اپنے نفس پر اتنا بھی اعتماد نہیں ہوتا کہ وہ کسی قسم کی مخالفت اور دشواری کی برداشت کریں، اور جس کام کو شروع کیا ہے اس پر ثابت قدم رہیں۔ پھر بعض لوگ ایسے بھی ہیں کہ اپنے ارادوں میں ثابت قدم اور اپنی کوششوں میں مستقل نہیں رہتے ہیں، اور یہی بیماری ہے، جو ہم مسلمانوں میں وبا کی طرح پھیلی ہوئی ہے اور جس کا نام کاہلی ہے۔ یہ کمبخت کاہلی ہم کو وہ کام بھی نہیں کرنے دیتی جو ہم کر سکتے ہیں۔
کسی دانا نے خوب کہا ہے کہ ہر متحرک کل جو چلتی رہتی ہے جس پر قوت متحرکہ کام نہیں کرتی اس ساکن نقطہ پر سے گذر جانا نہایت مشکل ہوتا ہے۔ یہی حال ہماری طبیعتوں کا ہے کہ ہمارے سب عضو اور کل تحریک دینے والے اسباب بیکار ہو جاتے ہیں، اور ہم کام کرنا شروع نہیں کرتے ہیں یا کرتے ہیں تو اُس پر ثابت قدم نہیں رہتے اگر ہم اس نقطۂ سکون سے گذر جائیں تو سب کچھ کر سکتے ہیں اور اس کاہلی پر بوالہوسی اور خیال کی بلند پروازی مزاجوں میں اس قدر ہے کہ جو کام ہم کر سکتے ہیں اُسے تو کرتے نہیں بلکہ ہمیشہ کسی بڑی چیز کا خیال قائم کرتے اور اپنے ذہن میں بڑا بلند نمونہ ٹھیرا لیتے ہیں۔ ہمالیہ پہاڑ کی چوٹی پر چڑھنے کو منتہائے خیال بنا رکھا ہے اور زمین پر دو قدم چلنے کا ارادہ تک نہیں کرتے، حالاں کہ اگر ہم اپنے آپ کو بکار آمد بنانا چاہتے ہیں تو سب سے بہتر طریقہ یہ ہے کہ جو کچھ ہم سے ہو سکے اُسے کریں۔ بڑے کاموں کے انتظار میں نہ بیٹھے رہیں۔ اور بڑے کام کی ہوس میں چھوٹے کام کرنے سے بھی باز نہ رہیں، اس لئے کہ یہ فرض نہیں ہے کہ بڑے بڑے کام کریں، بلکہ جو کچھ ہم سے بن پڑے اُسے کرنا چاہئے تاکہ ہمارا جوش بیکار نہ جائے۔
اے صاحبو۔ ہماری زندگی میں کیسا کچھ انقلاب ہو جائے اگر اس بات کا مصمم ارادہ کرلیں کہ جو کچھ ہم سے بن پڑے اُسے ہر روز کریں۔ چھوٹے چھوٹے کام مل کر بڑا کام ہو جاتا ہے، اور کچھ کچھ کرنے سے بشرطیکہ استقلال کے ساتھ اور ہمیشہ ضبط کے ساتھ ہوتا ہے، ہم بڑے کام کر سکتے ہیں۔ دیکھو جب ہم چلتے ہیں یا کسی پہاڑ پر چڑھنا چاہتے ہیں اور ایک قدم اٹھاتے ہیں دوسرا آپ سے آپ اُٹھ جاتا ہے اور آہستہ آہستہ چلنے سے ہم ایک روز اپنی جائے مقصود پر پہنچ جاتے ہیں۔
ہماری اس کانفرنس کی نسبت کہا جاتا ہے کہ اس نے کچھ عملی کام نہیں کیا، اور ہم بھی اسے تسلیم کرتے ہیں مگر اس کا سبب یہی ہے کہ ہم میں سے ہر ایک سر سید بننا چاہتا ہے اور اُسی کام کے کرنے کا ارادہ رکھتا ہے جو انھوں نے کیا، مگر چھوٹے چھوٹے کام جو معمولی پڑھا لکھا بھی کر سکتا ہے اس کے کرنے پر توجہ نہیں

کرتے مثلاً اسی کانفرنس میں مسٹر بیک کی تجویز پر یہ امر قرار پایا تھا کہ مسلمانوں کی ترقی تعلیم کا حال، اور جو مسلمان لڑکے اسکول اور کالجوں میں تعلیم پاتے ہیں اور جو نہیں پاتے، ان کی تعداد دریافت کی جائے اسے لوگوں نے صرف پسند ہی نہیں کیا، بلکہ اس کی نسبت کہا گیا کہ یہ وہ تجویز ہے جس نے مردہ کانفرنس کو زندہ کر دیا۔ اس کام کے لئے کمیٹیاں مقرر ہوئیں، کارسپانڈنٹ مقرر کئے گئے، نقشوں کے نمونے بنائے گئے، بہت سے لوگوں نے اس کام کو اپنے ذمہ بھی لیا، مگر نتیجہ اس کا بقول ہمارے معزز سکرٹری کے ہیچ نہ شد، اور اس کا سبب یہی ہے کہ بعض نے کاہلی سے اور بعض نے اس خیال سے کہ یہ کام خفیف ہے اس کے کرنے کا ارادہ ہی نہیں کیا اور اس کاہلی اور بوالہوسی کے ساتھ ایک اور بیماری ہم کو گھیرے ہوئے ہے جس کا نام خود غرضی ہے کہ جس کام میں کوئی ذاتی منفعت نہ ہو، اور جس کام کے کرنے میں ہم کو شہرت اور عزت پیدا کرنے کی توقع نہ ہو اس کے کرنے کا خیال بھی ہمارے دل میں نہیں آتا، اور دوسروں کے لئے کام کرنے کی طرف حَسْبَةً لِلّٰہِ، یا حَسْبَةً لِلْقَوْمِ ہماری طبیعت ہی نہیں آتی اور اسی وجہ سے ہم وہ کام بھی جس کو نہایت آسانی سے کر سکتے ہیں اور جس کے کرنے میں ہمیں کچھ بھی تکلیف نہیں ہوتی نہیں کرتے، ہماری زندگی ختم ہو جاتی ہے اور دوسروں کی طرف سے بے فکری اور خود غرضی کوئی قومی کام نہیں کرنے دیتی، ورنہ بہت سے آدمی ہماری قوم میں ایسے موجود ہیں جن کو خدا نے سب طرح کے وسائل دیے ہیں اور ہر طرح کے موقعے اُن کو حاصل ہیں۔ اگر وہ چاہیں تو ہر روز دوسروں کے لئے رحمت کا فرشتہ ہو سکتے ہیں۔ اور اس میں انھیں اس سے زیادہ زحمت نہیں ہو سکتی جتنی انسان کو مٹھی کھولنے میں ہوتی ہے۔ لیکن انھوں نے اپنے آپ کو ایک مستحکم قلعہ میں بے فکری سے بند کر رکھا ہے اور خود غرضی اور نفس پروری کا ایسا مضبوط پہرا بٹھا رکھا ہے کہ کوئی مدد کا طالب اس کے اندر داخل نہ ہو سکے اور نہ اُن سے مدد طلب کر سکے۔

پھر ان سب مصیبتوں سے بڑھ کر وقت کا ضائع کرنا، اور آج کے کام کو کل پر چھوڑنا ہے حالاں کہ انسان کی زبان میں کوئی لفظ گناہ اور حماقت اور عہد شکن اور برباد شدہ امیدوں اور فرائض کے ترک کا ذمہ دار نہیں ہے جیسا کہ لفظ کل کا ہے۔ دن گزرتے چلے جاتے ہیں، عمر ختم ہو جاتی ہے مگر ہماری کل کبھی ختم نہیں ہوتی ؎

ہر شبے گویم کہ فردا ترک ایں سودا کنم
باز چوں فردا شود امروز را فردا کنم

پس اے میرے عزیزو اور دوستو۔ ہم جو اپنے کسی کام کا نتیجہ نہیں دیکھتے اس کا سبب یہ نہیں ہے

کہ ہم کام کرتے ہیں، اور قانون قدرت کے خلاف ہم کو کامیابی نہیں ہوتی بلکہ درحقیقت ہم کچھ کام ہی نہیں کرتے، اور نہ کچھ کوشش! بلکہ بغیر بونے کے ہم پھل پانے کی ہوس رکھتے ہیں ورنہ دیکھو تمھاری ہی قوم میں ایسے آدمی بھی موجود ہیں جنھوں نے کوشش کی اور کام کیا اور اس کے نتیجے دیکھے۔ تمھارے سامنے یہ بزرگ سید بیٹھا ہوا ہے جس نے اپنے نفس پر اعتماد کیا اور صدق دل سے کوشش کی، اس نے اپنے کام کا نتیجہ پایا، اور ایک ایسی چیز کو جس کا ہونا سان گمان میں نہ تھا، اور جو ہمارے قیاس اور گمان سے باہر تھا کر دکھایا۔ اس نے ایک ایسا بیج بویا جس کی نسبت کسی کو توقع نہ تھی کہ اُگیگا۔ مگر وہ اُگا اور بڑھا اور پھل لایا جس کے پھل پھول اس وقت ہم اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں اور امید ہے کہ وہ روز بروز بڑھتا جائیگا اور اس کے پھل پھول سارے ہندوستان میں جب تک مسلمانی نام قایم ہے نظر آتے رہینگے۔

یہ کانفرنس بھی درحقیقت اسی کی کوشش سے قایم ہوئی ہے، اور وہی اس کو چلا رہا ہے، اور اگر ہم زندہ ہیں تو انشاء اللہ تعالیٰ اس کے بھی ایک دن عمدہ نتیجے دیکھیں گے اگر تم سے اور کوشش نہیں ہو سکتی تو اُس کو ذرا سہارا دیتے رہو اور اس کی عمر کی درازی کی دعا کرتے رہو، اگر خدا تمھاری دعا قبول کرے اور امید ہے وہ قبول کریگا اور چند سال اُس کا سایہ ہم پر قایم رہے تو یہ بوڑھا سید تم کو دکھا دے گا کہ اُس کا یہ بیج بھی ضایع نہیں ہوا اور وہ بھی بڑھا اور پھل پھول لایا ؎

قدر سرسید شناسید اے خردمندان قوم	ذات او شد در حق ما رحمت پروردگار
ناخنِ تدبیر او ہر عقدۂ مشکل کشاد	شاہبازِ عقل او او ہام را کردہ شکار
از طفیل اوست ایں جلوہ کہ می آید نظر	اے خداوند از ازل تا دیر او را زندہ دار



نواب عماد الملک مولوي سيد حسين بلگرامي بهادر
صدر اجلاس يار دهم کانفرس (ميرٹهه سنه ۱۸۹۶ ع)

اجلاس یازدہم

(منعقدہ میرٹھ سنہ ۱۸۹۶ء)

صدر نواب علی یار خاں بہادر مؤتمن جنگ عماد الدولہ عماد الملک مولوی سید حسین صاحب مرحوم بلگرامی

حالاتِ صدر

نواب عماد الملک بہادر کی متاع زندگی کیا بہ لحاظ جوہر علم و فضل کے اور کیا درجۂ امارت و منصب کی سربلندی کے اور کیا باعتبار اپنی لاثانی سیرت علم کی شیفتگی اور علم کی قدر دانی کے ایسی غیر معمولی عالی شان ہستی تھی جس کے لئے ایک دور رس اور حقیقت نگار قلم کی روانی اُن کے فرائض سوانح نگاری سے عہدہ برآ ہونے کے لئے دعوے دار ہو سکتی تھی لیکن موجودہ میدان کی تنگی اور اپنی علمی بے بضاعتی اور کم مائگی دونوں باتیں اس مہم کے سرانجام کرنے میں قاصر اور عاجز ہیں۔

دماغی اور ذہنی سائیکالوجی کا جو بھی ماہر فن یا انسانی حالات و کیفیات زندگی کا جو بھی حقیقت شناس نواب صاحب کی فطرت عالی اور قوائے دماغی کی ترتیب و تہذیب پر نقد و تبصرہ کرنے بیٹھے گا یا جو واقعات کار مالی آپ کی بہار زندگی کی پرکیف اور رنگا رنگ کیاریوں سے بہ عنوان شائستہ گل چینی کر کے گلدستہ ترتیب دیگا تو اس وقت دنیا کو معلوم ہو گا کہ مسلمانوں کے پژمردہ کشت زار علم و فن میں عماد الملک کی ذات ایسا گل سرسبد ہو کر پھلا اور پھولا جس کی خوشبو اور مہک نے نہ صرف مشام قومی کو فرحت

اور تازگی بخشی بلکہ اقوام متمدانہ بھی اُس کی نزہہت اس کی لطافت اور رنگینی سے کیف اندوز ہوئیں ہم تو بس اتنے کام کے ہیں اور ہمارا اتنا ہی مقصد ہے کہ بحیثیت صدر کانفرنس اس مجموعہ کے ناظرین کا نواب صاحب سے تعارف کرادیں اور ضمناً مختصر طور پر سادہ واقعات اور حالات کا انکشاف کردیں جب ان حالات کا لوگ مطالعہ کریں گے اور نواب صاحب کے گلزار زندگی کی ایک اوپری جھلک سے آشنا ہوں گے تو مصداق ؎

قیاس کن زگلستان من بہار مرا

کیا عجب کوئی خدا کا بندہ اُس علامۂ زماں کی سیرت نگاری کا فرض ادا کرنے کے لئے تیار ہو جائے قصہ کوتاہ نواب عماد الملک کے آبا و اجداد ۶۱۴ھ مطابق ۱۲۱۷ء میں قصبہ بلگرام من مضافات (لکھنؤ) میں بزمانہ سلطان شمس الدین التمش سکونت پذیر ہوئے آپ کے جد اعلیٰ سید محمد صغریٰ تھے جو سلطان وقت کے رفقا میں سے تھے ہندو راج سے جنگ کرکے بلگرام اور نواح بلگرام پر قبضہ حاصل کیا اس نصرت اور فتح کے بعد سے بلگرام سادات حسینی اور واسطی کا مسکن اور مرکز قرار پایا۔

سید محمد صغریٰ عارف کامل اور پاک باطن بزرگ تھے۔ اُن کے کمالات ظاہری و باطنی کے طفیل میں یہ سرزمین ظلمت کدۂ کفر و ضلالت، علوم اسلامی اور ہدایت و ارشاد کی منڈی، درس شریعت کا مخزن اور اسرار و حقایق کا گہوارہ بن گئی۔ بلگرام کی خاک نے اولیاء کاملین سے لے کر بیسیوں علماء، شعراء اور ایسے نامور ادیب پیدا کئے جن کی شہرت کا نقارہ آج بھی فضاء عالم میں اپنی آواز بلند کر رہا ہے اگر ایک طرف حضرت قطب الاقطاب میر سید عبد الجلیل اور حضرت سید شاہ برکت اللہ صاحب بلگرامی ثم المارہروی جو اپنے زمانہ کے اکابر اولیا کی صف اول میں صاحب ارشاد مانے جاتے تھے اور آج سرزمین (مارہرہ) میں راحت گزیں ہیں حضرت سید محمد صغریٰ کی فرزندی سے منسوب تھے تو دوسری طرف علامہ عبد الجلیل، علامہ آزاد، علامہ سید محمد مرتضیٰ، علامہ میر عبد الواحد جیسے عالم، فاضل، ادیب شاعر بھی اسی نہال سعادت کے ثمر شیریں تھے جن کی نسل کی بیلیں دنیا میں پھیل کر پھولیں اور پھلیں اور ایک عالم کو علمی اور روحانی فیض پہونچانے میں کامیاب ہوئیں اُن کے علم و عمل کی عالمگیری کا یہ اثر تھا کہ عالمگیر جیسا بادشاہ جب بلگرام کا ذکر کرتا تھا تو اس کی خصوصیات اور علمی بنا پر فخریہ کہا کرتا تھا کہ "بلگرام شیراز ولایت ماست"۔ مگر امتداد زمانہ سے دور سعادت میں جوں جوں دوری ہوتی گئی اور مسلمانوں کے اعمال زندگی اوامر و نواہی کی پابندی سے آزادی اختیار کرتے چلے گئے تو توفیق ایزدی بھی اُن سے آہستہ آہستہ کنارہ کرتی چلی گئی اور "اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِہِمْ" کے فرمان کی تعمیل پوری ہوئی۔

آہ! جس بحر بیکراں نے ایسے ایسے گوہر گراں مایہ پیدا کئے تھے اور جس کان کے جواہر آبدار کی چمک نے دنیا میں علم وفضل تہذیب واخلاق کی روشنی پھیلائی تھی اور انکشاف حقائق کائنات کی بوقلمونی سے باغ عالم میں رنگ رنگ کی کیاریاں سجائی تھیں حیف کہ اس موسم بہار کی بھی مدت گذری کہ رت بدل گئی ؎

دن ایک سے نہیں کبھی لیل و نہار کے
کچھ دن چڑھاؤ کے ہیں تو کچھ دن اتار کے

تاہم اس مٹی میں سعادت واقبال کے جو بیج رلے ملے اور دبے دبائے پڑے ہوئے تھے پھر آب وہوا کی موافقت اور موسمی اختلاط پاکر پھوٹے بغیر نہ رہے۔ اکتوبر ۱۸۴۲ء میں مقام صاحب گنج (ضلع گیا) میں سید زین الدین حسنی کے نہال امید میں برگ و بار آئے۔ سید حسین (عماد الملک) پیدا ہوئے۔ آثار خوش طالعی وخوش بختی نے نوید دی سید زین الدین (بہار میں ڈپٹی مجسٹریٹ تھے) سید حسین کی عمر کی ابھی پانچ منزلیں بھی پوری نہ ہوئی تھیں کہ ماں کی گود سے جدا ہوگئے باپ نے آغوش شفقت میں لے کر سات برس کی عمر میں مکتب میں بٹھا دیا حروف شناسی کے بعد قرآن شریف اور فارسی کی مختصر تعلیم دے کر عربی تعلیم کی طرف پوری توجہ کی گئی۔ ذہانت اور حافظہ اس بلا کا تھا کہ چودہ برس کی عمر میں صرف ونحو میں میزان منشعب سے لے کر شرح ملا معہ حاشیہ عبدالرحمٰن تک اور منطق میں صغریٰ کبریٰ سے لے کر شرح تہذیب وقطبی اور اس کے بعد میبذی اور مختصر المعانی پر حاوی ہوگئے عمر کے لحاظ سے چودہ برس ختم نہ ہوئے تھے کہ تحصیل علم عربی کے بعد انگریزی شروع کرائی گئی بھاگل پور پٹنہ اور کلکتہ کے اسکولوں میں فقط ڈھائی سال پڑھ کر ۱۸۶۲ء میں انٹرنس کا امتحان فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا نتیجہ میں پندرہ روپیہ کا وظیفہ قابلیت حاصل کیا اور ۱۸۶۳ء میں پریسیڈنسی کالج سے ایف اے کا امتحان بھی اول درجہ میں پاس کرکے اب کے وظیفہ قابلیت پچیس روپیہ ماہوار پایا ۱۸۶۴ء میں جب تھرڈ ایر کلاس میں تھے اس وقت باپ بیٹے کو بلگرام ساتھ لائے اور شادی کردی ۱۸۶۵ء سے پھر پڑھا اور ۱۸۶۶ء میں بی اے کی ڈگری کلکتہ یونیورسٹی سے اول درجہ میں حاصل کرکے سترہ برس کی عمر میں جو طالب علمی کا معمولی زمانہ ہے سید حسین علوم مشرقی اور مغربی کے فاضل بن گئے۔

باپ ڈپٹی کلکٹر چچا نامور صدر الصدور بیٹا اور بھتیجہ فاضل روزگار چاہتے تھے کوئی بڑا منصب سرکار میں ملے اس وقت کا زمانہ منصب اور عہدے کی تلاش کے لئے وقت طلب نہ تھا اور جہاں یہ وجاہت اور علمی قوت موجود ہو بڑے سے بڑا عہدہ اور نوکری مل سکتی تھی لیکن مولوی سید حسین کی علمی تشنگی ابھی فرو نہ ہوئی تھی، اور نگ حکومت پر نشست کرنے کے بجائے درس وتدریس کی مسند کو

پسند کرکے کیننگ کالج میں بیٹھے، عربی کی پروفیسری قبول کرلی اور چھ برس تک اس علمی خدمت کے ذریعہ سے تعلیم دیتے بھی رہے اور تعلیم حاصل کرتے بھی رہے۔ لکھنؤ کے اہلِ کمال میں پت جھڑ کا موسم شروع ہوگیا تھا تاہم اگلی صحبتوں کی یادگاریں باقی تھیں ہر مجلس میں پہونچے اور فیضِ صحبت حاصل کرکے خوشہ چینی کی، ان دنوں میرانیس زندہ تھے اُن کو دیکھا، سنا، اور برتا۔

انھیں دنوں میں جب کہ آپ کیننگ کالج میں پروفیسر تھے، انجمن تعلقہ داران لکھنؤ کی جماعت کی طرف سے اخبار "لکھنؤ ٹائمس" جاری تھا اخبار مذکور بھی مولوی صاحب ہی ایڈٹ کرنے لگے، اخبار مذکور کی ایڈیٹری نے اسی زمانہ میں اُن کے زورِ قلم کا سکہ جما دیا تھا اور اُن کی انگریزی انشا پردازی کا بڑے سے بڑا انگریز اعتراف کرنے لگا تھا۔

۱۸۷۳ء میں سر سالار جنگ اول کا کسی تقریب سے لکھنؤ آنا ہوا، سر موصوف کو حیدرآباد کے لئے قابل لوگوں کی تلاش تھی جنرل بیرو نے سالار جنگ سے مولوی صاحب کا تعارف کرایا، سالار جنگ بڑے مردم شناس تھے بیک نظر جوہر شناس نے گوہر کو پرکھ لیا، اور جون ۱۸۷۳ء میں مولوی سید حسین سر سالار جنگ کے پرائیویٹ سکریٹری بن کر لکھنؤ سے حیدرآباد چلے گئے۔

۱۸۷۶ء میں سالار جنگ کو سفر یورپ پیش آیا تو مولوی صاحب ہم رکاب تھے، واپسی یورپ کے بعد معتمدی خانگی کے علاوہ معتمدی امور متفرقہ کی خدمت بھی تفویض ہوئی جس کا ایک شعبہ تعلیمات تھا ۱۸۸۴ء میں اعلیٰ حضرت غفران مکان کی مسند نشینی کی تقریب میں مولوی سید حسین "علی یار خاں مؤتمن جنگ" کے خطاب سے سرفراز ہوکر پیشگاہ اعلیٰ حضرت میں پرائیویٹ سکریٹری مقرر ہوئے اس منصب جلیلہ پر لیاقت و قابلیت کے جوہر کھلنے کا وقت آگیا تھا لہٰذا یہ سلسلہ خدمات سرفرازی پر سرفرازی ہوتی چلی گئی۔ اور نہایت محبوب خطاب "عماد الدولہ عماد الملک" سے بہرہ ور کئے گئے جس کی دل کش اور دل آویزی نے نام اور کام کی تمام خصوصیات شہرت کو اپنے مختصر حروف میں جذب کرلیا ہے، اور اب اس نام اور خطاب کی جو عزت علمی دنیا میں ہے یا لوگوں کے قلوب میں ہے اس کا اندازہ وہی کرسکتے ہیں جو اس بحر بیکراں کے علم معانی کا اندازہ داں ہیں۔

حکومت آصفیہ کی حدود میں تعلیمی سطح بہت پست تھی اس لئے انھوں نے اپنی فطری مناسبت کے لحاظ سے دیگر اعلیٰ مناصب سے قطع تعلق کیا اور نظامت تعلیمات کے اعلیٰ عہدہ دار کی حیثیت سے تیئیس برس تک اس خدمت پر مامور رہے اور اس لحاظ سے اپنی عمر اور اپنی قابلیت کا بڑا زمانہ اشاعت تعلیم اور ترتیب تعلیم کی نذر کردیا ۱۹۰۷ء میں وہ نظامت تعلیم کے عہدہ سے وظیفہ یاب

ہوکر سبکدوش ہوئے سررشتہ تعلیم کو جب سے کہ آپ نے اپنے ہاتھ میں لیا تعداد مدارس اور تعداد طلبہ میں بہت زیادہ ترقی ہوئی آپ نے اپنی اصابت رائے اور شیفتگیٔ علم کے لحاظ سے بہت سی مشکلات پر غالب آنے کی کوشش فرمائی۔ وہ بحیثیت ماہر فن کے مسئلہ تعلیم کے متعلق حسب ذیل خیالات رکھتے تھے:

۱۔ تعلیم ایک ذریعہ ہونا چاہیئے تہذیب نفس و تزکیہ اخلاق کا۔ تربیت تعلیم کا لازمی نتیجہ ہے بغیر تربیت کے تعلیم غیر مفید ہی نہیں بلکہ مضر ہوتی ہے، مغرب میں تعلیم و تربیت دوش بدوش چلتی ہیں مشرق میں مغربی تعلیم کو تربیت سے الگ کرکے رائج کرنے کے نتائج لازمی طور پر مضر ہوں گے۔

۲۔ رٹ رٹا کر امتحان پاس کرنے کا طریقہ ہر حیثیت سے مذموم و مضر ہے اس کے بجائے کنڈر گارٹن پیر اسکولوں کو رواج دینا چاہیئے۔

۳۔ تعلیم کا اصل الاصول شفقت اور تربیت ہونا چاہیئے۔

۴۔ بچوں کی اتالیقی کے لئے تعلیم یافتہ استانیاں موزوں ہوتی ہیں۔

نواب عماد الملک بہادر کہنے کو ساری عمر حیدرآباد میں رہے اور ایک سلطنت کے بلند پایہ رکن کی حیثیت سے اس امر کے بہت کم مواقع تھے کہ آپ حیدرآباد کے علاوہ بیرون حیدرآباد کے مسلمانوں کی علمی، معاشرتی اور تمدنی تحریکات میں رہبری فرماتے، لیکن انھوں نے ہمیشہ اور ہر زمانہ میں جو مفید تحریکات مسلمانان ہندوستان کی ترقی اور بہبودی کے متعلق پیش ہوئیں ان میں کافی دلچسپی اور توجہ کے ساتھ قدمے، درمے، سخنے مدد کی اور نہ صرف مدد کی بلکہ کام کرنے والوں میں حوصلہ اور امنگ پیدا کرنے کی کوشش کی۔

سرسید علی گڑھ اسکول اور علی گڑھ تحریک کے بانی تھے نواب عماد الملک سرسید کے کاموں میں شروع زمانہ سے شریک کار نظر آتے ہیں سرسید کی مدد نہ صرف خیالات سے کی بلکہ ہر موقع پر فیاضی کے ساتھ اپنی جیب سے مدد دی نیز اپنے اثر سے حکومت آصفیہ کو بارہا مدد دینے کی کامیاب ترغیب کی۔ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے قیام کے پہلے دن سے نواب صاحب سرپرست و معین و مددگار کی حیثیت سے نظر آتے ہیں، چنانچہ دو مرتبہ ایک سنہ ۱۸۹۶ء میں بزمانہ حیات سرسید وہ اجلاس میرٹھ کے صدر منتخب ہوئے اور دوسری مرتبہ سنہ ۱۹۱۰ء میں اجلاس ریاست رامپور کی صدارت بھی انھوں نے ہی فرمائی۔

دار المصنفین اعظم گڑھ جو ایک محض علمی مجلس ہی اور علامہ شبلی مرحوم کی یادگار میں نہایت مفید خدمت انجام دے رہی ہی نواب صاحب شروع سے اس کے سرپرست رہی۔

انجمن ترقی اردو جو آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا شعبہ ہی پہلے دن سے نواب صاحب کی اعانت اور ہمدردی کا رہین منت ہی۔

جب نوجوانان قوم نے زیر سرپرستی نواب زادہ پرنس حمید اللہ خاں صاحب سی آئی ای آف بھوپال ۱۹۱۶ء میں بمقام دہرہ دون سلطانیہ کالج قایم کرنے کا ارادہ ظاہر کیا تو نواب صاحب کا دست کرم اس کی اعانت کے لئے سب سے پہلے بڑھا۔

تہذیب و اشاعت کتب قدیمہ کا جو جدید سررشتہ سرکار دکن کی توجہ سے قایم ہی اس کی کامیابی کی ذمہ داری انھیں کے ضعیف کندھوں پر رہی علیگڑھ کالج میں کلیات خسرو کی اشاعت کا اہتمام انہی کی علمی تحریک سے ہوا ۱۳۰۸ ہجری میں کتب خانہ آصفیہ قایم ہوا وہ انھیں کی مساعی حسنہ کا نتیجہ ہی۔

انگریزی ترجمہ کلام مجید کی طرف ان کا مائل ہونا یہ ایسی علمی اور مذہبی خدمت تھی جس کی ضرورت زمانہ دراز سے مسلمانوں کو محسوس ہو رہی تھی گو قرآن مجید کے تراجم انگریزی میں موجود تھے لیکن اس کے مترجم عیسائی عالم تھے جنھوں نے تعصب کے ساتھ مخالفانہ رائیں قائم کرنے کے علاوہ قدم قدم پر کلام پاک کا مفہوم سمجھنے میں ٹھوکریں کھائیں ہیں اور وہ نور حقیقت اُن کے ترجموں سے ظاہر نہیں ہوتا جو کلام پاک کا واضح مقصد ہی۔ ایک زمانہ میں علامہ شبلی نے ندوۃ العلماء کے اجلاس میں اس تحریک کو بڑی شد و مد کے ساتھ پیش کیا اور نواب عماد الملک بہادر کو آخر کار اس اہم ذمہ داری کے لئے راضی کر لیا' اور نواب صاحب موصوف ہمہ تن مصروف ترجمہ ہو گئے حسن اتفاق سے انہیں دنوں میں جب کہ نواب صاحب ترجمہ میں مصروف تھے مولوی حمید الدین صاحب بی اے اعظم گڑھی برادر عم زاد علامہ شبلی جو علوم قرآن کے ہندوستان میں بڑے جیّد عالم ہیں نواب صاحب کے ساتھ بطور مشیر کے شریک ترجمہ ہو گئے تھے۔

افسوس کہ ترجمہ مذکور تکمیل کو نہ پہونچ سکا اور سولہ سترہ پاروں پر پہونچ کر کام رک گیا[1] اور نواب صاحب کی خرابی صحت نے اس مقدس خدمت کی تکمیل نہ ہونے دی تاہم جو ترجمہ ہو چکا ہی جب کبھی اس کے شایع ہونے کی نوبت آئے گی تو دنیا کو اس ترجمہ کے اعجاز نواب صاحب کی انگریزی علم ادب کی بلاغت اور فصاحت اور ترجمہ کے ساتھ معانی و مطالب میں کافی طور سے حزم و احتیاط تحقیق و تفتیش کی اندازہ

---

[1] ترجمۂ مذکور کا مسودہ دار المصنفین اعظم گڑھ میں مولانا سید سلیمان صاحب ندوی کی تحویل میں موجود ہی

کا موقع ملے گا۔

مدراس یونیورسٹی کے آپ قدیم فیلو تھے سنہ ۱۹۱۶ء میں یونیورسٹی چانسلر (گورنر مدراس) کا نوکیشن ایڈریس دینے کے لئے آپ کا انتخاب کیا تھا اس موقع پر جو خطبہ آپ نے دیا اس کے مطالعہ سے آپ کی عالمانہ شان اور بصیرت علمی کا پتہ چلتا ہے۔

ہندوستان کی یونیورسٹیوں کے حالات کی تفتیش میں جب لارڈ کرزن وائسرائے ہند نے کمیشن مقرر کیا تو اس کے ایک ممبر عماد الملک بہادر ہی تھے۔ انھوں نے نہ صرف تعلیمی امور میں اپنی رہبری کو وقف قوم کیا تھا بلکہ موقع ملنے پر سیاسی رہبری کرنے سے بھی منہ نہیں موڑا وہ شروع شروع میں سیاسی امور میں مسلمانوں کی شرکت کو پسند نہیں کرتے تھے انھوں نے اپنے اس اعتقاد کو زبردست انگریزی تحریر کے ذریعہ سے پیش کر کے اس کے مضر نتائج سے قوم کو خبردار کرنے کی کوشش کی تھی لیکن سنہ ۱۹۰۶ء میں جب وقت آیا اور نواب محسن الملک سر آغا خاں کی سرگروہی میں مشہور ڈیپوٹیشن شملہ لے کر گئے تو اس کے ایڈریس کی تکمیل بھی عماد الملک ہی کے زور قلم کا نتیجہ تھی جس نے ہندوستان سے لے کر انگلستان تک دعوے کے استدلال، متانت کے ساتھ طرز ادا کے لئے خراج تحسین حاصل کیا۔

سنہ ۱۹۰۹ء میں انڈیا کونسل کی ممبری پر مسلمانوں میں بہ حیثیت ممبری جس مسلمان نے سب سے پہلے نشست فرمائی وہ عماد الملک ہی تھے لیکن بوجہ علالت دو سال سے زیادہ آپ انگلستان میں قیام نہ کر سکے اور حیدرآباد واپس آگئے جامعہ عثمانیہ کا قیام اس کی تکمیل اور تشکیل نواب صاحب کی اصابت رائے اور علمی شگفتگی کی ممنون منت رہیگی۔ عماد الملک ہر لحاظ سے صاحب کمال تھے عمر نے بھی کمال کا درجہ حاصل کیا انتقال سے دو ایک برس پہلے صحت بہت خراب ہوگئی تھی تاہم مسہری پر یا آرام کرسی پر سب سے بہتر مشغلہ آپ کا مطالعہ کتب تھا بالآخر چوراسی برس کی عمر میں غایت درجہ کی نیک نامی عزت نفس اور شہرت جاوید کے ساتھ ۳ رجب سنہ ۱۹۲۶ء بروز جمعہ کو سرزمین حیدرآباد میں روپوش عالم فانی ہوگئے مقام دفن (امپرسٹ) خود ہی تجویز کر دیا تھا۔ امجد نے قطعہ تاریخ لکھا جو لوح مزار پر حسب ذیل کندہ ہے

رحمت حق از لب امجد بگفت	بلگرامی مولوی سید حسن
یا عماد الملک اُدخُل جنتی	رفت در ظلِ حسین ابن علی

خطبۂ صدارت

جناب سرسید و دیگر ممبران کانفرنس! اس وقت میرے دل پر ایک کیفیت طاری ہے جس کو میں کسی طرح الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا۔ یہ کیفیت مثل اس حالت کے جس کو میرے عالی قدر دوست نواب محسن الملک نے ابتدا میں بیان کیا تھا ایک مرکب کیفیت ہے جس میں مسرت اور افسوس دونوں ہیں مسرت اس بات کی ہے کہ میں اپنے گرد ایک نہایت معزز اور شاندار قومی گروہ دیکھتا ہوں جو دور دراز مقامات سے اس جگہ مجتمع ہوئے ہیں اور رنج اس بات کا ہے کہ میرے نہایت معزز دوست سردار محمد حیات خاں بہادر نے اس معزز منصب کو جو مجھ کو دیا گیا ہے بوجہ ایک دردناک واقعہ کے پیش آنے کے قبول نہیں کیا اور ان کے قبول نہ کرنے سے یہ بار گراں ایک ایسے دورافتادہ شخص پر ڈالا گیا ہے جو اپنے تئیں اس قابل نہیں سمجھتا (چاروں طرف سے نہیں! نہیں کی صدا بلند ہوئی) مگر آپ لوگوں کے الطاف سے جس کی وجہ سے آپ نے اس عظیم الشان مجلس کا مجھ کو صدر انجمن بنایا اس مسرت و رنج کے ساتھ ایک حالت فخر و مباہات کی حاصل ہوئی ہے میں امید کرتا ہوں کہ اگر اس عہدہ سے اچھی طرح عہدہ برآ نہ ہو سکوں اور اپنے فرائض کما حقہٗ انجام نہ دے سکوں تو آپ مجھ کو معاف رکھیں گے ؎

ہر چہ ہست از قامت ناساز و بے اندام ماست
ورنہ تشریف تو بر بالائے کس کوتاہ نیست

یہ آپ کے اخلاق و محبت کا ظہور ہے کہ میں اس قدر دور دراز فاصلہ سے یہاں آیا اور آپ کے سامنے کھڑا ہوں اور راستہ کی تکلیف آپ کی مہمان داری اور مہمان نوازی نے بھلا دی ہے۔ مجھے معلوم ہوتا ہے کہ عموماً آپ حضرات کی نسبت اور خصوصاً مجلس انتظامیہ کی نسبت ایک عربی شاعر نے لکھا ہے کہ ان میں (یعنی میرے میزبانوں میں) کوئی عیب نہیں مگر یہ عیب ہے کہ جو ان میں مہمان ہوتا ہے وہ اپنے دوست احباب اور وطن کو بھول جاتا ہے۔

میرا دل ان حضرات کے شکریہ سے بھرا ہے جنھوں نے میری اس درجہ مہمان داری اور آرام رسانی کی فکر کی جس سے زیادہ آدمی کو وطن میں بھی حاصل نہیں ہو سکتی۔ اب میں اپنے فرائض منصبی کو ادا کرتا ہوں اور اعلان کرتا ہوں کہ کانفرنس کا گیارہواں اجلاس کھلا اور ارکان مجلس سے خواستگار ہوں کہ کارروائی اجلاس کی شروع فرماویں۔ فقط



نواب حاجی قسم علی خاں مرلداس

صدر اجلاس دوازدهم (لاهور سنه ۱۸۹۸ ع)

اجلاس دوازدہم

منعقدہ لاہور ۱۸۹۹ء[1]

صدر نواب حاجی فتح علی خاں صاحب قزلباش سی آئی ای رئیس لاہور

حالات صدر

نواب صاحب قزلباش مغل ہیں۔ آپ کے اسلاف قندھار کے باشندے تھے۔ افغانستان کی پہلی لڑائی میں آپ کے بزرگوں نے گورنمنٹ ہند سے مل کر اس کو کافی مدد دی اور لیفٹیننٹ جنرل علی رضا خاں جو نواب صاحب کے بزرگوں میں سے تھے انگریزوں کے ساتھ ہندوستان آئے جن کو بصلۂ حسن خدمات جنگ افغانستان آٹھ سو روپیہ ماہوار کی پنشن دی گئی۔

انھیں[2] علی رضا خاں نے غدر ۱۸۵۷ء میں دہلی اور کاسگنج کے باغیوں کے مقابلہ میں کامیاب خدمات انجام دیں اور اب کی مرتبہ "نواب گنج علی آباد" کا علاقہ ضلع بہرائچ میں خدمات جنگی کے صلہ میں پایا۔

نواب حاجی فتح علی خاں، علی رضا خاں صاحب کے جانشین ہوئے ان کے بزرگوں نے لاہور کو اپنا مسکن بنا لیا تھا جہاں ان کی اقامت کے لئے بڑی بڑی حویلیاں اور محل سرائیں تعمیر ہو گئیں وہ نہ صرف شہر لاہور کے عمائد میں شمار ہوتے تھے بلکہ صوبۂ پنجاب میں عام طور پر ان کی عزت کی جاتی تھی۔ پنجاب کے اعلیٰ حکام میں ان کا خاص احترام تھا اور (اودھ) کے تعلقہ دار کی حیثیت سے تعلقہ داروں کی جماعت میں بھی ان کی امتیازی شان قائم تھی۔ شیعہ جماعت کے مسلم رہنما و لیڈر مانے جاتے تھے۔

---

[1] [illegible] کے سبب ستمبر ۱۸۹۹ء میں کانفرنس کا اجلاس نہیں ہو سکا۔

[2] ماخوذ تحفۂ زریں مطبوعہ نول کشور پریس لکھنؤ۔

جماعت شیعہ کی تعلیمی رہنمائی میں اُن کا نام نامی شیعہ کالج لکھنؤ کے بانی کی حیثیت سے ہمیشہ عزّت کے ساتھ لیا جائے گا۔ یہ محمڈن کالج علی گڑھ کے پُرانے ٹرسٹی تھے مسلم یونیورسٹی کی ابتدائی تحریک میں انھوں نے فیاضانہ امداد دی شیعہ کالج لکھنؤ کے آنریری سکرٹری، مسلم یونیورسٹی کورٹ کے ممبر اسلامیہ کالج لاہور کی کمیٹی کے پریسیڈنٹ تھے۔ انجمن حمایت اسلام لاہور کے مختلف جلسوں میں انھوں نے خدمات صدارت انجام دی تھیں، غرض طبقۂ امرا میں نواب صاحب خلیق، متواضع، پابند مذہب، وسیع خیال، حامی تعلیم ایسے تھے جن کے اوصاف گراں مایہ عرصہ تک زمانہ کو یاد رہیں گے۔

ذیل میں اُن کا وہ خطبۂ صدارت درج کیا جاتا ہے جو ۱۸۹۸ء کے اجلاس میں پڑھا گیا تھا

خطبۂ صدارت

صاحبان اس معزز و مقتدر جلسہ کی صدارت کے لئے آپ نے جو مجھے انتخاب کیا ہے اس کا میں تہ دل سے مشکور ہوں۔ میں اپنے گرد و پیش اس قدر کثیر التعداد احباب کو دیکھ کر کچھ کم مسرور نہیں ہوا۔ اگرچہ ہم سب یہاں اپنا قومی فرض ادا کرنے کے لئے آئے ہیں تاہم آپ صاحبان کی تشریف آوری کا شکریہ ادا کرتا ہوں بدقسمتی سے چند سالوں سے ہندوستان کے بعض مقامات میں طاعون پھیلا ہوا ہے جو اب بعض صوبجات میں بھی سرایت کر گیا ہے۔ اہل ہند کو طاعون کے حملوں سے بچانے، اس کی مزید ترقی کو روکنے اور بہ نظر حفظ ماتقدم مناسب مقامات کے ریلوے اسٹیشنوں پر مسافروں کا طبّی معائنہ لازمی ہے جس کی وجہ سے ممکن ہے کہ بعض نازک مزاج مسلمانوں نے اس جلسہ کی شرکت باعث تکلیف خیال کی ہو۔ اس سے قطع نظر سال حال میں اجلاس میرٹھ کی طرح شہر بہ شہر پھر کر کانفرنس کے اغراض و مقاصد کی قوم میں منادی ہی نہیں کی گئی۔ ان کوتاہیوں پر بھی بعض معزز مسلمانوں نے اس جلسہ کی شمولیت میں جو قابل تعریف دلچسپی ظاہر کی ہے وہ بہت کچھ ڈھارس بندھانے والی ہے۔

صاحبان۔ سب سے پہلے میں اس امر پر اپنا دلی افسوس ظاہر کرنے سے باز نہیں رہ سکتا۔ اور یقیناً اس رنج و اندوہ میں آپ بھی مجھ سے متفق ہوں گے کہ سنہ رواں کے شروع میں بانی مدرسۃ العلوم علی گڑھ و محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے انتقال سے قوم کو ناقابل برداشت صدمہ اٹھانا پڑا ہے۔ ان کے بعد اگر بعض ہمدردان و بہی خواہان قوم کوشش مسیحائی نہ کرتے تو تمام قومی امیدوں پر پانی پھر جاتا۔ فقدان تعلیم کی وجہ سے مسلمانوں کا نکبت و ادبار کسی تشریح و توضیح کا محتاج نہیں، سرسید مرحوم جو ہر وقت قوم کے مردہ جسم میں مغربی سائنس اور علوم کی روح پھونکنے کے تفکرات میں رہتے تھے ۱۸۸۶ء میں انھوں نے

یہ کانفرنس قایم کی جس کے شمال مغرب اودھ اور پنجاب میں اب تک گیارہ اجلاس ہو چکے ہیں۔ گزشتہ سال میں بوجہ طاعون اس کے عدم انعقاد کا سب کو افسوس رہا۔ پس یہ پہلا اجلاس ہے جو بانی کانفرنس کے انتقال کے بعد منعقد ہوا ہے۔ ۱۸۸۸ء میں اس کا تیسرا جلسہ انجمن اسلامیہ پنجاب لاہور کے مدعو کرنے پر لاہور میں ہوا تھا اب پھر اسی بزرگ قوم یعنی میرے معظم و مکرم دوست خان بہادر محمد برکت علی خان صاحب سکرٹری انجمن موصوف کی عین دلی خواہش نہ تھکنے والی ہمت اور جوش قومی کا یہ نتیجہ ہے کہ آج ہم اس کا بارھواں اجلاس مکرر لاہور میں دیکھتے ہیں بعض اشخاص کانفرنس پر عملی کارروائی نہ کرنے کا اعتراض کرتے ہیں لیکن کانفرنس افراد قوم کا مجموعہ ہے جو مسلمانوں کو ترقی کا راستہ بتاتی ہے۔ اگر قوم اس کے بتائے ہوئے رستوں پر نہ چلے تو اس میں اس کا کیا قصور ہے۔ بالفاظ دیگر کانفرنس ایک طبیب ہے اور قوم مریض۔ اگر مریض اپنے ہمدرد طبیب کے نسخہ کا استعمال نہ کرے تو طبیب پر الزام نہیں آسکتا۔ اور اس کو مورد طعن بنانا انصاف اور دانشمندی سے بعید ہے۔

کانفرنس مختلف صوبوں کے مسلمانوں کو اخوت کے مضبوط رشتہ میں منسلک کرتی ہے دور دراز ممالک کے مسلمان یکجا جمع ہو کر قوم کی تعلیمی پست حالت پر غور کرتے ہیں۔ تبادلہ خیالات سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اس کے جلسوں سے باہم میل جول اور ارتباط و اتحاد کو ترقی ہوتی ہے۔ مختلف اقطاع ہند کے مسلمانوں میں مغایرت کا غبار روز بروز ہموار ہوتا جاتا ہے۔ گویا کانفرنس "الاسلام ملۃ واحدۃ" کی زندہ مثال ہے۔ نیز برٹش گورنمنٹ کی نسبت مسلمانوں کے اُن خیالات وفاداری کو مزید استحکام و تقویت بخشتی ہے جو پہلے سے اُن کے دلوں میں جاگزین ہیں اگر مسلمانوں کے قومی لٹریچر کی طرف خیال کیا جائے تو اُسے بھی کانفرنس کے لکچروں، مضامین رپوٹوں وغیرہ سے گراں قدر امداد و ترقی نصیب ہوئی ہے۔ اس کے جلسوں، رپوٹوں اور لکچروں کی اشاعت نے مسلمانوں کو خواب غفلت سے بیدار کر دیا ہے۔ جن ممبروں کو ان لکچروں اور اسپیچوں کے سُننے کا موقع ملتا ہے ان میں قومیت کا ولولہ تازہ ہو جاتا ہے یہی جوش و فیلنگ ہے کہ آئے دن قومی مدارس اور تعلیمی انجمنوں کے قائم ہونے کی خبریں گوش زد ہوتی رہتی ہیں۔ اور مسلمان ضروریات زمانہ سے آگاہ ہوتے جاتے ہیں۔

سب سے بڑھ کر کانفرنس کا یہ فائدہ ہے کہ یہ مسلمانوں کو "سلف ہلپ" یعنی آپ اپنی مدد کرنے کا طریقہ بتاتی ہے انگریزی میں ایک مثل ہے کہ خدا اُن کی مدد کرتا ہے جو آپ اپنی مدد کرتے ہیں"۔ گورنمنٹ کی اعانت پر ہاتھ پاؤں توڑ بیٹھے رہنا گویا خود اپنے ہاتھوں تباہی کا سامان فراہم کرتا ہے۔ حق تعالیٰ قرآن شریف میں فرماتا ہے۔ "اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ" خدا تعالیٰ

کسی قوم کی حالت کو نہیں بدلتا جب تک کہ وہ اپنی حالت کو نہ بدلے۔ مجھے اس بات کا افسوس ہے کہ مسلمانوں نے کانفرنس کے گزشتہ جلسوں کی مفید اور قیمتی رزولیوشنوں کی تعمیل کی طرف چنداں توجہ نہیں کی اگر ان پر عمل کیا جاتا تو قوم کی حالت آج سے بالکل مختلف ہوتی۔ گزشتہ رزولیوشنوں میں سے صرف دو کی نسبت میں کچھ کہنا چاہتا ہوں ایک تو مسٹر بک پرنسپل علی گڑھ کالج کا وہ رزولیوشن ہے جو اجلاس معظم میں تعلیمی مردم شماری کی نسبت پاس ہوا تھا کہ یہ معلوم کیا جاوے کہ ہر ایک ضلع میں کس قدر قابل تعلیم مسلمان بچے انگریزی مدارس میں نہیں پڑھتے اور اس بے توجہی کی وجہ آیا ان کا مذہبی تعصب ہے یا افلاس تاکہ ان مشکلات کے دور کرنے کے وسائل بہم پہنچائے جائیں۔ اگر اس رزولیوشن کے مفہوم کے مطابق صحیح اور مفصل فہرستیں مرتب ہو جائیں اور عدم تعلیم کا باعث رفع کرنے کی کوشش کی جائے تو مسلمانوں کی کایا پلٹ جانے میں کچھ شک نہ تھا۔

صاحبان! غفلت کے سوا مسلمانوں کی تعلیمی پستی کی ایک بڑی وجہ ان کا افلاس بھی ہے۔ سال گزشتہ کی رپورٹ سررشتہ تعلیم پنجاب سے اس صوبہ کے مسلمانوں کا ایسا افسوسناک اور غیر متوقع تعلیمی تنزل ظاہر ہوتا ہے جس کے سننے سے ممکن نہیں کہ ہر ایک مسلمان کو بشرطیکہ اس کے دل سے قومی ہمدردی کا مادہ بالکل مفقود نہ ہو گیا ہو سخت صدمہ نہ پہنچے۔ اس رپورٹ پر ہز آنر لفٹننٹ گورنر پنجاب کا ریویو گورنمنٹ گزٹ پنجاب مطبوعہ یکم دسمبر ۱۸۹۸ء میں شایع ہوا ہے میں اس کا دوسرا پیرگراف اقتباس کرتا ہوں۔

"سال ۹۸-۱۸۹۷ء پر بلحاظ مذہب طلبا کے اعداد و شمار پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوؤں کی تعداد میں ۲۶۲۷ دیگر اقوام ۱۶۵ اور یورپین طلبا کی تعداد میں ۳۴ کی بیشی ہوئی لیکن مسلمان طلبا کی تعداد میں ۶۱۱۸ اور دیسی عیسائیوں کی تعداد میں ۸۸ کا تنزل ہوا۔ اہل ہنود کی نمایاں ترقی کے مقابلہ میں اہل اسلام کا تنزل نہایت قابل غور ہے۔ یہ کمی زیادہ تر پرائیویٹ مدارس و مکاتب میں واقع ہوئی ہے اس لئے گویہ چنداں وقیع نہ ہو لیکن سرکاری اسکولوں میں ۱۵۶۴ مسلمان طلبا کا گھٹ جانا جیسا کہ قایمقام ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم پنجاب ریمارک کرتے ہیں ایک نہایت اہم معاملہ ہے۔ بہرحال اس امر میں بہت کم شبہ کی گنجایش ہے کہ گزشتہ دو سالوں کے غیر معمولی حالات کا اثر کمیونٹی کے دیگر بڑے حصے کی نسبت غریب تر مسلمانوں پر نہایت مضر پڑا۔ موجودہ اعداد و شمار کی رو سے پبلک اور پرائیویٹ مدارس میں اسکول جانے کی عمر کے بچوں میں سے مسلمانوں میں ۱۲،۰۵ اور ہندوؤں میں ۱۶،۴۱ اور سکھوں میں ۲۰،۰۰ لڑکے تعلیم پاتے ہیں۔ لڑکیوں کے لحاظ سے اس کی فی صدی شرح علی الترتیب ۱،۱۴ - ۱،۲۶

اور ۳۹ ر ۲ سرکاری مدارس میں طلبار کی حاضری کو قابل معیار اعتبار ترقی تصور کرنے سے یہ نتیجہ نکلتا کہ مسلمانوں کے ۴ لڑکوں میں سے ایک لڑکا اور ۷ ر ۱۹ لڑکیوں میں ایک لڑکی - ہندوؤں نے ۷ لڑکوں میں ایک لڑکا اور ۷ ر ۸ لڑکیوں میں ایک لڑکی مدرسہ میں پڑھتی ہیں - سکھ لڑکوں کی تعداد ہندؤا سے بھی زیادہ ہے اور ان کی ۲۰ لڑکیوں میں سے ایک لڑکی مدرسہ جاتی ہے - سیکنڈری اسکولوں او انٹرنس کے مسلمان کامیاب طلبار میں کچھ اضافہ نظر آتا ہے - لیکن دیگر تمام صورتوں میں اس سال قوم نے ترقی معکوس کی ہے جس نے اس تنزل کی تعداد بڑھا دی ہے اور جس کا پورا کیا جا لازمی ہے -

پس یہ کس قدر چونکا دینے والا امر ہے کہ اور قومیں تو ہزاروں کی تعداد میں ترقی کر رہی ہیں مگر مسلمان جن کی آبادی بلحاظ مردم شماری پنجاب میں دیگر اقوام سے زیادہ ہے بجائے ترقی کے ایسا ہولناک تنزل حاصل کر رہے ہیں - ہم کو ہندو بھائیوں کی ترقی کا حسد نہیں مگر اپنی قوم کی بے علمی اور مفلسی پر افسوس ظاہر کرنے سے باز نہیں رہا جا سکتا -

ہز آنر لفٹنٹ گورنر پنجاب اس کمی کو نہایت اہم تصور فرماتے ہیں ڈاکٹر سررشتہ تعلیم سے متفق ہیں اور ان کی رائے میں گزشتہ دو سال کے قحط کا اثر غریب مسلمانوں کی تعلیم پر نہایت مضر ثابت ہوا حالاں کہ پنجاب میں خدا کے فضل سے قحط کا اثر اس سختی سے محسوس نہیں ہوا جس قدر کہ دوسرے صوبجات میں تاہم یہاں کے مسلمانوں کا افلاس مغربی تعلیم کے حاصل کرنے میں کسقدر مشکلات اور رکاوٹیں پیدا کر رہا ہے -

اس کا علاج صرف یہی ہے جو نواب محسن الملک بہادر نے تجویز کیا ہے کہ غریب مسلمان طلبہ کالج کے لئے کثرت سے وظائف قائم کئے جائیں اور ہر ضلع میں اس قسم کے قابل امداد طلبا کی اسکالرشپ سے اعانت کی جائے غرض کہ نواب صاحب کا رزولیوشن اس قدر ضروری، وسیع اور بدیہی ہے کہ مجھے اس پر کچھ زیادہ کہنے کی حاجت نہیں -

صاحبان ! جو قوم زمانہ کی ضرورتوں سے بے پروا رہ کر تہذیب و شائستگی اور تعلیم میں اپنے آپ کو دیگر ہمعصر اقوام کے ہم پلہ بنانے کی کوشش نہیں کرتی وہ گویا ایک ایسے قانون قدرت کے توڑنے کا ارتکاب کرتی ہے جس کا نتیجہ خود اس کے حق میں سم قاتل ثابت ہوتا ہے ایسی قوموں کو زمانہ رفتہ رفتہ ایک فضول چیز کی طرح معدوم کر دیتا ہے اور ان کا نام و نشان صفحۂ روزگار سے مٹ جاتا ہے ہندوستان کی قدیم جاہل اقوام بھیل اور گونڈ کے تنزل اور گمنامی کو ہمیں سرمایۂ عبرت بنانا چاہئے امریکہ

اور آسٹریا کے اصلی وحشی باشندے بھی تقریباً ناپید ہو چکے ہیں۔

یہ درست ہی کہ مسلمانوں کی قوم اپنی غفلت اور سہل انکاری کے باعث قعر مذلت میں گری ہوئی ہے اور اس نے ان بیش بہا مواقع ترقی سے فائدہ نہیں اٹھایا جو برٹش گورنمنٹ جیسی انصاف پسند آزاد اور روشن خیال حکومت نے اسے دیئے تھے۔ قوم کو ہدف مصائب دیکھ کر ذرا نہ پسیجنا اور اسے قسمت کے حوالہ کر دینا اعلیٰ درجہ کی بیدردی ہی۔ گویا ہم قوم کی تکالیف اور رنج کا احساس نہیں کرتے۔

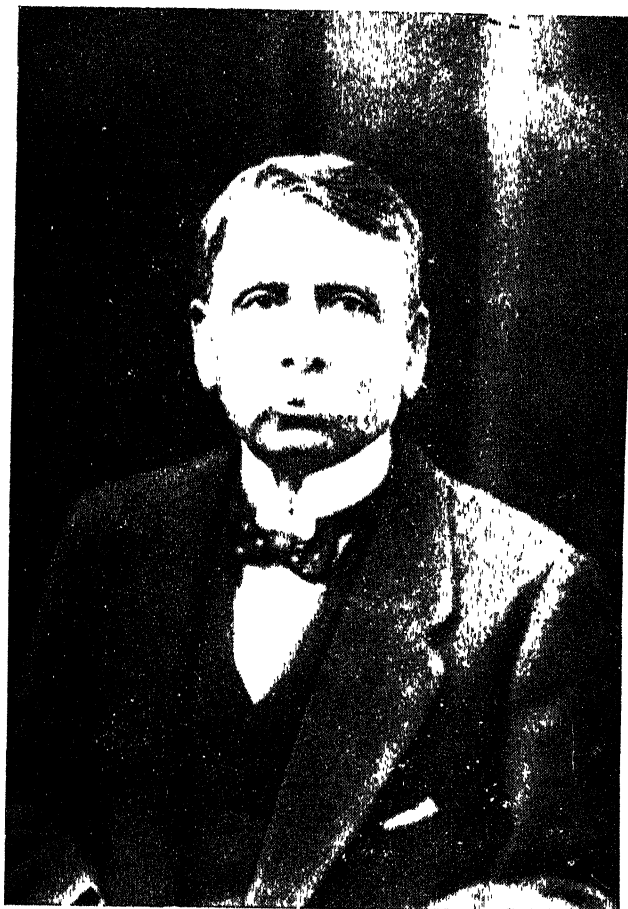
گردِ سر تو گشتن و مردن گناہِ من   دیدن ہلاک و رحم نہ کردن گناہ کیست

بعض انجمنوں نے ہدایات کانفرنس پر بہت کچھ عملدرآمد کیا ہی منجملہ ان کے ایک انجمن حمایت اسلام ہی جس میں ۸۲ اطلبا تعلیم پاتے ہیں ان میں سے ۱۱۱ طلبا کی فیس بالکل معاف ہی اور ۶۲ ایسے ہیں جن کی نصف فیس معاف ہی اور ۵۰ اطلبا کو سامان تعلیم انجمن سے دیا جاتا ہی۔ اغلباً اس انجمن کا اجلاس اخیر ہفتہ فروری ۱۸۹۹ء کو بمقام لاہور منعقد ہوگا۔ امید کی جاتی ہی کہ کل بہی خواہان و ہمدردان قوم شمولیت جلسہ سے دریغ نہ فرمائیں گے تاکہ کانفرنس کی ہدایات کی زیادہ عمدگی سے تعمیل ہو سکے۔

محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس اسی غرض سے قایم ہوئی ہی کہ مسلمانوں میں مغربی سائنس و علوم پھیلائے تاکہ مسلمان بھی ان قوموں کے دوش بدوش دیکھے جائیں جو میدان ترقی میں ان سے آگے نکل گئی ہیں۔ کانفرنس ایسی تدبیر و وسائل پر غور کرتی ہی جو قوم کی کشت امید کو سرسبز و شاداب کرنے میں ابر رحمت ثابت ہوں کانفرنس مسلمانوں کے کسی خاص طبقہ و فرقہ کی آرگن نہیں۔ بلکہ ہر ایک مسلمان خواہ وہ کسی عقیدہ و مذہب کا پابند ہو۔ اس میں شامل ہو سکتا ہی۔ اس کی تمام کارروائیوں پر آزادی سے بحث ہوتی ہی۔

پس مجھے امید ہی کہ جو رزولیوشن آپ کے سامنے پیش ہو کر آپ کے اتفاق یا کثرت رائے سے پاس ہوں گے ان کو ڈیڈ لٹر کی طرح کانفرنس کی رپورٹ ہی میں لکھا نہ رہنے دیا جائے گا۔ بلکہ ان پر اسی سرگرمی سے عمل بھی کرینگے جس گرمجوشی سے آپ ان کے مباحثہ میں حصہ لیں گے۔ کانفرنس اس وقت تک پوری کامیابی حاصل نہیں کر سکتی جب تک کہ قوم اس کے رزولیوشنوں کی تعمیل میں دل و جان سے سعی نہ کرے اگر مسلمانوں نے برٹش گورنمنٹ کے پر امن اور مبارک دور حکومت میں ترقی نہ کی تو معلوم نہیں پھر کب کریں گے۔

اس قدر سمع خراشی کی معافی مانگ کر میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس دوازدہم کے افتتاح کا اعلان کرتا ہوں۔ فقط



رائٹ آنریبل مسٹر جسٹس سید امیر علی

صدر اجلاس سیزدهم کانفرنس (کلکته سنه ۱۸۹۹ ع)

اجلاس سیزدہم

(منعقدہ کلکتہ ۱۸۹۹ء)

صدر رائٹ آنریبل جسٹس سید امیر علی ایم اے سی آئی ای،

حالات صدر

علما، علوم جدیدہ کی فہرست میں جسٹس سید امیر علی کا نام نامی نہایت ادب اور احترام کے ساتھ لیا جاتا ہے اور ہمیشہ لیا جائے گا جو ملک اور قوم میں نہ صرف ایک فاضل جج کی حیثیت سے مشہور ہیں بلکہ سلطنتِ برطانیہ میں اور تمام اسلامی دنیا میں مخصوص شخصیت رکھتے ہیں وہ ایسے نامور عالم اور زبردست مصنف ہیں جو اپنی وسیع قابلیت تبحرِ علمی اور زورِ قلم کے لحاظ سے زمانہ دراز تک گذشتہ صدی کے زندہ مصنفین کی صفِ اول میں شمار ہوں گے اسلامی تاریخ سے ان کی گہری واقفیت کا سکہ ہندوستان سے لیکر انگلستان تک جاری ہے ان کی زندگی کا نصب العین اتحاد بین المسلمین۔ ہے ہر مسلمان کے دل میں یہ خوش گوار جذبہ پیدا کرنے کے لئے اُنھوں نے انتہائی کوشش سے کام لیا۔

سید امیر علی کی تمام زندگی مسلمانوں میں ایک نئی شعاع امید پیدا کرنے میں بسر ہوئی۔

پچاس برس پہلے جب سر سید احمد خاں مرحوم نے مسلمانوں میں علوم جدیدہ کی ضرورت کا احساس پیدا کرنے کی کوشش کی تو سید امیر علی اُس وقت سے اُن کے ریفارم میں شریک رہ کر انڈین نیشنل کانگرس سے علٰحدہ رہے۔

سیدامیر علی ۶؍اپریل ۱۸۴۹ء میں مقام (چنسورہ) بنگال میں پیدا ہوئے ان کے باپ کا نام سید سعادت علی تھا جن کے اسلاف کا شاہانِ ایران کے دربار سے تعلق رہا تھا ان کے ایک بزرگ محمد صادق خان شاہ عباس ثانی کے زمانہ میں بڑے عہدہ دار تھے ان کی اولاد میں سے احمد فاضل سید امیر علی کے دادا ۱۷۳۹ء میں نادر شاہ کے ساتھ ہندوستان آئے اور نادر شاہ کی واپسی پر احمد فاضل نے مع اپنے دیگر ساتھیوں کے شاہ دہلی کی ملازمت حاصل کرکے دلّی کی سکونت اختیار کر لی۔ جب سلطنت مغلیہ پر زوال آیا اور مرہٹوں نے دلّی کو لوٹا تو احمد فاضل کے لڑکے بھاگ کر اودھ میں چلے آئے جن کو نواب وزیر اودھ کی طرف سے خدمات اور مناصب عطا ہوئے منجملہ اپنے دوسرے بھائیوں کے سید سعادت علی نے دہلی سے آکر موہان ضلع اُناؤ میں بود و باش اختیار کی جو اودھ کے الحاق سے کچھ عرصہ قبل بنگالہ کو چلے گئے جہاں سید امیر علی جیسے آفتاب علم کا طلوع ہوا جس نے مشرق سے نکل کر مغرب تک میں اپنی دماغی روشنی پہنچائی -

سید سعادت علی بڑے دور اندیش اور زمانہ شناس شخص تھے تقریباً اسّی نوّے برس قبل کے زمانہ میں مسلمان ہر مغربی چیز سے بالخصوص مغربی تعلیم سے تو قطعی طور پر متنفر تھے مگر ان کی یہ حیرت انگیز پیش بینی تھی جنھوں نے اپنی اولاد کو اُس زمانہ میں انگریزی تعلیم دینے کی کوشش کی سید امیر علی ابتدائی تعلیم کے بعد ہوگلی کالج میں داخل کئے گئے جہاں وہ آخر تک تعلیم پاتے رہے جو اپنی کلاسوں میں غیر معمولی طور پر ذہین اور تیز تھے وہ بہت جلد میٹرک پاس کرکے اور اول درجے کا اسکالرشپ حاصل کرکے ۱۸۶۷ء میں گریجویٹ ہوگئے اس کے ایک سال بعد تاریخ اور پولٹیکل اکانمی میں ایم اے کی ڈگری لی بعد ازاں اسی کالج میں قانون کی تعلیم شروع کردی اور بی ایل کا امتحان "آنرز" کے ساتھ پاس کیا۔

مسلمانانِ بنگال کی تعلیم کے لئے "محسن فنڈ" آبِ حیات کا کام دے رہا ہے جس نے قومی تعلیم میں بڑی مدد دی، سید امیر علی کی تمام تعلیم "محسن فنڈ" کی ہمیشہ رہینِ منت رہے گی ۱۸۶۹ء میں اُنھوں نے اسٹیٹ اسکالرشپ قانونی تعلیم کے لئے حاصل کیا اور بیرسٹری کی سند لینے کے لئے انگلستان روانہ ہوگئے ۱۸۷۳ء میں کامیاب ہو کر ہندوستان واپس آگئے، اور کلکتہ میں وکالت شروع کی ۱۸۷۴ء میں کلکتہ یونیورسٹی کے فیلو مقرر ہوئے ۱۸۷۵ء میں پریسیڈنسی کالج کلکتہ میں شرعِ محمدی کے لیکچرار مقرر ہوئے۔ اور ۱۸۷۶ء میں اُنھوں نے "سنٹرل نیشنل محمڈن

ماخوذ از نیشنلسٹ سیریز

ایسوسی ایشن" قائم کی اور اس کی سکریٹری شپ کی خدمات ایک تہائی صدی تک انجام د
اس مشہور انجمن اور بلند پایہ بانی کے اثر سے مسلمانان بنگال کو بہت سے تعلیمی اخلاقی معاشر
سیاسی فوائد حاصل ہوئے۔

اس کے علاوہ ۱۸۷۶ء سے ۱۹۰۴ء تک وہ ہگلی امام باڑہ کے صدر رہے۔

پانچ سال کی کامیاب وکالت کے بعد ۱۸۷۸ء میں پریسیڈنسی مجسٹریٹی پر ان کا تق
عمل میں آیا اس اہم ذمہ داری کی خدمت کو ایسے عمدہ طریقہ اور قابلیت کے ساتھ انھوں نے
انجام دیا کہ تھوڑے ہی عرصہ کے بعد وہ چیف پریسیڈنسی مجسٹریٹ کے عہدہ پر فائز کئے۔
خدمت مذکور کے سلسلہ میں پبلک اور گورنمنٹ دونوں کو ان پر بھروسہ اور اطمینان رہا۔
ان جیسی شخصیت کے لئے عرصہ تک گورنمنٹ سروس میں رہنا ناممکن تھا چیف پریسیڈنس
مجسٹریٹی پر استقلال کی خبریں گرم ہو رہی تھیں کہ انھوں نے سرکاری خدمت سے استعف
دے کر پھر پریکٹس شروع کر دی بعد ازاں بنگال لیجس لیٹو کونسل کے ممبر بنائے گئے اور ۱۸۸۳
تک کونسل میں انھوں نے نشست کی ۔ باب مسلم حقوق کی حفاظت کے لئے لارڈ رپن نے ا
تقرر امپیریل لیجس لیٹو کونسل کی ممبری پر کیا ۔ امپیریل کونسل کی خدمات کے اعتراف میں
لارڈ رپن نے اپنی تقریروں میں اُن کی لیاقت کی تعریف کی البرٹ بل کے پرزور اور پرشور ز
میں اُن کے اخلاق کی مضبوطی اور اخلاص کا اثر اُن لوگوں نے بھی قبول کیا جو اُن کے خیالا
سے متفق نہ تھے ۱۸۸۴ء میں ٹیگور لا پروفیسر مقرر ہوئے ۱۸۸۷ء میں لارڈ ڈفرن وائسرائے ہن
کی گورنمنٹ نے ان کے جوہر ذاتی اور خدمات سرکاری کے اعتراف میں سی آئی ای
خطاب دیا ۔ ۱۸۹۰ء میں وہ ہز مجسٹی کی گورنمنٹ کے حکم سے ہائی کورٹ کلکتہ کے جج مقر
ہوئے سید محمود کے بعد یہ دوسرے مسلمان تھے جن کو یہ منصب اور یہ عزت دی گئی تھی

ان کی قانون دانی اور شرع محمدی پر عبور کی کیفیت اس ایک واقعہ سے خیال میں
آسکتی ہے ۔

ایک قابل لحاظ مقدمہ کے دوران میں جبکہ ایک وقف کا سوال پوری بینچ کے سامنے
پیش ہوا تو جسٹس امیر علی کا فیصلہ دوسرے ججوں سے بالکل مختلف تھا یہ مقدمہ جب پریوی کونسل
میں پہنچا تو برخلاف دوسرے ججوں کے متفقہ فیصلہ کے کونسل مذکور نے سید امیر علی کے
فیصلہ اور رائے کو مان کر مقدمہ کی کارروائی آخری طور پر ختم کر دی۔

وقف علی الاولاد کا بل جس کو آنریبل مسٹر جناح نے ۱۹۱۱ء میں امپیریل لیجسلیٹو کونسل میں پیش کیا اور جس نے ۱۹۱۳ء میں قانون کی صورت اختیار کرلی اس کا آغاز جسٹس امیر علی ہی کا مرہون منت ہے۔

چودہ برس تک کلکتہ ہائی کورٹ کی اہم خدمات کو انجام دینے کے بعد ۱۹۰۴ء میں انھوں نے سبکدوشی حاصل کی ان کے بعد اکثر مسلمان جج ہوئے اور ہوں گے لیکن جس شان نیک نامی اور عالمانہ وقار کے ساتھ انھوں نے ہائی کورٹ کی کرسی پر نشست فرمائی یہ لازوال شہرت ان کے نام کے ساتھ باقی رہے گی عہدہ مذکور سے سبک دوش ہونے کے بعد انھوں نے بجائے ہندوستان کے انگلستان کی سکونت کو پسند کیا اور لندن کے ایک غیر آباد حصہ برک شائر میں لارڈ آفنٹن کے تاریخی مکان لیٹمرن کو حاصل کرکے وہاں بود و باش اختیار کرلی جو اپنے جائے وقوع کے لحاظ سے خوش منظر مقام ہے جب سے لندن میں انھوں نے سکونت اختیار کی اُن کی سب سے زیادہ توجہ مسلم لیگ پر مبذول رہی آل انڈیا مسلم لیگ کی شاخ لندن مسلم لیگ انھیں کی توجہ سے عالم وجود میں آئی جب سے یہ لیگ قائم ہوئی وہی اس کے صدر بھی ہیں ۲۳ نومبر ۱۹۰۹ء میں ان کے پریوی کونسل میں جانے کا اعلان ہوا سید امیر علی پہلے ہندوستانی ہیں جو شاہنشاہی کونسل میں داخل ہوئے یہ تقرر قومی عزت کا ایک بلند نشان سمجھا گیا۔

جب جولائی ۱۹۱۸ء میں مانٹیگو چیمس فورڈ اسکیم شائع ہوئی تو انھوں نے سیکرٹری آف اسٹیٹ اور وائسرائے ہند کی ہمت اور سیاست دانی کی تعریف کرکے اپنے برادران ملک سے نئی ریفارم کو کامیاب کرنے کی درخواست کی مسلم حقوق کی جداگانہ نیابت کے لئے انھوں نے خاص طور پر کوشش کی اور ہمیشہ اپنی پر زور تحریروں اور تقریروں سے مسلم خیالات کی ترجمانی کرکے گورنمنٹ اور ملک کی خدمت میں نمایاں طور پر حصہ لینے میں اور ضرورت قومی کا کافی طور پر احساس رکھنے میں کوتاہی نہیں کی۔

جسٹس امیر علی کے حالاتِ زندگی ناتمام رہ جائیں گے اگر ان کی قابل قدر تصانیف کا تذکرہ کیا جائے گا جو کل کی کل انگریزی زبان میں ہیں جن کی تصانیف کا سلسلہ مولوی سیّد کرامت علی متولی ہگلی محسن فنڈ کے ایک اُردو رسالہ کے انگریزی ترجمہ سے شروع ہوتا ہے جو اُن کے کالج چھوڑنے سے پہلے کیا گیا تھا یہ ان کے زمانۂ طالب علمی کا پہلا کام تھا ان کی اس وقت کی زبردست انگریزی اور انشا پردازی ان کے آئندہ بلند پایہ مصنف بننے کا بزبانِ حال اعلان کررہی تھی " سائے کنگوسٹ

از بہارش پیدا است" انھوں نے لندن ہی کے دوران قیام میں ایک دوسری کتاب (اے کریٹیکل ایگزامینیشن آف دی لائف اینڈ ٹیچنگس آف محمدؐ) سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی مبارک اور حضور کی تعلیم پر تنقیدی تحقیق کے ساتھ لکھ کر پیش کی جو لندن کے ادبی حلقوں میں ہاتھوں ہاتھ لی گئی ان کی سب سے زیادہ مشہور تصنیف (اسپرٹ آف اسلام) ہے اس کتاب نے سید امیر علی کو بہ حیثیت ایک زبردست مصنف کے دنیا سے روشناس کیا اسی سلسلہ میں چوتھی کتاب "اسلام" نامی انھوں نے لکھی اس کے بعد اسلام کی شیفتگی نے ان کو عربوں کی مختصر تاریخ (اے شارٹ ہسٹری آف دی سارا سنس) لکھنے پر متوجہ کیا اسلامی تاریخوں کے متعلق عام طور پر یوروپین مصنفوں نے نہایت بخل اور تعصب سے کام لیا ہے مسلمانوں کے اور اسلام کے خلاف ایک خاص پروپگنڈا عرصہ سے جاری ہے اس معرکۃ الآرا کتاب میں جسٹس امیر علی نے مسلمانوں کی حقیقی اور اصلی تصویر پیش کی ہے اور ہر واقعہ کو محققانہ طور پر درج کر کے یوروپین مصنفین کی یاوہ گوئی اور خلاف بیانی کی مدلل طور پر تردید کی ہے۔ فن تاریخ میں اس کتاب کا نہایت بلند پایہ مانا جاتا ہے۔

فاضل مصنف نے عربوں کی اندرونی زندگی، اقتصادی سوشیل اور دماغی ترقیات پر روشنی ڈالنے میں کافی غور اور تحقیق کر کے بتایا ہے کہ موجودہ یوروپ ان کی تہذیب اور شائستگی کا کس وجہ مرہون منت ہے انھوں نے ثابت کیا ہے کہ عربوں کے انتظامات ملکی کا انگریزوں کی حکومت ہند سے مقابلہ شہنشاہیت پسند لوگوں کے لئے بہت کچھ سبق آموز ہے۔

ان کی تصنیفات کا پایہ نہ صرف ایک زبردست مؤرخ اسلام کے لحاظ سے بہت بلند نظر آتا ہے بلکہ وہ قانون اصول قانون اور مخصوص شرع محمدی کے بھی متبحر عالم ہیں جن کی قانونی تصانیف اسٹوڈنٹس ہینڈ بک آف محمدن لا" "دی پرسنل لا آف محمدنس" وغیرہ قانونی حلقوں میں بہت زیادہ اہمیت رکھتی ہیں۔

مستقل سلسلہ تصنیف و تالیف کے علاوہ قومی اور ملکی حقوق کے اہم مسائل پر انھوں نے انگریزی اخبارات و رسائل میں ایسے پرزور مضامین وقت اور موقع کے لحاظ سے تحریر کئے ہیں جو بہت توجہ کے ساتھ نہ صرف ہندوستان میں بلکہ انگلستان میں پڑھے گئے ہیں ان کی تحریر ہندوستانیوں اور انگریزوں دونوں کے خیالات پر زبردست اثر رکھتی ہے۔

سید امیر علی کی خدمات اسلامی ہندوستان ہی تک محدود نہیں ہیں بلکہ ان کا دائرہ تمام ممالک اسلامیہ پر حاوی ہے ۱۹۱۲ء میں انقلاب ٹرکی کے دوران میں انھوں نے قابل قدر

خدمات انجام دیں ٹرکی و اٹلی اور ٹرکی و بلقان کی جنگ کے دوران میں اُنھوں نے انجمن ہلال احمر کی بنیاد ڈالی اور فوجی شفاخانے بیماروں اور زخمیوں کے لئے بھیجے۔ نخاجوں غریبوں کی امداد کے لئے برطانیہ عظمیٰ، ہندوستان، انگریزی نوآبادیوں سے فنڈ کے لئے اپیل کی اور تمام دنیا کے مسلمانوں سے درخواست کی کہ وہ انجمن ہلال احمر کی شاخیں قائم کرکے ٹرکی آبادی کی مصیبتوں میں ان کے معین و مددگار بنیں۔ جب ایم سنیہ وناف وزیر خارجہ روس لندن میں آئے اور تقسیم ایران کے مشورے ہوئے اُس وقت بھی سید امیر علی آگے بڑھے اور لندن ٹائمز کے ذریعہ سے اُنھوں نے صدائے احتجاج بلند کی دوران جنگ عظیم میں جن دردمند لوگوں نے ٹرکی اور دنیائے اسلام کی خدمات انجام دینے میں کوشش اور ہمت کی ہے ان میں سید امیر علی کسی سے کم نہیں ہیں۔

جنگ عظیم کی صلح کے بعد جب مسٹر لائڈ جارج وزیر اعظم برطانیہ ٹرکی کے حصے بخرے کرنے کی فکر میں تھے اس پرآشوب زمانہ میں ہندوستان سے لے کر تمام دنیائے اسلام میں یورپ کی حکمت عملی کا تہلکہ مچا ہوا تھا۔

لندن کے مسلمانوں نے سید امیر علی، ہز ہائینس آغا خاں اور سر عباس علی بیگ کی سرگروہی میں ۱۴ جون ۱۹۱۹ء کو ایک عرضداشت پیش کی اور اسلامی ممالک کی حفاظت اور بحالی کے اُن وعدوں کو یاد دلایا جو جنگ عظیم کے وقوع کے وقت دنیائے اسلام سے کئے گئے تھے اور ٹرکی کے متعلق جو تقسیم درپیش تھی وہ اُن مواعید کے بالکل خلاف ثابت کی اور گورنمنٹ کی اس غلطی کو نہایت واضح اور مدلل طریق سے ثابت کیا، یہ سچ ہے کہ نتیجہ میں ترکوں کی دانشمندی شجاعت اور مصطفےٰ کمال کی تلوار نے سلطنت ٹرکی کی عزت کو تھام لیا مگر اس میں بھی شک نہیں کہ انگلستان کی رائے عامّہ کو ٹرکی وعاوی کی قبولیت کے لئے انگلستان اور ہندوستان کے پروپیگنڈے سے بہت کچھ مدد ملی، جس کو ایک طرف تو سید امیر علی انگلستان میں اور دوسری طرف مسلمان ہندوستان میں انجام دے رہے تھے۔

مسلمانان ہندوستان اس فخر کے بجا طور پر مستحق ہیں کہ ان کی قوم میں سید امیر علی جیسی شخصیت کی ہستی موجود ہے اور جو ان کے مصیبت کے وقت میں آڑے آنے کے لئے اس پیرانہ سالی میں ہر وقت کمربستہ رہتی ہے۔

مسلمان طلبہ مقیم لندن کی مختلف نوعیتوں سے آپ نے حوصلہ افزائی کرکے اُن کو دنیائے عمل

کے لئے مفید مشورے دئے۔ برٹش گورنمنٹ نے ان کے درجے اور منصب کے لحاظ سے انگلستان میں بھی ان کی کافی عزت کی اور ان کو نائٹ کے خطاب سے مخاطب کیا۔

۱۸۹۹ء میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس کو انھی نے کلکتہ میں مدعو کیا۔ اس اجلاس کی بڑی کامیابی یہ تھی کہ خود ان جیسے عالم اس کے صدر بھی تھے اجلاس مذکور اپنی عمدہ تجاویز، فراہمی سرمایہ تعلیمی اور قابل اصحاب کی شرکت کے لحاظ سے کانفرنس کے ان مشہور اور کامیاب اجلاسوں میں سے ایک تھا جس کے حالات تعلیم کے دور تبلیغ کا شاندار کارنامہ بن کر زیب تاریخ کانفرنس ہیں۔

۱۹۲۵ء میں ان کی اعلیٰ ادبی خدمات کے اعتراف میں مسلم یونیورسٹی علیگڈھ نے ان کو ڈاکٹر آف لٹریچر کی ڈگری دی۔

رائٹ آنریبل سید امیر علی اب اپنی مایۂ ناز زندگی کی اٹھترویں منزل میں ہیں انگلستان میں اُن کا وجود قومی سہارے اور عزت کا سبب ہے ہماری دعا ہے کہ وہ ابھی عرصہ دراز تک پورے سکون اور راحت کی زندگی بسر کریں۔

خطبۂ صدارت

میں اس امر کو اپنے لئے باعث عزت خیال کرتا ہوں کہ مجھے محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا صدر انجمن بننے کے لئے مدعو کیا گیا ہے۔ میں امید کرتا ہوں کہ پریسیڈنٹ ہونے کی حیثیت سے میری کم لیاقتی کو اغماض کی نظر سے دیکھا جاوے گا اور میرے فرائض منصبی کا گزشتہ اجلاسوں کے معیار سے اندازہ نہ کیا جاوے گا۔ کانفرنس کے اجلاس مختلف مقامات پر ہوتے ہیں اور تمام بزرگان قوم جو مسلمانوں کی تعلیمی ترقی سے دلچسپی رکھتے ہیں، اُس کے مقاصد سے بخوبی آگاہ ہیں۔ میں تمام مسلمانوں کو عموماً اور اسٹینڈنگ کمیٹی کانفرنس کو خصوصاً مبارکباد دیتا ہوں کہ اُنھوں نے امسال کانفرنس کے اجلاس کے لئے شہر کلکتہ منتخب کیا ہے۔ کیونکہ میرے خیال میں یہی خاص وجوہات ہیں کہ کیوں وہ عالی حوصلہ بزرگ جو مسلمانوں کے تعلیمی معاملات میں ساعی ہیں اپنی کوششوں کو کسی خاص صوبہ میں محدود نہیں رکھتے اور بنگال جس میں بہار اور اڑیسہ کو شامل کرتا ہوں جو اس وقت

خاص توجہ کا محتاج ہے اُس مشہور اور نامور شخص کی اَن تھک کوششوں نے جو آج ہم میں موجود نہیں ہے ممالک مغربی و شمالی میں ایک ایسا تعلیمی درس گاہ بنا دیا ہے۔ جو میرے نزدیک اس بات کا مستحق ہے کہ تمام ہندوستان کو اُس کی تقلید کرنا لازم ہے کراچی میں بھی ایک کالج ہے جو انھیں اُصولوں پر قائم ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ کالج اب بھی اپنے مقاصد کو پہلے سی عمدگی سے انجام دیتا ہے یا نہیں۔ حال میں مسلمانوں نے لاہور میں ایک کالج قائم کیا ہے لیکن مسلمانانِ بنگال ایسے خوش نصیب نہیں ہیں کہ اُن کا کوئی کالج ہو۔ جو ہمدردی کہ ہندوستان کے اول گورنر جنرل کو مسلمانوں کی ترقی تعلیم سے تھی اُس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کلکتہ مدرسہ قائم کیا گیا۔ جو اوصاف کہ اُس مدرسہ میں نہ صرف بنگالہ کے مسلمانوں کو بلکہ میں کہہ سکتا ہوں کہ کل ہندوستان کے مسلمانوں کو فائدہ پہنچانے کے موجود ہیں اُن کا ٹھیک اندازہ اُس صورت میں ہو سکتا ہے اگر ہم اُن مقاصد پر نظر ڈالیں جو کہ وارن ہیسٹنگز کو اس کالج کی بنیاد ڈالتے وقت مدنظر تھے۔ لیکن اس میں شبہ نہیں کہ اس کا دستور العمل وہ نہیں رہا جس سے اُس کے بانی کا مقصد خاطر خواہ حاصل ہوتا۔ میں یقین کرتا ہوں کہ اس بات کے ظاہر کرنے میں میں عہد شکنی اور راز افشانی کا مرتکب نہ ہوں گا کہ چند سال کا عرصہ ہوا کہ مجھ سے خاص طور پر دریافت کیا گیا کہ اس مدرسہ کی عنانِ اہتمام سربرآوردہ مسلمانوں کی ایک کمیٹی کے ہاتھ میں دیدی جاوے تو اس کی اصلاح ممکن ہے یا نہیں۔ چونکہ اُس وقت کلکتہ کے مسلمانوں میں نفاق کی آگ شعلہ زن تھی میں نے اپنا فرض سمجھا کہ اس سوال کا جواب نہایت شد و مد کے ساتھ نفی میں دوں۔ میں اپنے اثناء اڈریس میں پھر اس مضمون کی طرف رجوع کروں گا اِس وقت میں نے اس لئے اس کا اشارہ کیا ہے کہ بزرگانِ قوم کی توجہ اس امر کی طرف خاص طور پر مبذول کروں کہ مسلمانانِ بنگال و بہار کی تعلیمی ضروریات بھی اُن کی توجہ کی محتاج ہیں۔ بارہا ظاہر کیا گیا ہے کہ مروجہ انتظام تعلیم ملکہ معظمہ قیصرِ ہند کی رعایا کے اُس حصّہ کی ضرورتوں کو پورا کرنے میں قاصر ہے جو دینِ اسلام کے معتقد ہیں۔ اس بات کا فیصلہ کرنا میرا کام نہیں ہے کہ موجودہ طریقۂ تعلیم دیگر اقوام کی ضرورتوں کو کہاں تک پورا کرتا ہے۔ میرے نزدیک کوئی تعلیم مکمل یا جامع نہیں کہلائی جا سکتی جس کا مقصد کریکٹر کی اصلاح و درستی نہ ہو۔ لیکن کوئی شخص اس بات کا دعویٰ نہیں کر سکتا کہ اُس سلسلۂ تعلیم میں جو اس ملک میں مروّج ہے کیرکٹر کی اصلاح، اخلاقی قوتوں کی تربیت اور نفس کی تہذیب ملحوظ رکھی جاتی ہے، ماسوا چند ایسی درس گاہوں کے جو کسی خاص قوم نے اپنی ضرورتوں کو مدنظر رکھ کر قائم کئے ہوں اور اس وجہ سے میری ہمیشہ سے یہ رائے رہی ہے کہ تعلیم کو خصوصاً ابتدائی

مدارج میں ہر قوم کی خاص ضرورتوں اور اخلاقی حاجتوں کے موافق کرنا چاہیئے ہندوستان کے مسلما
مختلف نسلوں کی اولاد ہیں جو مختلف ممالک سے ہندوستان میں آکر بسی ہیں۔ اکثر حالتوں میں
اُن کی زبانوں میں ایسا ہی فرق ہے جیسا کہ اُن کی وضع اور ظاہری خال و خط میں۔ مگر با ایں ہمہ
وہ مذہب کے تعلق کی وجہہ سے ایک ہی قوم کے رکن ہیں۔ قدرتی طور پر عام مسلمان مذہبی
تعلیم پر زیادہ زور دیتے ہیں اور اگرچہ میرے خیال میں اس جوش کی بے اعتدالی بعض حالت
میں قومی مضرت کا باعث ہوتی ہے۔ لیکن میری ذاتی رائے یہ ہے کہ اگر آپ اپنے نوجوانوں کو
مفید لائق اور کارکن بنانا چاہتے ہیں تو سب سے زیادہ اُن کے اخلاقی تعلیم پر زور دینا چاہئے
آپ کسی بچے سے ہرگز توقع نہیں کر سکتے کہ وہ نیک اور جاں نثار رعایا اور سوسائٹی کا مفید
اور کارکن ممبر بنے گا جب تک کہ اُس کو راست خیالی کے فرض کو نہ سکھاؤ جو عمدہ اور نیک زندگی
کی شرط مانقدم ہے۔ اگر میرا یہ خیال صحیح ہے تو اس میں کوئی کلام نہیں کہ ہندوستان کے مسلمانوں
کو حتی الامکان کوشش کرنی چاہیئے کہ اپنے نوجوانوں کے لئے اپنی درسگاہوں کی بنیاد ڈالیں
جہاں اُن کے لڑکے مغربی علوم و فنون اور تہذیب و سیاست سے مستفید ہو سکیں اور ساتھ
ہی اُس کے اخلاقی تربیت کو حاصل کریں جس کا ہونا میرے نزدیک ہر فرد بشر کے کیریکٹر کی اصلاح
کے واسطے لابد ہے کئی صدیاں گذر چکیں کہ تربیت اور سیاست کی برکتوں اور تہذیب کے
فضائل سے فیضیاب ہونے کی غرض سے اہل مغرب عرب کے قدموں پر گرے تھے مگر آج وہی سبق مشرقی
دنیا کو مغرب سے سیکھنے پڑے۔ دس صدیاں گذر گئیں کہ اسپین کے شایستہ عیسائی سراسر اسلامی
تہذیب کی روشنی پر مفتوں ہو کر اپنی فاتح قوم کی زبان لکھتے اور بولتے تھے اور اُن کے عادات اور
خصائل کو اختیار کر لیا تھا آج وہی اثر ہمارے قوی القلب لوگوں کو یوروپین تعلیم و تربیت کی طرف
کھینچ رہا ہے اور اُن کو اپنا شیدا بنا رکھا ہے۔ اس بات پر ناراض یا رنجیدہ ہونے سے کوئی
فائدہ نہیں ہے۔ اور نہ یہ کہنے سے کچھ حاصل ہے کہ مغربی خیالات کے بیش بہا خزانوں کا حاصل
کرنا ذلت کی دلیل ہے اور قوم کو کسر شان اور بے وقری کی طرف مائل کرتا ہے لیکن یاد رکھنا
چاہیئے کہ کاہل اور سرگرم اور لکیر کے فقیر اور روز افزوں ترقی کرنے والی قوم کے باہمی میل
جول کا ناگزیر نتیجہ یہی ہے۔ پس اس حالت میں جو قوم زندہ اور ترقی پذیر قوم کے قدم بقدم
چلنا چاہے اُس کا پہلا فرض یہ ہے کہ پرانے رواج کے بوسیدہ نقاب کو خیرباد کہے اور مغربی
تعلیم و تہذیب کو اپنی ضروریات کے مطابق اور منطبق کرے۔ تاکہ یہ ثابت ہو جاوے کہ وہ

زمانہ کی ضروریات کو بخوبی سمجھتی ہے۔ جس زمانے میں اُن بزرگ عربوں نے یورپ والوں کو تعلیم دی تھی اُس وقت سے اب تک بے شمار انقلاب ظہور میں آئے ہیں۔ علم قوت ہے اس لیئے علم کے ساتھ قوت بھی مشرق سے مغرب کو سدھاری۔ علم ایک دولت ہے۔ اس لیئے علم کے ساتھ دولت و ثروت بھی اُسی سمت کو پرواز کر گئی۔ جو قوم اپنا اقبال کھو بیٹھتی ہے علم حاصل کرنے سے ایک حد تک اُس کی تلافی کر سکتی ہے۔ آج ہم ایک نئی صدی کے آستانے پر کھڑے ہیں اور آیندہ صدی کے عرصے میں جو ترقی کی اُمیدیں ہو سکتی ہیں اُن کو سوچ کر خوش ہوتے ہیں۔ خصوصاً ہم میں سے جو لوگ نوجوان ہیں اُن کو اُمید رکھنی چاہیئے کہ جس صدی کے آغاز میں وہ کوششیں کر رہے ہیں وہ اُن کی قوم کی علمی ترقی اور بہبودی کا ایک دور ہوگا اور یہ بھی بھروسہ رکھنا چاہیئے کہ ہر فرد بشر کی مساعی پر اُس کی قوم کی ترقی منحصر ہے۔

آپ لوگوں کی قسمت ایک عظیم الشان اور مہذب گورنمنٹ کے دستِ قدرت میں ہے۔ آپ میری بات کو باور کیجئے کہ کوئی دوسری گورنمنٹ ایسی نہیں ہے جو اپنی رعایا کی بہبودی اور فلاح کو اس دلسوزی سے مدنظر رکھتی ہو اور جو قومیں اُس کے زیر حمایت ہوں اُن کو ترقی و نشو و نما کے لئے ایسے موقعے حاصل ہوں جیسے کہ سلطنتِ برطانیہ کے زیر سایہ حاصل ہیں۔ غلطی کا واقع ہونا ہر حالت میں ممکن ہے اور خطا سے معرا اور کامل صرف سلطنتِ ایزدی ہی ہو سکتی ہے۔ لیکن دنیا میں کوئی گورنمنٹ ایسی نہیں ہے جس کو بلا لحاظ قومی و مذہبی اختلافات کے اپنی رعایا کے ہر گروہ کی ترقی کا یکساں خیال ہو جس قدر ہماری گورنمنٹ کو ہے جس کے زیر سایہ ہم زندگی بسر کرتے ہیں۔ جو افسر اعلیٰ سے ادنیٰ تک اس ملک میں آتے ہیں اُن سب کی تمنا صرف یہ ہوتی ہے کہ حتی الامکان اپنی لیاقت اور اپنے اختیارات کے ذریعے سے ہندوستان کی رعایا کو فائدہ پہنچائیں۔ میں اپنی یہ رائے ظاہر کرنے کے لئے اس واسطے مجبور ہوں کہ جو کچھ آیندہ بیان کروں اُس کے واسطے راستہ صاف ہو جائے۔ آپ لوگ بخوبی واقف ہیں کہ سرزمین ہندوستان میں مختلف اقوام اور مختلف مذاہب کے لوگ آباد ہیں۔ اُن میں یکجہتی اور قومیت نام کو نہیں ہر قوم کے جدا جدا فریق ہیں۔ ہر فریق کا مذہب مختلف اور طبیعتوں کا رجحان جداگانہ ہے۔ ان وجوہات سے اس ملک پر حکمرانی کرنے میں خاص مشکلات اور گورنمنٹ کے ہر ایک انتظام میں لاینحل دقتیں پیش

آتی ہیں اُس کا فرض ہے کہ ہر فرقے اور ہر قوم کی ضروریات کا لحاظ رکھے اور کسی ایک کی طر
یا اُس کے ساتھ متعصبانہ برتاؤ نہ ہونے پائے۔ ہماری گورنمنٹ کی یہی عام پالیسی ہے اور
منصف آدمی اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ یہ پالیسی عین دانشمندی، آزادی اور نیک
پر مبنی ہے۔ اور اگرچہ گورنمنٹ ایک خاص قوم کی ترقی کو توجہ اور ہمدردی کی نظر سے دیکھ
مگر یہ ہرگز اُمید نہیں کی جا سکتی کہ دیدہ و دانستہ ایک قوم کے حرج اور مضرت کو گوارا
کرکے دوسری قوم کو فائدہ پہنچائے۔ میں نے لفظ "دیدہ و دانستہ" اس واسطے کہا کہ
اوقات کوئی فعل نہایت نیک ارادے سے کیا جاتا ہے اور اُس کا اثر ایک نہ ایک فرو
کے لئے نقصان دہ ہوتا ہے۔ مگر جہاں تک کوئی انتظام کسی خاص گروہ کے لئے حق تلف
اور ناانصافی کا باعث نہ ہو ہماری گورنمنٹ دل و جان سے ہر فرقے اور ہر جماعت کی
غائت درجہ کرنے کو مستعد ہے پس اس صورت میں موجودہ انتظام تعلیم ہماری ضرورت
کے لئے کیسا ہی ناکافی کیوں نہ ہو ہمکو ہرگز توقع نہیں کرنی چاہئے کہ گورنمنٹ ہمارے ذاتی فائدہ
کے لئے خاص طور پر انتظام کرے گی۔ میں ابھی بیان کر چکا ہوں کہ یہ ثابت کرنا کہ موجودہ
تعلیم دوسری اقوام کے لئے کہاں تک موزون حال ہے میرا کام نہیں ہے۔ یہ طریقہ
برسوں سے رائج ہے لہذا اگر اس کو منسوخ کرنا اور پلٹنا بھی ہو تو سخت مشکل ہے۔ لیکن
چونکہ یہ امر مسلّم ہے اور اس سے کوئی شخص انکار نہیں کرتا کہ یہ طریق ہندوستان کے
مسلمانوں کی تمام ضروریات کو پورا نہیں کرتا۔ اور کیا یہ غیر ممکن ہے کہ گورنمنٹ اسکولوں
امدادی درس گاہوں میں ایسی تبدیلیاں پیش کی جاویں جن سے ہماری ضروریات پوری
ہو سکیں۔ میرے خیال میں یہ امر ناممکن نہیں ہے۔ جو امور جزوی اور متعلق بہ تفصیل ہیں اُن
ہر گروہ اپنی ضرورتوں کے لحاظ سے غور کرتا ہے۔ میں اُمید کرتا ہوں کہ بنگال میں اد
تعلیم کا مسئلہ بھی اس بحث سے خارج نہ رہے گا۔ اور آپ اس پر غور کریں گے کہ موجو
طریقہ تعلیم کو تہ و بالا کئے بغیر کیا کیا مفید تبدیلیاں ہو سکتی ہیں جن سے گورنمنٹ کا مدعا بھی پو
ہوا ور آپ کی کوششیں بھی بار آور ہوں ایجوکیشن کمیشن کی رائے موجود ہے۔ اور آپ کی تجا
کے لئے ایک مفید بنیاد کا کام دے سکتی ہے لیکن ایک امر جس کو میں ضروری سمجھتا ہوں
یہ ہے کہ اُردو زبان بنگال اور بمبئی کے اسکولوں میں بطور اختیاری زبان کے رہنی چاہئے
مگر یہ معاملہ زیادہ تر مسلمانوں کے ہاتھ میں ہے۔

مجھے یقین ہے کہ کوئی مسلمان جو ایسی زندگی بسر کرتا ہو جہاں تعلیم کی ضرورت ہو ایسا نہ ہوگا جو انگریزی تعلیم کی قدر نہ کرتا ہو۔ مجھے یقین ہے کہ یہاں بہت سے اصحاب ایسے موجود ہیں جو یہ خیال کرتے ہیں کہ تحصیل علم خواہ وہ کسی زبان کے ذریعہ سے ہو ہر فرد و بشر کی اخلاقی ترقی کا باعث ہوتی ہے۔ عام لوگ اس کو تسلیم کرنے لگے ہیں کہ جہل خرابیوں کی جڑ ہے اس مسئلے کو ثابت کرنے اور قوم کو خواب غفلت سے بیدار کرنے میں کئی سال خرچ ہوئے۔ اسی عرصہ میں ہمارے ہموطنوں کا بہت بڑا گروہ ہم سے اور آگے نکل گیا اے کاش کہ یہی زمانہ انگریزی تعلیم میں خرچ کیا جاتا تو کس قدر مفید ہوتا۔ میں اس موقع پر اُن خارجی اسباب پر بحث نہیں کروں گا جو ہماری غفلت کا باعث ہوئے ہیں موجودہ حالت میں میرا یقین ہے کہ مسلمانوں کی فلاح اور بہبودی خود مسلمانوں کے ہاتھ میں ہے۔

آپ سب صاحبوں کو وہ الفاظ یاد ہوں گے جو تیرہ سو برس پہلے کہے گئے تھے کہ خدا بندوں کی حالت تبدیل نہیں کرتا جب تک وہ خود اپنی حالت کو تبدیل نہ کریں۔ مدد اور ترقی خدا کی طرف سے آتی ہے مگر کوشش اور اُس کا خیال ہمارے دلوں سے آنا لازمی ہے۔ غالباً میری اس گفتگو کا یہ جواب دیا جاوے گا۔ کہ "ہماری خواہش تو ترقی کرنے کی ہے مگر ہم کو وہ وسائل بتائے جن سے ہماری تمنا پوری ہو" جو رائے میں نے اس اہم مسئلے کے دونوں پہلوؤں پر سالہا سال کے غور کے بعد قائم کی ہے وہ مختصراً عرض کرتا ہوں۔ فی زمانہ دو کالج جو آپ کے موجود ہیں ایک تو اُس بزرگ شخص کی کوشش کا نتیجہ ہے جس کی یاد آپ کے دلوں میں ابھی تازہ ہے۔ دوسرا اُس شخص نے قائم کیا ہے جس کا نام شائد اُس کے صوبے کے باہر یا تو معلوم ہی نہیں ہے اور اگر معلوم ہے تو لوگ اُسے بھول گئے ہیں ان دونوں درس گاہوں میں سے ایک کی حالت تو اچھی سننے میں آئی ہے دوسرے کی نسبت تھوڑے دنوں سے کوئی خبر معلوم نہیں ہوئی لیکن میں یقین نہیں تو اُمید تو ضرور کرتا ہوں کہ وہ بھی اچھی حالت میں چل رہا ہے۔ جو کام مسٹر حسن علی نے سندھ جیسے صوبہ کے لئے دو یا تین سال کے عرصے میں کر دکھایا ہے وہ ہم سب کی رہنمائی کے لئے ایک مثال ہونی چاہئے میں اُس اہم کام کا ذکر نہیں کرنا چاہتا جو سر سید احمد مرحوم نے کیا ہے کیونکہ وہ ایسی کامیابی ہے جو بہت کم کسی کو نصیب ہو سکتی ہے لیکن جو کام میرے دوست اخوند حسن علی نے مسلمانوں کی تعلیم کے لئے کیا ہے وہ بہت سے لوگوں کے حیطۂ قدرت میں ہے۔ جب میں ۱۸۸۴ء میں کراچی گیا تو ایک دوست کی خواہش سے میں نے

وہاں مسلمانانِ ہند کی خراب حالتِ تعلیم پر ایک لکچر دیا تھا اُسی وقت فوراً ایک کمیٹی قائم ہو گئی اور بہت کچھ روپیہ اس غرض سے جمع ہو گیا کہ ایک اسکول ایسے ڈھنگ پر کھولا جائے جیسا کہ علی گڑھ کالج ہے۔ امیر خیرپور نے ایک رقم کثیر دے کر اس فنڈ کی امداد کی۔ اور اس کمیٹی کے ممبر مالی اور اخلاقی مدد حاصل کرنے کے لئے تمام ہندوستان میں پھرے اور عرصہ ایک سال یا اٹھارہ مہینے میں حسن علی اور اُن کے ہمراہی ایک کالج قائم کرنے میں کامیاب ہوئے جس کے نصاب تعلیم میں علاوہ معمولی تعلیمی کورس کے ایک صیغہ صنعت و دستکاری کے لئے مخصوص کیا گیا۔ ایسے ہی تعلیم گاہ کے لئے میں آپ لوگوں کو ترغیب دیتا ہوں جو لوگ میرے ہم مذہب بھائیوں میں سے روشن ضمیر اور سرگروہ ہیں میں نہایت زور سے اُن کی توجہ اس امر کی طرف دلاؤں گا کہ جہاں کہیں کافی وسائل مہیا ہوں اور ضروری امداد پہونچ سکتی ہو تو ضرور ایسے اسکول قائم کئے جاویں جن میں اسی ڈھنگ پر تعلیم دی جائے۔ فی الحال آپ کے پاس ایک بڑا اور میں یقین کرتا ہوں کہ ترقی پذیر کالج علیگڈھ میں ہے۔ دو اور کالج کراچی اور لاہور میں موجود ہیں۔ میں دیدۂ و دانستہ اس وقت کلکتہ کے مدرسہ کالج کا ذکر کرنا نہیں چاہتا۔ لیکن دو یا تین کالج سات کروڑ باشندوں کی بڑی جماعت کی تعلیمی ضروریات مشکل سے پورا کر سکتے ہیں۔ میری رائے میں ضرورت اس امر کی ہے کہ ہر ضلع یا چند اضلاع کے واسطے علی گڑھ کالج کے نام پر اینگلو ورنیٹل محمدن اسکول کھولے جائیں جو ممالک مغربی و شمالی کے سنٹرل کالج کے واسطے معاون کا کام دیں (احاطۂ بمبئی کے لئے غالباً کراچی نزدیک ہو گا) جو کام میں تجویز کرتا ہوں وہ دیکھنے میں بڑا معلوم ہو گا۔ کیونکہ صرف یہی نہ ہو گا کہ سنٹرل کالج اعلیٰ درجہ کی حالت میں قائم رکھا جائے اور وقتاً فوقتاً اُس کی کارروائیوں میں ترقی دی جاوے بلکہ ہم کو ایک بڑی تعداد ویسی ہی تمہیدی اسکولوں کے قائم رکھنے کی کوشش کرنی پڑے گی جو سنٹرل انسٹیٹیوشن کی شاخیں ہوں گے لیکن اگر آپ صدق دل اور جوش کے ساتھ اس گاڑی کے پہیہ کو ڈھکیلنے میں زور کریں گے تو میرے خیال میں یہ کام ایسا مشکل اور وقت طلب نہ ہو گا جیسا کہ بظاہر معلوم ہوتا ہے احاطۂ بنگال میں اسوقت بہت سی تعلیم گاہیں موجود ہیں جو محض ابتدائی حالت میں ہیں اور جو نہایت آسانی سے عمدہ تعلیم دینے کے لایق ہو سکتی ہیں اور سنٹرل کالج کے لئے معاون کا کام انجام دے سکتی ہیں۔ میں ان تعلیم گاہوں سے وہ مدرسے مراد لیتا ہوں جو محسن فنڈ سے چلائے جاتے ہیں۔ میں خوف کرتا ہوں کہ فی الحال اِن تعلیم گاہوں کی روش جیسی چاہیئے

ویسی قابل اطمینان نہیں اِن کی بابت میں کچھ اور زیادہ کہنا نہیں چاہتا لیکن ہاں اتنا ضرور کہوں گا کہ میں اُن قواعد و اُصول کو جن پر وہ مدارس چلتے ہیں پسند نہیں کرتا۔ اگر گورنمنٹ کو یقین ہو جاوے کہ سربرآوردہ مسلمان نیک نیتی اور سچے دل سے اپنی قوم کی تعلیمی اصلاح کے درپے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ اِن مدرسوں کا اہتمام مسلمانوں ہی کے سپرد نہ کر دے۔ میں اِن مدرسوں کا ذکر اس لئے کرتا ہوں کہ وہ آپ کی توجہ کے سخت محتاج ہیں اور ایسا نہ ہو کہ آپ اُن کی حالت پر غور نہ کریں اسی سلسلہ میں میرے خیال میں آپ اپنی توجہ بنگال کے مکاتب میں مسلمانوں کی ابتدائی تعلیم کی طرف بھی کر سکتے ہیں۔ اگر یہ مکتب وہ کام نہیں دے سکتے جو مدرسوں سے نکلتا ہے اور نہ وہ عملی طور پر اس قدر کارآمد ہیں مگر میری رائے میں اُن کے موجودہ انتظام میں تھوڑے تغیر و تبدل کرنے سے وہ بہت کچھ مفید ہو سکتے ہیں۔

سنٹرل کالج کی نسبت مجھے بڑی امید ہے کہ شہزادگان ہندوستان خصوصاً ہز ہائینس نظام حیدرآباد کی دریادلی و فیاضی سے جنہوں نے اُس کے قیام میں اسقدر امداد فرمائی ہے اُس کی ترقی اور اُس کے نفع رسانی کے دائرے کو زیادہ وسیع کرنے میں بھی اعانت فرمائیں گے یورپ کی سب سے بڑی یونیورسٹیوں کی یہ عظمت و شان نہ ہوتی اگر گزشتہ سلاطین و والیانِ ملک اپنی دریادلی اور خداترسی سے اُن کے قیام اور دوام کے لئے بیش بہا وقف نہ چھوڑ جاتے عربوں کے زمانہ میں ازہریہ۔ مقتدریہ۔ مستنصریہ۔ ناصریہ اور نوریہ تمام مدارس کی بنیادیں خلفائے عظام اور سلاطین کی فیاضی اور علمی شوق سے پڑیں۔ دارالعلوم نظامیہ جس کی شہرت کی یاد علماء کے دلوں میں اب تک تازہ ہے خواجہ حسن نظام الملک بیدار مغز شہنشاہ کے روشن ضمیر وزیر کا قایم کیا ہوا تھا۔ ہم کو اُمید ہے کہ کوئی دن ایسا آوے گا جب ہم اپنے سنٹرل کالج علی گڑھ کو ہندوستان کا نظامیہ کالج کہہ سکیں گے جو نظامیہ کالج کے بانی سے زیادہ جلیل القدر نظام الملک کی فیاضی اور اعانت سے متفرق امدادوں سے مستغنی اور مسلمانانِ ہند کا مرکزی دارالعلوم ہو جاوے گا۔

چھوٹے چھوٹے مدارس کے قیام اور اخراجات کے لئے علاوہ اُس امداد کے جس کا میں نے ابھی اشارہ کیا ہے ہم اپنی قوم کے ذی استطاعت اور متمول بزرگوں کی فیاضی پر اطمینان کے ساتھ بھروسہ کر سکتے ہیں۔ میں یہ خیال کرنے کی جرارت کر سکتا ہوں کہ اگر ہم اس کام کو بے غرضی سے رفاہ عام کی نیت سے شروع کریں گے تو دوسری اقوام کے دولتمند لوگ اس اہم کام میں

ہماری امداد کرنے میں دریغ نہ کریں گے۔ مگر امداد کی درخواست صرف امرا اور دولتمندوں ہی تک محدود نہیں رہنی چاہئے۔ ہر متوسط درجہ کے آسودہ حال مسلمان سے استدعا کی جاوے کہ اپنا چندہ خواہ قلیل ہی کیوں نہ ہو ان اسکولوں کی امداد کے لئے دے۔ اس مقصد کو پورا کرنے کے لئے ایک اسٹینڈنگ کمیٹی نہایت مفید ہوگی جو وقتاً فوقتاً مختلف ضلعوں اور شہروں میں سرمایہ جمع کرنے کے لئے جائے۔ پرانی انجمنیں جو اب مردہ ہوگئی ہیں دوبارہ زندہ کی جائیں تاکہ وہ اپنے خاص مقامات میں مسلمانوں کی ترقی تعلیم کی نگرانی کریں۔ اُن کو مسلمانوں کی تعلیمی اور تمدنی مقاصد پورا کرنے کے لئے ہمیشہ بیدار کرتے رہنا چاہئے۔ بہت سے لوگوں کا خاصہ ہے کہ اگر اُن کو متواتر جوش نہ دلاتے رہیں تو وہ خواب غفلت میں پڑ جاتے ہیں اور ایسے سُست اور نکمے ہوجاتے ہیں کہ کوئی ہمدردی کا کام نہیں کرتے۔ ایسے لوگوں کو ہمیشہ مستعد رکھنا چاہئے۔ اون سے اوقاتِ معینہ پر اپنے اپنے ضلعوں کے مسلمانوں کی تعلیمی اخلاقی و تمدنی حالات پر رپورٹ طلب کرنی چاہئے۔ اور اُن کو ذمہ دار بنانا چاہئے کہ اپنے اپنے شہروں میں ضلع اسکول کے اخراجات کے لئے سرمایہ جمع کرنے کا انتظام کریں ممکن ہے کہ ہم کو گورنمنٹ اور ڈسٹرکٹ بورڈوں سے مدد ملے مگر اس کام کے لئے کوشش کرنے میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھنا چاہئے۔ پیشتر اس کے کہ میں ایک دوسرے تعلیمی مسئلہ کی نسبت کچھ کہوں جس پر کانفرنس کی خاص توجہ درکار ہے میں کلکتہ مدرسہ کی نسبت اپنے خیالات ظاہر کرتا ہوں جس کا میں نے آپ صاحبوں سے وعدہ کیا تھا۔ جیسا کہ میں پہلے بیان کرچکا ہوں اس تعلیم گاہ سے آیندہ بہت سی اُمیدیں وابستہ ہیں۔ لیکن میری رائے میں اُس کے اصلی اغراض پورے نہیں ہوسکتے جب تک اُس کی بنیاد نئے طریقہ پر نہ ڈالی جائے اور اُسے موجودہ زمانے کے اخلاقی و دنیاوی ضروریات کے مطابق نہ کیا جاوے میری ذاتی رائے میں کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ کیوں اُسے علی گڑھ کالج کی وضع پر نہ بدل دیا جاوے اور کیوں وہاں ایسی تعلیم نہ دی جائے جس سے ہمارے نوجوان ترقی پذیر سوسائٹی کے کارآمد اور معزز ممبر بنیں۔ میں آپ لوگوں کے دلوں پر جہاں تک مجھ سے ممکن ہے نقش کرنا چاہتا ہوں کہ اس زندگی کی کشمکش میں جس میں آپ مصروف ہیں اگر آپ جدید طرز تعلیم کو پرانی تعلیم کے ماتحت رکھیں گے تو گویا آپ اپنے پیروں پر کلہاڑی ماریں گے۔ غالباً کلکتہ مدرسہ کا اثر مسلمانان بنگال پر بہت زیادہ ہو جاوے گا۔ اگر ایک عالم جو عربی و فارسی میں ماہر ہو اُس کا افسر رہے۔ چونکہ میری غرض صرف یہ ہے کہ جن اُمور پر کانفرنس میں بحث کرنا مفید ہوگا اُن کا ایک عام خاکہ

کھینچ دوں اس لیئے میں تفصیلی اُمور کا ذکر نہیں کرتا۔ لیکن کلکتہ مدرسہ کی نسبت دو باتیں ہیں جن کو میں چھوڑنا نہیں چاہتا۔ اول یہ کہ جب سے مدرسہ کی ایف اے کی جماعتیں پریسیڈنسی کالج سے ملحق کر دی گئی ہیں اُس کے امتحانات یونیورسٹی کے نتائج قابل اطمینان نہیں ہیں دوسرے یہ کہ جو مسلمان طالب علم ایلیٹ ہوسٹل میں رہتے ہیں اُن کو پریسیڈنسی کالج میں لکچر سننے میں دقت اور تکلیف ہوتی ہے۔ لیکن یہ کہا جاتا ہے کہ ہندوستان کے بہت سے حصوں اور خصوصًا بنگال کے مسلمانوں کی عام حالتِ غریبی اُن کو موجودہ انسٹیٹیوشن سے مستفیض ہونے نہیں دیتی۔ بدقسمتی سے یہ بالکل صحیح ہے۔ جیسا کہ میں بیان کر چکا ہوں خارجی اسباب سے جو ہمارے اختیار سے باہر تھے یہ نتائج ظہور میں آئے ہیں۔ لیکن اب یہ تسلیم کر لیا گیا ہے کہ اس میں زیادہ تر قصور ہمارا ہی تھا۔ اس واقعہ کو دیر کے بعد تسلیم کر لینا میری رائے میں ایک امید دلانے والا شگون ہے کیونکہ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ علت و معلول کے سمجھنے کی وہ طاقت جو مدت سے سو رہی تھی اب بیدار ہوئی ہے اور اُس کی یہ خواہش ہے کہ مصیبت کا مقابلہ کرے۔ یہ تو اب ناممکن ہے کہ جو خاندان سالہا سال کے عرصے میں تباہ ہوئے ہیں اُن کو از سر نو زندہ کیا جائے۔ لیکن یہ ناممکن نہیں کہ اُن کے آیندہ زوال اور افلاس کے اسباب کو روکا جائے۔ عرب کے جلیل القدر مقنن نے جو عقلمندانہ اور رحیمانہ قوانین ہمارے واسطے چھوڑے ہیں اُن میں سے کوئی قانون ایسا ضروری نہیں ہے جیسا کہ ورثا میں تقسیم جائداد کا۔ لیکن چونکہ یہ تقسیم ضرور جائداد کے منتشر ہونے کا باعث اور خاندانوں کے افلاس کا سبب ہوتی لہذا ایک تعجب انگیز دور اندیشی سے جس کو کہ حقیقت میں الہامی کہنا مناسب ہے اُس نے یہ شرط لگا دی کہ جائداد منقولہ و غیر منقولہ دونوں وقف کی جا سکتی ہیں۔ ایک بیش بہا کتب خانہ جو کہ ایک شخص کی محنت شاقہ سے تیار ہوا ہے اگر اُس کا قیمتی خزانہ ورثا کی ایک تعداد میں منقسم کر دیا جاوے تو ایک قوم کے واسطے وہ بالکل جاتا رہے گا۔ ایک بڑی ریاست جو کہ ایک دوسرے شخص کی کوششوں سے قائم ہوئی ہے اور جس سے ہزارہا انسانوں کو بے انتہا فائدہ پہونچتا ہے اگر وارثوں میں اُس کا ایک ایک جزو تقسیم کر دیا جاوے تو تھوڑے زمانہ میں وہ بالکل نیست و نابود ہو جاوے گی۔ مذہب اسلام میں خاندان اور اولاد کے بسر اوقات کے اسباب مہیا کر دینا ثواب کا کام اور مذہبی فرض ہے۔ بموجب اس کے عربی پیغمبر نے یہ شرط کر دی کہ جائداد خاندان کی پرورش

کے واسطے اُس مدت تک غیر منقولہ اور ناقابل میراث رہے گی جب تک وہ خاندان باقی رہے۔ لیکن جب اُس خاندان میں کوئی نہ رہے تو اُس کا فائدہ غریبوں کے کام میں لایا جائے۔ یہی قانون وقف ہے جو گزشتہ تیرہ صدیوں تک ہر ایک مسلمانی سلطنت میں رائج رہا ہے اور جو ابھی تک ہندوستان میں رائج تھا اور لوگ اُس کو مانتے تھے۔ اِسی آئین پر مسلمانوں کی سرسبزی منحصر تھی یہی قانون خوش حال فرقوں کو افلاس سے بچاتا تھا اور علم کے پھیلانے میں فی الحقیقت بہت مدد دیتا تھا۔ بدقسمتی سے یہ آئین گزشتہ چند سال کے عرصہ میں ہندوستان سے اُڑا دیا گیا۔ اور اُس کا نتیجہ آپ ہر طرف دیکھتے ہیں۔ بہت سی بڑی بڑی مسلمانی ریاستیں دوسرے لوگوں کے قبضہ میں چلی گئی ہیں جو گورنمنٹ کے واسطے اعلیٰ خدمات بجا لاتی ہیں۔

مستحکم جائداد رکھنے والے فرقے کا موجود ہونا نہ صرف عوام الناس کے واسطے بلکہ اسٹیٹ کے واسطے ایک ضروری بات ہے۔ اُس سریع الزوال مجمع سے جو گروہوں کی بے وقوفیوں اور عذر کاریوں سے فلاح حاصل کرتا ہے مشکل سے امید ہو سکتی ہے کہ وہ مجمع وہ کام کرے گا جن کی ایک اعلیٰ اسٹیٹ اپنے مالدار باشندوں سے اُمید رکھتی ہے۔ انھیں وجوہات سے وہ مدبر جن کے ہاتھ میں ہندوستان کی عنانِ حکومت ہے ایسی عملی طریقہ کی ایجاد کی فکر میں ہیں جس سے کہ صاحب جائداد فرقوں میں زندگی اور موت کا متواتر چکر رُک جاوے۔ اسی وجہ سے میں مسلمانانِ ہند کو مجبور کرتا ہوں کہ وہ گورنمنٹ سے اس بات کی درخواست کریں کہ وہ آئین جس کے بغیر وہ اس تاگزیر افلاس سے محفوظ نہیں رہ سکتے جائز رکھا جاوے۔ مسلمان لوگ اگرچہ اُن عطیات جاگیروں اور وقفوں کو جو نیست ہو گئے ہیں پھر نہیں زندہ کر سکتے ہیں لیکن چند جو باقی ہیں اُن کو وہ بہ حفاظت تمام قائم رکھ سکتے ہیں۔ اب میں مسلمانوں کی اُس سنٹرل تعلیم گاہ کا ذکر کروں گا جو کہ چھوٹے چھوٹے مدارس کے واسطے نمونہ کا کام دے۔ اگر وہ اسکیم جن کا میں نے ان مختصر الفاظ میں خاکہ کھینچا ہے آپ صاحبوں کے پسند خاطر ہو تو اُس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ کسی نہ کسی وقت سنٹرل کالج اپنے اغراض ہستی کے پورا کرنے کے واسطے یونیورسٹی کے درجے پر پہنچایا جاوے جہاں پر کہ مغربی سائنس اور لٹریچر کے ساتھ مسلمانی تہذیب کی (جو کہ گزشتہ زمانے میں بہت مفید ثابت ہو چکی ہے) بھی تعلیم ہو۔ جہاں پر کہ طلباء کو زندگی کے تمام فرائض ادا کرنے کی تربیت دی جائے۔ اور جہاں کہ تھوڑا سا علم اخلاق بھی سکھایا جاوے جو کہ لوگوں کے اخلاقی نشو ونما میں مددگار ہو۔ جبکہ ملک کے مختلف حصوں

میں اسکول موجود ہوں تو کالج کو ایسی عمدہ حالت میں رکھنا ضروری ہے جس سے آپ کی قوم کے ہونہار نوجوان صرف اسی کالج کے لیکچر کے کمروں کی طرف رخ کریں۔ لیکن اس درجے تک پہنچنے کے واسطے یہ بھی ضروری ہے کہ گورنمنٹ اُس کے عطا کئے ہوئے اسناد اور ڈپلوموں کو دفاتر میں جگہ دینے کے واسطے ایسا مستند سمجھے جیسا کہ وہ دوسری یونیورسٹیوں کے دیے ہوئے اسناد کو سمجھتی ہے۔ جب آپ کو اُس درجے تک پہنچنے کا یقین ہو جاوے تو آپ گورنمنٹ سے اس امر کی استدعا کیجئے۔ اگر آپ اپنے مقصد میں کامیاب ہوں گے تو آپ لوگ نہ صرف تعلیم دینے والے بلکہ ممتحن بھی ہوں گے۔ اس طرح پر آپ اپنے طالب علموں کے دلوں پر لیاقت کی ضرورت کو نقش کر سکیں گے جس کے بغیر کم از کم ہندوستان کے کسی دفتر یا محکمہ میں داخل ہونے کا راستہ ملنا مشکل ہے۔ گذشتہ سال میں نے بموجب درخواست اپنے دوست نواب محسن الملک کے جن کی سرگرمی اور جوش کی وجہ سے سرسید احمد کے کارہائے عظیم کا قیام اب تک ہم دیکھتے ہیں میں نے ایجوکیشنل کانفرنس کے روبرو اُس نصاب تعلیم کا جو میری رائے میں کالجوں اور مدرسوں میں جاری ہونا چاہئے ایک مسودہ پیش کیا تھا۔ اور اُس وقت میں نے یہ بھی ظاہر کر دیا تھا کہ تعلیم کی کوئی مقررہ اسکیم بنانے کی کوشش کرنا گویا ناکامیابی کو بلانا ہے جب اسکیم تیار کرنے کا وقت آئے تو ایک کمیٹی تجربہ کار یورپین اور مسلمان اُستادوں کی قائم کر کے نصاب تعلیم کو طے کرنا چاہئے۔ بہمہ وجوہ میری خاص تجویز جیسا کہ آپ کو یاد ہو گا یہ تھی کہ تعلیمی کورس کے دو مختلف پہلو ہونا چاہئیں ایک پُرانی تعلیم اور دوسری زمانہ موجودہ کی تعلیم اور اُسی پر یہ قائم ہوں۔

آپ لوگ غالباً اُمید رکھتے ہوں کہ میں مذہبی تعلیم کا بھی کچھ ذکر کروں۔ بذات خود میں تو جوانوں کے لئے مذہبی تعلیم کو بہت ضروری سمجھتا ہوں لیکن مذہبی تعلیم سے میرا وہ مطلب نہیں ہے جیسا کہ عام طور پر اُس کا مطلب لیا جاتا ہے۔ مذہب کی میرے نزدیک دو قسمیں ہو سکتی ہیں۔ ایک لائق مجتہدین کی (جو کہ ولی کہے جا سکتے ہیں) عقائد اور اُصول اور دوسرا علم اخلاق جو مذہبی اخلاق کا عملی پہلو ہے۔ میرے نزدیک ایک دین کا پیرو ہونا اُس کے عقائد کو سیکھنا یا اُس کے ولیوں کے بیانات کو سُننا بالکل بیکار ہے جب تک اُس کے ساتھ ہی اُس کے اخلاقی سبقوں کی پوری پوری قدر نہ کی جاوے۔ میرے خیال میں بحد ضروری ہے کہ بجائے عقائد اور مذہبی رسوم سکھانے کے ہمارے نوجوانوں کو پختہ اخلاقی تعلیم دی جاوے میری رائے میں مسلمان کے واسطے

فقہ کی قسم کی کوئی چیز نہیں ہے اور اُس کو اُن مشکل عقائد سے کچھ تعلق نہ رکھنا چاہئے اگر وہ چاہتا ہے کہ مجتہدین کے اقوال وغیرہ سے کماحقہ آگاہی حاصل کرے تو اُس کو علم قانون اور روایتوں کے مطالعہ کی طرف توجہ کرنا چاہئے اور یہی مسلمانوں کا علم فقہ ہے جو خود سائینس کا ایک وسیع میدان ہے جس میں برسوں کی محنت اور تعلیم کی ضرورت ہے لیکن یہ اُمید کرنا کہ جو نوجوان فی زمانہ دنیا میں بسر کرنا چاہتا ہے اور جس کے چاروں طرف نئی نئی باتیں پھیلی ہوئی ہیں اور جو کہ نئی ضروریات سے گھرا ہوا ہے اُس کو اپنے مغربی اور مشرقی لٹریچر اور مغربی سائینز کی تعلیم کے ساتھ علم قانون و حدیث بھی شامل کرنا چاہیئے یہ ایک ناممکن بات ہے میری رائے میں مسلمانوں کی ابتر حالت جو تمام عالم میں ہو رہی ہے اُس کی خاص وجہ یہی ہے کہ ہر جگہ بہ نسبت عمل کے عقائد پر اور بہ نسبت اخلاق کے اصولوں پر اور بہ نسبت نیک اور سچے خیالات کے ظاہری مطابقت پر زیادہ زور دیا جاتا ہے معمولی مسلمان نوجوان کے واسطے اعتقاد سورۂ اخلاص اور اعتراف مذہب مسلمانی فقہ کا لُب لُباب ہیں۔ افعال انسانی کی جواب دہی اور پاکی اور پارسائی سے زندگی بسر کرنے کے فرائض اُس کے دل پر اوائل عمر میں منقش کر دینا چاہیئے۔

طالب علموں کو نماز سکھانے کے وقت ہم کو اُس طریقہ سے زیادہ سکھانا چاہیئے ہم کو اُنھیں نماز کے معنی سکھانے چاہئیں کہ یہ الفاظ ہیں جو انسان کے دل سے اُس سرچشمۂ نیکی کے سامنے نکل رہے ہیں اور اُس محسن ابدی کا شکریہ بجا لانے کے واسطے وہ الفاظ نکل رہے ہیں ہمارے ایک شاعر نے کہا ہے کہ قرآن وہ بڑا ورثہ ہے جو پیغمبر صاحب اپنے پیرؤوں کے واسطے چھوڑ گئے ہیں ؎

جز کتاب اللہ و عطرت ز احمد مرسل نماند ۔۔۔ یادگارے کو توان تا روز محشر داشتن

اس لئے میں اپنے نوجوانوں کو یہ کتاب پڑھانا چاہتا ہوں ہم کو یہ نہ بھولنا چاہیئے کہ علاوہ اُس عالمگیر علم اخلاق کے قواعد کے اس میں امور خانگی کے ایسے قواعد اور طریقے درج ہیں جن سے کہ اوائل عمر میں نوجوانوں کو ماہر کرنا عقلمندی نہ ہوگی۔ لہذا اُن کے ہاتھ میں میں صرف پہلا حصہ دوں گا۔

مجھے اس مسئلہ کا بہت بڑا خیال ہے۔ اور اسی وجہ سے مجھکو یہ جرأت ہوتی ہے کہ میں نے اپنے خیالات کا اظہار آپ کے سامنے کیا ہے گو کہ اُن کی بابت یہ سمجھا جاوے کہ وہ بہت دور کے

خیالات ہیں۔ اگر آپ کو مجھ سے اختلاف ہو تو کم از کم اتنا تو آپ اعتبار کریں گے کہ یہ خیالات سالہا سال کی کتب بینی اور غور و فکر کا نتیجہ ہیں اور آپ کی خاطر میں یہاں اُن کو بیان کر رہا ہوں کہ ممکن ہے کہ وہ آپ کے کارآمد ثابت ہوں جن سے آپ ایک عملی تجویز ایسی پختہ تعلیم کی تیار کر سکیں جو اعلیٰ انگریزی طریقوں کو اصلی اسلامی تربیت سے جکڑ دے۔ چاہے جو اسکیم بنائی جاوے اور جو طریقہ اختیار کیا جاوے اگر کامیابی مدنظر ہے تو صدق دل سے کام لینا چاہیئے۔ اگر ہم اپنے ذاتی اختلاف اور نیز ذاتی خواہشوں کو ترک نہ کریں گے تو ہم اپنے آپ کو نکتہ چین دنیا کے سامنے قابل مضحکہ بنائیں گے نفسانیت مسلمانوں کی تباہی کا باعث ہوئی ہے اور ہندوستان کے قومی فوائد کے واسطے بہت مضر ثابت ہوئی ہے یہ حد درجہ کی خودغرضی کا خیال جو آئندہ زندگی میں ایک خصلت ہو جاتی ہے اور جو نسلاً بعد نسل چلا جاتا ہے ابتدائی تعلیم سے درست ہو سکتا ہے۔ ہم اپنے بچوں کو صرف جاں نثاری نفس کشی اور ضبط کی تعلیم دیکر اس خیالِ فاسد کو جڑ سے اُکھاڑ سکتے ہیں۔ تاکہ یہ سبق عمدہ ثمر دے اُن کی تعلیم آغوشِ مادر میں ہونی چاہیئے اب یہ سوال ہوتا ہے کیا ہماری مستورات اس قابل ہیں کہ اپنے بچوں کو وہ تعلیم دے سکیں جو ہم اُن کو دینا چاہتے ہیں۔ ایک زمانہ تھا کہ ہمارے مذہب کی عورتیں امت الرجال کہلاتی تھیں کیا ہم اُن کو اب بھی وہی نام دے سکتے ہیں۔ عورتیں ہمیشہ ویسی رہی ہیں اور رہیں گی جیسا مرد اُن کو بناتے ہیں اب اس بات کا مجھے پورا یقین ہے کہ ہم اگر تہذیب میں ترقی کرنا اور مہذب دنیا کی نگاہ میں وقعت حاصل کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں اپنی عورتوں کو اُسی درجے پر پہنچا دینا چاہیئے جو پہلے اُن کو حاصل تھا۔ روم اور مصر میں بڑے بڑے اور ترقی پذیر مدارس لڑکیوں کی تعلیم کے واسطے ہیں اور مسلمان عورتوں کو سوسائٹی میں پھر وہی درجہ حاصل ہوتا جاتا ہے جو اسلام کے عروج کے زمانہ میں تھا۔ میری رائے میں لڑکیوں کی تعلیم لڑکوں کی تعلیم کے متوازی چلنا چاہیئے تاکہ سوسائٹی کی ترقی پر اُس کا سودمند اثر پڑے۔ جب تک ترقی کے دونوں جزو برابر تناسب سے نہ ہوں گے کوئی عمدہ نتیجہ نہیں ہو سکتا۔ ایک کو تعلیم دینا اور دوسرے کو جاہل رکھنا ضرررساں نتائج پیدا کرے گا۔ اگر سوسائٹی کا ایک حصّہ تعلیم یافتہ ہوگا اور دوسرا جہالت میں غرق ہوگا تو اُس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ یا تو تعلیم یافتہ حصّہ اپنی دلچسپی کے لئے بداخلاق صحبتیں ڈھونڈے گا یا اپنی حالت کو نہایت نیچے درجہ پر رکھے گا۔ اتھینس کی حالت اور اسلام کے قبل مکہ کی کیفیت میری دلیل کا ثبوت ہیں۔ اتھینس کے قدیم باشندے اپنے نوجوانوں کو تعلیم

دیتے تھے۔ مگر عورتوں کو بالکل جاہل رکھتے تھے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تعلیم یافتہ نوجوان اسپیسیس کے
دوست بن گئے میں سمجھتا ہوں کہ اسلامی سوسائٹی کی ترقی مغربی علوم کے حصول کے مطابق
ہونا ایک انصاف پسند گورنمنٹ میں جہاں آزاد خیالوں کو سوسائیٹی یا ذات سے خارج کردئیے جانیکا
خوف نہیں ہے بہت آسان ہے۔ اسی وجہ سے میں ہندوستان کے نوجوان مسلمانوں سے
ترقی اور اصلاح کے کام کی امید رکھتا ہوں۔ لفظ اصلاح شاید اُن لوگوں کو جو پُرانے
خیالات کے عادی ہیں ناگوار معلوم ہوگا۔ اس لئے میں اس بات کو ظاہر کئے دیتا ہوں کہ
اصلاح سے میرا مطلب مذہبی اصلاح نہیں ہے بلکہ یہ مطلب ہے کہ تعلیم کے طریقوں میں
اصلاح کی جاوے۔ سوشیل اور اخلاقی خیالات میں اصلاح کی جاوے پُرانے خیالات
اور تعصبات موجودہ ضرورتوں کے ماتحت کرئے جاویں۔ اِن اصلاحوں کے لئے میں قوم
کے اُن نوجوانوں پر بھروسہ کرتا ہوں جو کہ دنیاوی معاملات میں پڑنے کو ہیں۔ ہم لوگ
اُن کے واسطے پہلا زینہ بنا سکتے ہیں اور بڑھنا اُن کا کام رہے گا آپ لوگوں کے ذریعہ سے
اُن کے واسطے میں چند الفاظ بطور نصیحت اور تنبیہ کے کہوں گا جو لوگ کہ یہاں موجود نہیں
ہیں اُن کو اُن سے جو یہاں ہیں آگاہی ہو جاوے گی۔ اپنی دماغی اور اخلاقی ترقی کے لئے
ضروری ہے کہ ہم چند اعلیٰ نمونے اپنے سامنے رکھیں اور انھیں پر انسان کی ہستی
اور قوموں کی ترقی کا مدار ہے۔ اعلیٰ مثالوں کا نہ رکھنا گویا تاریکی میں زندگی کا بسر کرنا ہے۔
اُن کو ہاتھ سے کھو دینا ندامت اور بدبختی کی نشانی ہے۔ ہم کو لازم ہے کہ اُن مثالوں کو شباب
و رجولیت میں ہر وقت تازہ رکھیں تاکہ وہ ہم کو شرافت سے بسر اوقات کرنے۔ خوش اسلو
اتفاق سے زندگی بسر کرنے اور آخر میں خدا کو یاد رکھنے میں مدد دیں۔

پہلا اعلیٰ خیال فرض اور راستبازی کا ہونا چاہئے۔ کسی پیغمبر نے اسلام کے پیغمبر سے
زیادہ زور کے ساتھ اس امر کی فہمائش نہیں کی ہے۔ میں آپ کے سامنے حال کے ایک
مصنف کے الفاظ عرض کرتا ہوں "ہمیشہ حق کے اوپر لڑے جاؤ اگرچہ اُس حق کی وجہ سے
تمہارا کچھ نقصان ہی کیوں نہو اور تم آخر میں فتحیاب ہو گے۔ کیونکہ اس موقع پر اطاعت قبول
کر لینا گویا اُس اعلیٰ اخلاقی خیال کی حقارت کرنا ہے جو ہماری رہنمائی کرتا ہے اور اُس غور
کرنے کی قابلیت کو چھوڑ دینا ہے جس کو ہم کانشنس کے نام سے تعبیر کرتے ہیں۔ جبکہ آدمی
ایسا کرتے ہیں تو حق و باطل کی قوت تمیز یہ بالکل کند ہو جاتی ہے اور وہ خیال جو کہ اُن کو عمدہ

رائے اور ارادوں کی طرف مائل کرتا ہے اور جو تلون مزاجوں اور کمزوروں کو نصیب نہیں ہوتا ہے۔ دور ہو جاتا ہے"۔

ہمیشہ خیال رکھئے کہ ہم خلاقِ کون و مکان کی حضوری میں کام کر رہے ہیں اور ہمیشہ اپنی کوششوں اور کاموں میں اُس کی رہنمائی کا امیدوار رہنا چاہیئے۔ اگر آپ کے دلوں میں یہ خیال رہے گا تو آپ کی زندگی دوسروں کے واسطے نمونہ کا کام دے گی کیونکہ خدا کے حضور میں آپ ضرور نیک زندگی بسر کریں گے۔ صدق اور پرہیزگاری یہ دو اور اعلیٰ خیالات ہیں جو نوجوانوں کو مدنظر رکھنے چاہیئیں۔ ہر انسان کی زندگی میں ایک ایسا نازک وقت آتا ہے جبکہ اُس کے دل میں دوسروں کی ہمدردی اور صحبت کی خواہش پیدا ہو جاتی ہے اُس وقت میں ضبط اور اُن لوگوں کی عقلمندانہ رہنمائی کی بہت ضرورت ہے جن کے سپرد اُن نوجوانوں کی تربیت ہے اپنی طبیعتوں کے اُس فطرتی خیال کو جو ہمیں برائیوں سے باز رکھتا ہے بُری مثالوں کے مضر اثر سے نہ روکنا چاہیئے۔ گزشتہ زمانہ کی دماغی قوتوں کو پھر حاصل کرنے کے لئے ہم کو اعلیٰ سوشیل ترقی پر پہنچنا چاہیئے کیونکہ دماغی ترقی بہت کچھ سوشیل اور خاندانی ترقی پر منحصر ہے۔ ہم کو چاہیئے کہ اپنی عورتوں کو ایسی عزت اور تعظیم کی نگاہ سے دیکھیں جیسا کہ قدیم زمانے میں دیکھتے تھے۔ اور اُن کو اُس عزت و تعظیم کے قابل بنا دیں۔ ہم کو آج کل کے سوشیل تنزل میں یہ نہ بھول جانا چاہیئے کہ عورتوں کی قدر و منزلت کرنا اعلیٰ ترین انسانوں کا وصف ہے۔ اگر ہم عورتوں کو اُس عزت پر پہنچائیں اور اُن کو نیکی و عفت کا جامہ پہنا دیں تو ہم کبھی ذلیل صحبتوں سے خوش نہ ہوں گے۔

دوسرا اعلیٰ خیال جو نوجوانوں کو اپنے دل میں رکھنا چاہیئے ترقی کا خیال ہے ترقی کی قابلیت ہر ایک انسان میں ہوتی ہے۔ تعلیم اور تربیت ہی صرف اُس قابلیت میں جان ڈال دیتی ہے۔ تعلیم انسان کو تاریکی میں سے روشنی میں لاتی ہے۔ لیکن تعلیم اُس وقت تک بے سود ہی ہے جب تک یہ نہ خیال کیا جاوے کہ علم و ترقی کی جو کہ لازم و ملزوم ہیں کوئی حد نہیں ہے۔ اور سکون کے معنی پیچھے لوٹ چلنا ہیں۔ ہم آج کل کے نوجوانوں کو دیکھتے ہیں کہ شروع میں تو وہ بڑی تیزی دکھاتے ہیں۔ اور تھوڑی کامیابی کے بعد اُن کی قوت زائل ہو جاتی ہے۔ پہلے تو وہ ترقی کرنا چھوڑ دیتے ہیں اور پھر تنزل شروع ہو جاتا ہے۔ ہمارے نوجوانوں کو یہ غلطی نہ کرنا چاہیئے کہ چند امتحانات کا پاس کرنا اُن کو ترقی کی حد پر پہنچا دے گا۔ اور اُن کو یورپ کی سیر آ در دہ

یونی ورسٹیوں کے فاضلوں کے برابر بنا دے گا اگر ہم اپنے اور اپنی قوم کے فرائض ادا کرنا چاہتے ہیں تو ہم کو کسی خاص مقصد کے واسطے کام کرنا چاہیئے کیونکہ جو بغیر مقصد کے کام کرتا ہے وہ مثل ایسی کشتی کے ہے جس میں پتوار نہیں ہے۔ مستقل ارادہ کا نہونا اور تلون مزاجی شکست کی نشانی ہے وہ لوگ جو فتح حاصل کرتے ہیں وہی لوگ ہوتے ہیں جو مستقل مزاجی اور ثابت قدمی کے ساتھ اپنے اُس مقصد کے حاصل کرنے کے لئے جس کا انہوں نے پہلے ہی فیصلہ کر لیا چلتے ہیں۔ کامیابی اُنھیں لوگوں کو حاصل ہوتی ہے جو کہ بخوبی واقف ہیں کہ زندگی میں کام کرنے کے لئے ایک طریقہ ہونا چاہیئے اور جو کہ وقت کی قابل افسوس کمی کو سمجھتے ہیں۔ اس واسطے آپ کو اپنی طبیعت سے کام کرنا چاہیئے جرارت اور مستقل مزاجی سے کام کرنا چاہیئے۔ ایک کتاب میں جو کہ میں حال میں پڑھ رہا تھا ایک ایسا فقرہ دیکھا جو ہمارے ملک کی حالت کے لئے بہت موزوں ہے مصنف لکھتا ہے کہ "میں اُس نوجوان پر بالکل اعتبار نہیں کرتا جو اپنی حالت پر نارضامندی ظاہر کرتا ہے اور جلد یقین کر لینے والے لوگوں سے کہتا ہے کہ اگر میری حالت بہتر ہوتی تو میں بڑے بڑے کام کرتا" عموماً یہ قصور حالت کا نہیں ہوتا ہے۔ بلکہ یہ نقص ادائے فرض میں جسمانی تکلیف کا مقابلہ کرنے کے مستقل مزاجی اور مستعدی کے نہونے غور و فکر کے نہ کرنے اور کام کرنے کی قابلیت کی جو عادت سے حاصل ہوتی ہے نہ ہونے کا ہے۔

اس لئے ہمارے نوجوانوں کو اعلیٰ حوصلے دل میں رکھنے چاہئیں۔ اور استقلال سے اُن کے حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ جس اعلیٰ رتبہ تک ہم پہنچنا چاہتے ہیں وہاں تو ہم شاید نہ پہنچ سکیں مگر ان اعلیٰ مثالوں کے خیال رکھنے کا اثر ہم پر بہت اچھا پڑے گا۔ امریکہ کے ایک شاعر نے انسانی زندگی کے مقاصد کو ایک نظم میں بیان کیا ہے جو ہمارے بہت سے نوجوانوں نے پڑھی ہوگی اور جس نے کہ غالباً اُن کو مستعدی کی طرف مائل کیا ہوگا۔ لیکن ایک فارسی شاعر کے پاکیزہ الفاظ چند ہی نے پڑھے ہونگے۔

نخواہم لاجرم نعمت نہ در دنیا نہ در جنت | ہمی خواہم بہ ہر ساعت چہ در سرا چہ در ضرا
کہ یارب مے سنائی را صناعی دہ تو در حکمت | چناں کزوی بہ رشک آید روانِ بوعلی سینا

اجلاس چہاردہم

(منعقدہ رام پور سنہ ۱۹۰۰ء)

صدر علی یار خاں بہادر موتمن جنگ عماد الدولہ عماد الملک

مولوی سید حسین صاحب مرحوم بلگرامی

حالات صدر ملاحظہ ہوں بہ سلسلۂ اجلاس یازدہم منعقدہ میرٹھ سنہ ۱۸۹۶ء صفحہ ۱۱۷

خطبۂ صدارت

حضرات! آپ پر بخوبی روشن ہے کہ اس سالانہ جلسہ میں بڑی بڑی غرضیں ملحوظ رکھی گئی ہیں اول غرض یہ ہے کہ مختلف مقاموں کے تربیت یافتہ مسلمان سال میں ایک بار ایک جا پر مجتمع ہوں اور یک جائی کے زمانہ میں روزانہ ملاقات و اختلاط سے باہمی ربط و محبت زیادہ ہو قومی مصالح و اغراض کی نسبت دوسرے کی رائے پر مطلع ہوں اور اُن کے حصول کے لئے بالاتفاق سعی و کوشش کرنے کا مادہ قوم میں پیدا ہو۔

دوسری غرض یہ ہے کہ مختلف اضلاع کے لوگ اپنی مقامی ضرورتوں کو ایک دوسرے پر ظاہر کر سکیں اور مقامی تعلیم کی نسبت باہمی مشورہ سے نئی تدبیریں اور نئی تجویزیں اختراع کر سکیں۔

تیسرے اور سب سے عمدہ غرض جو گویا اصل علت غائی اس جلسہ کی ہے وہ یہ ہے کہ سرداران و بزرگان قوم کو موقع دیا جائے کہ وہ اپنی قوم کی صلاح و فلاح خصوصاً اُن کی اعلیٰ درجہ کی

تعلیم کی نسبت جس پر ہر قسم کی صلاح و فلاح کا دار و مدار ہے بالاتفاق سعی و کوشش کر سکیں اور نہ غلبہ آرا تجاویز نہ تدابیر قرار دے سکیں۔ خصوصاً مدرستہ العلوم علی گڈھ کے استحکام و اصلاح و ترقی کی جانب متوجہ ہوں جہاں بنیاد اس قومی کام کی عمدہ اور مسلم اصول پر ڈالی جا چکی ہے، اور ایک درجہ تک کامیابی بھی حاصل ہو چکی ہے۔

سید صاحب مرحوم کی حیات میں جو اس کانفرنس کے اصل بانی تھے اس کے پانچ اجلاس علی گڈھ میں ہوئے اور پانچ اجلاس دوسرے مختلف مقاموں میں۔ یعنی لکھنؤ۔ لاہور۔ الہ آباد۔ دہلی۔ شاہجہان پور۔ اور میرٹھ میں ۱۸۹۷ء خالی گیا۔ کہیں اجلاس نہیں ہوا۔ سید صاحب کی وفات کے بعد نواب محسن الملک بہادر کی خاص کوششوں سے ۱۸۹۸ء کا اجلاس لاہور میں اور ۱۸۹۹ء یعنی سال گزشتہ کا اجلاس کلکتہ میں ہوا۔ اور دونوں اجلاس نہایت کامیابی کے ساتھ انجام پائے۔

۱۸۸۸ء تک کانفرنس ایک مجمع محض صلاح و مشورہ کے واسطے تھا۔ کوئی عملی کارروائی اُس کے ذمہ نہ تھی ۱۸۸۹ء سے یہ نقص مٹ گیا اور عملی کارروائی کی بنا لاہور کے جلسہ میں اس تجویز کی منظوری سے ڈالی گئی کہ مختلف شہروں میں کمیٹیاں قائم ہوں اور اُن کا یہ کام ہو کہ وہ غریب طلباء کی مدد کے واسطے چندہ جمع کریں۔ اس مختصر تاریخی تذکرے کے بعد کانفرنس کے مقاصد کی طرف آپ کی گراں بہا توجہ کا خواستگار رہوں۔

غرض اول و دویم کی نسبت اس قدر عرض کرنا کافی ہے کہ ایک وقت وہ تھا کہ فقط میلوں ٹھیلوں میں لوگ جمع ہوا کرتے تھے اور اکثر وقت اُن کا لغویات میں صرف ہوا کرتا تھا کبھی بازاروں کی سیر دوکانوں کی دیکھ بھال، کبھی ناچ رنگ میں محویت، کبھی گھوڑ دوڑ کا تماشہ تھا۔ کسی طرف بندر یا ریچھ کا ناچ۔ کسی طرف بھانمتی کا کھیل یا بازی گروں کے کرتب نظر آتے تھے۔ تماشائیوں کا روپیہ پیسہ بہت صرف ہوتا تھا۔ دل لگی بہت ہوتی تھی۔ اور اندرونی تجارت کو ترقی ہوتی تھی۔ مگر کوئی اس قسم کا جلسہ کہیں مقرر نہ تھا جہاں وقتاً فوقتاً سربرآوردہ لوگ جمع ہوں۔ قومی رفاہ کا کام، قومی اصلاح کی چھیڑ چھاڑ ہوتی رہی اور نہ اس قماش کے لوگ اس قدر بُعدِ مسافت سے کہیں جمع ہوتے تھے۔ جس طرح کہ بزرگ وار لوگ آج اس مجمع میں تشریف رکھتے ہیں۔ یہ مرحوم مغفور سر سید احمد خاں اور اُن کے رفیقوں کی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ چودہ پندرہ سال سے ہر سال کسی نہ کسی بڑے مقام میں تمام ہندوستان کے منتخب افراد جمع ہوتے ہیں۔

بہتیرے نادیدہ دوستوں کے ارمان پورے ہوتے ہیں۔ ایک دوسرے کی ملاقات سے خوشی حاصل کرتے ہیں۔ باہمی ربط و اتفاق کا سلسلہ مضبوط ہوتا ہے زیادہ تر تعلیم کے مسئلہ پر گفتگو ہوتی ہے۔ ہر شخص اپنے بچوں کی یا اپنے قصبہ کے بچوں کی تعلیمی مشکلات کو اپنے دوستوں ملاقاتیوں سے بیان کرتا ہے اور کارآمد صلاحیں اور مشورے حاصل کرتا ہے جس سے دور یا نزدیک کچھ نہ کچھ نتیجہ نکل ہی آتا ہے ملاحظہ کریجیئے کہ اس وقت یہاں کتنے ہی افراد ہر صنف و درجہ کے موجود ہیں۔ جن کا اس شہر میں وارد ہونا بغیر اجلسہ قومی کے نہایت ہی موہوم اور غیر متوقع تھا۔

سال گذشتہ کے جلسہ نے مشرقی بنگالہ کے مسلمانوں میں تعلیمی جوش تازہ کر دیا اور مسلمانوں کے بہت سے عمدہ افراد میں جو ایک دوسرے سے ناواقف اور ناآشنا تھے اس حیلہ سے ملاقات کرائی اور ربط و اتحاد پیدا کر دیا۔

تیسری غرض اعلیٰ تعلیم کی اشاعت کی اس وقت علی گڈھ کالج سے متعلق ہے۔ اور میرے نزدیک زمانہ کی ضرورتوں کے لحاظ سے یہی غرض سب میں عمدہ ہے اور اسی کے حصول میں ہم کو زیادہ تعجیل کی ضرورت ہے۔ مقامی ضرورتوں کے رفع کرنے کے لئے ہر صوبہ اور ہر ضلع میں سرکار کی فیاضی سے مدارس ہر قسم کے موجود ہیں۔ اگرچہ یہ ذرائع تعلیم رعایا کی مقامی کوششوں سے مستغنی نہیں ہیں تاہم مقامی کوششیں مقامی حد تک محدود ہیں اور سرکاری فیاضی ہماری قومی ضرورتوں تک ہرگز دسترس نہیں رکھ سکتی بغیر اس کے کہ ہم مسلمان بالاتفاق کوشش کریں کبھی کوئی ایسا دارالعلوم قائم نہیں ہو سکتا جہاں زمانہ کے موافق اعلیٰ تعلیم کے ذریعے مہیّا کئے جائیں اور جس کا فیض تمام ہندوستان کے مسلمانوں پر عام ہو۔

یوں کہنے کو تو تعلیم کے فوائد سے ہم سب واقف ہیں اور ایک بالکل صرف ناآشنا شخص بھی عالم کی عزت اور علم کی قدر کرتا ہے اور اپنی اولاد کا جاہل رہنے کی نسبت لکھ پڑھ لینا بہتر سمجھتا ہے اور عموماً خواندہ لوگ تعلیم کے پیش پا اُفتادہ مسائل سے کم و بیش واقف ہیں یا اپنے آپ کو واقف سمجھتے ہیں۔ تاہم اس قدر کہنا شاید مبالغہ نہ ہوگا کہ عام طور پر اور علی الاطراد اپنی اولاد کو دروازے پر میاں جی کے پاس بٹھا دینا یا اسکول میں نام لکھا دینا اُن کے ادائے حقوق کی حد تک کافی و وافی سمجھا جاتا ہے اور ایک بڑی ذمہ داری سے اس کا بار دوسروں پر ڈال کر سبکدوشی حاصل ہو جاتی۔ مگر کلام اس میں ہے کہ آیا ہم فی الواقع تعلیم کی حقیقت سے واقف ہیں اور اپنی اولاد کی

تعلیم میں اُس واقفیت سے پورا کام لے کر اپنے فرائض درست طور پر ادا کرتے ہیں۔ اصول قانون کا ایک کلیہ یہ ہے کہ کوئی مجرم عدم واقفیت قانون فوجداری کا عذر پیش کر کے سزاء جرم سے مستثنیٰ نہیں ہو سکتا۔ یہ دراصل قانون قدرت کا تتبع ہے۔ قانون قدرت سے بے خبر ہونا آدمی کو اُس کے خلاف ورزی کی پاداش سے نہیں بچاتا۔ جو آگ سے کھیلتا ہے وہ جل ہی جاتا ہے۔ کوئی حیلہ اور عذر کام نہیں آتا۔ کیا ہم اپنی اولاد کی تعلیم میں بے خبری اور لاعلمی کا حیلہ کر سکتے ہیں۔ بے شک لاعلمی اور بے خبری کا عذر ہم پیش کر سکتے ہیں۔ مگر کیا یہ عذر ہمارے کچھ کام بھی آتا ہے۔ کیا اس سے ہماری اولاد کی حالت درست ہو جاتی ہے۔ اُن کی دنیا و آخرت سدھر جاتی ہے۔ ہرگز نہیں۔ بے خبری کا عذر کر کے ہم کتنا ہی اپنا دل خوش کر لیں مگر بے ترتیب رہنے کے نتائج ہماری اولاد بھگتتی ہے۔ پس کیا ہمارا فرض نہیں ہے کہ ہم میں سے ہر شخص جو اپنی اولاد کے حقوق کو تسلیم کرتا ہے اور اُن کی بھلائی چاہتا ہے اوّل بطور خود تحقیق کرے کہ تعلیم کس کا نام ہے اور کس قسم کی تعلیم کی ہم کو ضرورت ہے۔ کیونکہ زمانہ کے تغیرات کے ساتھ تعلیم کے اغراض بھی اور طریقے بدلتے رہتے ہیں۔ ایک وقت وہ تھا کہ تکبندی اور قافیہ سنجی سے امرکے درباروں میں رسائی ہوتی تھی۔ اور روزی کا ٹھکانا لگتا تھا یا خطاطی اور خوشنویسی کی قدر تھی۔ لوگ قطعے لکھ کر اپنا پیٹ پالتے تھے۔ ایک ایک قطعہ کی قیمت اُمرا سیکڑوں بلکہ ہزاروں تک دیتے تھے اب نہ کوئی غزلوں کو پوچھتا ہے نہ قطعوں کی قدر ہے ایک زمانہ میں دفتر فارسی تھا۔ فارسی کی قدر تھی۔ خط خطوط فارسی میں لکھے جاتے تھے چغتائی سلاطین حکم راں تھے۔ شوقین فارسی کے ساتھ ترکی بھی سیکھتے تھے اور فارسی کی انشا پردازی میں بہت زور لگاتے تھے۔ علم کا جس کو شوق تھا وہ عربی علوم سیکھتے تھے۔ مدتوں طالبعلمی کرتے تھے۔ خیرآباد۔ سندیلہ۔ بہار وغیرہ قصبات اُس زمانہ میں ایک طور سے یونیورسٹیوں کا کام دیتے تھے۔ اور دُور دُور سے طالبِ علم آتے تھے۔ اور برسوں تحصیل علوم میں مشغول رہتے تھے۔ کہیں معقولات کا بحث و مباحثہ تھا۔ کہیں منقولات کا درس تھا۔ کہیں علوم ادبیہ کا چرچا تھا۔ کسی طرف متکلمین کا زور تھا۔ اب وہ دنیا بھی ندارد ہے بالکل دنیا بدل گئی۔ اب نہ غزل گوئی سے کام چلتا ہے نہ خوشنویسی سے روٹی ملتی ہے۔ ارسطو و شیخ بو علی سینا کی طبیعات دفترِ پارینہ ہے مجسطی و طوسی کی ہئیت از کار رفتہ ہیں۔ خیام کا جبر و مقابلہ کام نہیں آتا۔ جابر کی کیمیا کو کوئی نہیں پوچھتا۔ ابن رشد کے فلسفہ سے کسی کو بحث نہیں۔ نہ

فارابی کی حکمت الاشراق سے کسی کو کام ہے۔ اب ان مباحث میں کوئی وقت صرف کرتا ہے تو فقط تاریخی حیثیت سے اُن پر نظر ڈالتا ہے۔ اور بطور یادگار اُن کو درج کتاب کرتا ہے۔

اصل یہ ہے کہ ہم خواب غفلت میں ایک مدت سے پڑے سوتے ہیں اور زمانہ ہمارے سر پر بیدار ہے۔ ہم کو اور ہماری تمام قوم کو ایک مدت سے سکون ہے اور زمین ہمارے قدموں کے تلے ہر وقت متحرک ہے۔ ہمارے انحطاط کی میعاد اُسی وقت سے مضبوط اور ہماری صلاح و فلاح کی عمارت اُسی زمانہ سے رو بہ خرابی ہے جب کہ ہم نے پارینہ علوم اور قدما کی تصانیف پر قناعت کر کے طریقہ تحقیق و ابداع و ایجاد و اختراع چھوڑ دیا۔ بزرگوں کی عادات و اخلاق ترک کئے۔ کسب معیشت کی عادت نہ رہی۔ دنیا کی تجارت اجوایک وقت ہمارے ہاتھ میں تھی اُس کو اپنی غفلت سے کھو بیٹھے۔ زمانہ کے ساتھ نہ چلے۔ دوسری قومیں ہم سے منزلوں پیش قدمی کرتی گئیں۔ اور ہم اپنی پرانی لکیر پیٹتے رہ گئے۔ نہ ہم میں راستی نہ راست بازی رہی۔ نہ ہمت و مردانگی رہی۔ نہ کوئی علم رہا۔ نہ کوئی فن رہا۔ غرض تمام اُن صفات سے جن کی بدولت قوم وقعت و عزت و قوت و اقتدار حاصل کرتی ہے۔ ہم خالی اور عاری ہو گئے اور زوال ہمارے لئے ایک امر لازمی بن گیا۔ جو کوئی یہ خیال کرتا ہے کہ حکومت و سلطنت کے جانے سے ہماری یہ حالت ہوئی اُس کا خیال بے اصل، اُس کا قیاس مع الفارق ہے۔ حقیقت بالکل اُس کے برعکس ہے۔ زوال علم و ابتلاء ذمائم اخلاق زوال دولت کا سبب ہوا۔ اور ان مصائب و نوائب کا بیج کل پرسوں کا نہیں بلکہ مدت کا بویا ہوا ہے۔ مگر بعد خرابی بصرہ اب ہم کچھ اس خواب غفلت سے چونکے ہیں اور اپنی صلاح کار کی تدبیریں سوچ رہے ہیں جس کا یہ کانفرنس ایک نمونہ ہے۔ اب ہم کو کچھ خیال پیدا ہو چلا ہے کہ دنیا کی ترقی میں ہم بھی کسی قدر کچھ حصہ نصیب حاصل کریں۔ کھوئی ہوئی دولت علمی کو پھر ٹٹولیں۔ ہماری خواب غفلت کے زمانہ میں جو ترقیاں ہو گئی ہیں اُن سے ہم بھی متمتع ہوں۔ اگرچہ ہم میں ایسے بھی بزرگوار ہیں جو اب بھی قدیم علوم ہی کو علوم سمجھتے ہیں اور علم میں ترقی ہونے کے قائل نہیں ہیں۔ مگر یہ جہل مرکب عام نہیں ہے۔ واقعات کے سخت و زبردست تازیانے نے عموماً یہ خیال خام ہمارے دلوں سے نکال دیا ہے اور اب ہم اس زمانہ کی ضرورتوں کے موافق عمل کرنے پر آمادہ ہو چلے ہیں۔ اور یوروپ کے جدید علوم اور طریقہ تمدن

کی جانب متوجہ ہوئے ہیں۔

حضرات۔ غنیمت جانئے کہ جب ہماری حکومت پر ہمارے اپنے کردار وں سے زوال آیا اور دولت و مملکت جس کے سنبھالنے کی قوت ہم میں باقی نہ رہی تھی ہمارے قبضہ سے نکل گئی تو خداوند عالم نے ہمارے حال پر رحم فرمایا اور ہم کو مرہٹوں یا افغانوں کا مطیع نہ بنایا۔ نہ کسی اور وحشی یا جابر قوم کو ہم پر مسلط فرمایا۔ ہم کو ایک ایسی صالح قوم کے حوالہ کیا جو علم و ہنر و متانت و فطانت کے اعتبار سے جدید دنیا کی دوسری قوموں میں سر برآوردہ وانصاف پسندی و آزادی میں مستثنیٰ اور پیش قدم ہے ہمارے نئے حاکموں نے امن و امان قایم کیا جس کو ہم مدت سے بھول گئے تھے۔ ضعیف کو قوی کے ہاتھ سے بچایا۔ ہر ذی حق کا حق تسلیم کیا۔ اور ہمارے حفظ و حقوق کے راستے علیٰ قدر طاقت بشری مضبوط کئے ساری ایشیا میں نقل و حرکت کی صاف کر ڈالیں اور تمام ولایت اور معمورات دنیا کو جو ہم سے ہزاروں فرسخ کے فاصلہ پر تھے ہمارے نزدیک کر دیا۔ اور ہمارے واسطے طے الارض کا مسئلہ حل کر دیا۔ ہر مذہب و ملت کو آزاد چھوڑ دیا۔ نہ مندر پر محصول لگا نہ مسجد پر ٹیکس باندھا۔ تقلید کور و کانہ اجتہاد سے تعرض کیا۔ فقط رو کا تو دل آزاری کو یا مداخلت بیجا کو روکا۔ جو ایک حکیمانہ سلطنت کا شعار ہے علوم کے دروازے ہمارے لئے کھولدیئے اور تحصیل علوم کو آسان کر دیا۔ علوم بھی وہ علوم ہم تک پہنچائے جن کے آگے ارسطو و افلاطون و شیخ رئیس ابن ہیثم طفل کتب ہیں۔ اور صدیوں کے بعد ہم کو پھر از سر نو بیش بہا سبق پڑھایا کہ علم و فلسفہ مثل جمادات کے نہیں ہے کہ جس میں نمو و حرکت نہ ہو بلکہ انسان کی فکر غیر متناہی ترقی کر سکتی اور یہ ترقی سوائے ہمارے اپنی کاہلی و پست ہمتی اور تعصب اور جہل مرکب کے اور کسی حد سے محدود نہیں ہے اور نہ کوئی سد سکندری اس کے آگے حایل ہے۔

ان احسانوں پر بھی اگر ہم میں سے چند رعایا گاہ گاہ نارضامندی کی صدا بلند کرتے ہیں یا اخباروں میں شکایتیں چھاپتے ہیں تو اُس کا سبب معلوم کرنا بہت آسان ہے جس کو ہر صاحبِ فکرِ سلیم ادنی تامل سے خود سمجھ جائے گا۔ یعنی یہ کہ اگر ملک میں اس درجہ کا امن و امان نہ ہوتا۔ اگر ہر زبردست اپنے زیر دستوں کو ستا سکتا، اگر راجہ زمیندار رئیس ہمیشہ آپس میں لڑا بھڑا کرتے تو کسی فرد بشر کو بھی فرصت باریک بینی و عیب چینی کی نہ ملتی۔ شکایتوں کا اصل سبب یہ ہے کہ اس حکومت میں جو کوئی ظلم کرتا ہے وہ سزا پاتا ہے کوئی مجرم اپنی

شرافت یا امارت کی ٹٹی کی آڑ میں پناہ نہیں لے سکتا۔ مسلمان ہندو کو دبا نہیں سکتا۔ شیعہ سنی پر زیادتی نہیں کر سکتا۔ نہ سُنّی شیعہ پر دست درازی کرنے پاتا۔ انسان کا یہ ایک طبعی مسلک ہے کہ جب یہ ذات شریف اپنی نفسانی خواہشوں کو پورا نہیں کر سکتے یا اُن کے ناجائز جلب منافع میں کوئی عائق یا مانع پیدا ہو جاتا ہے تو وہ ضرور دست و پاچہ ہوتے ہیں اور اُن اسباب پر اپنی بھڑاس نکال لیتے ہیں جن سے اُن کو ناکامیابی نصیب ہوئی اس کے علاوہ ہم کو اس حکومت میں آزادی حاصل ہے۔ ہم اپنے دل کے پھپولے توڑ لیتے ہیں بھلا افغانستان میں تو کوئی امیر کے کسی حکم پر اعتراض کرے یا اُس میں سرکار کے خلاف کوئی آرٹکل لکھے یا خانگی صحبتوں میں سے کوئی کلمہ شکایت کا زباں پر لائے۔ اور یہ سیاست اُن کی اپنی قوم گوارا کرتی ہے۔ مفتوح قوموں کا ذکر نہیں ہے۔ مفتوح قوموں پر اُن کی سیاست اس سے بدرجہا سخت تر ہے۔ ہاں ہمارے ہندوستان میں اگر اہل حدیث کو اجازت ملجائے کہ وہ اُن لوگوں پر جن کو وہ اہل بدعت کہتے ہیں جب چاہیں حد جاری کریں۔ اگر اہل بدعت کو اختیار ہو کہ وہابیت کے جرم میں لوگوں کو اپنی رائے کے موافق سزا دیا کریں۔ اگر شیعہ سُنّیوں کی دل آزاری کے مجاز کر دئے جاویں۔ اور سنی شیعہ کے ستانے کے مختار بنا دئے جائیں۔ اگر زمیندار بلاخوف نیلام مالگزاری سرکار ہضم کر جانے کا موقع پاتے رہیں، اگر یار لوگ مرضی کے موافق خدمات سرکاری آپس میں تقسیم کر سکیں، اگر مہاجن ساہوکار سے قرض لی ہوئی رقم ڈانٹ ڈپٹ کر ہضم کر جا سکیں تو شاید البتہ خاص خاص فرقوں کو جن کی آواز پبلک کے کانوں تک پہنچ سکتی ہے آسایش ملیگی اور وہ پھر زبانِ شکایت نہ کھولیں گے۔ اصل یہ ہے کہ شکایت و نارضامندی کی سچی بنیاد اور حقیقی علت جیسا کہ میں ابھی عرض کر چکا ہوں یہ ہے کہ قانون نے زبردست اور زیردست کو مساوی کر دیا ہے اور خود سراتہ زندگی کی بنیاد مساوی ہے۔ بعض دیسی ریاستوں میں جہاں قانون اکثر توڑنے کو لئے بنا کرتا ہے اور صاحب اقتدار اور حاکم رئیس لوگ جب چاہیں قانون سے اپنے آپ کو یا اپنے متوسلوں کو مستثنیٰ کرالیں اس کے بارے میں یہ شکایت سُننے میں نہیں آئی۔ مگر ولے بر حال اُن لوگوں کے جو حاکم یا رئیس یا صاحب اقتدار نہیں ہیں۔ وائے بر حال غریب رعایا کے جو بے زبان ہیں اور جن کی صدائے واویلا حاکم وقت کے کانوں تک پہنچنے نہیں پاتی۔

حضرات! میں یہاں گورنمنٹ کی طرف سے وکیل بن کے نہیں آیا ہوں۔ میں فقط حرفِ حق مُنہ سے نکالنا چاہتا ہوں۔ گو بفحوائے الحق مُرٌّ، کلمہ حق کسی کو تلخ ہی کیوں نہ معلوم ہو اور

یہ حرف حق گورنمنٹ کی خیر خواہی سے نہیں کہتا بلکہ اپنی اور اپنی قوم کی خیر خواہی سے کہتا ہوں میں اُن لوگوں کے ساتھ بالکل متفق الرائے نہیں ہوں جو اگر کہتے نہیں تو دل ہی دل میں سمجھتے ہیں کہ غیر قوم کی اطاعت کرنا خوب نہیں اپنی قوم کی حکومت بہتر ہے۔ مگر اُس کے ساتھ ہی میں چاہتا ہوں اور آپ سب حضرات جانتے ہوں گے کہ ہمارا ملک پھلے اور پھولے۔ امن وامان وقایم رہے عالم کی علمی ترقیوں میں ہم شریک ہو سکیں۔ شخصی آزادی ہر فرد بشر کو حاصل رہے تجارت کو ترقی ہو۔ زراعت میں توسیع ہو۔ آبادی بڑھے۔ رعایا کو قحط سالی کے مصائب سے بچانے کی فکریں ہوں۔ امراض وبائی کی مقاومت کی جائے۔ سڑکیں صاف۔ رہگذر محفوظ و مامون رہیں ملک کی دولت کیا بالائے سطح زمین اور کیا زیر سطح زمین ظاہر کی جائے۔ اور اُس سے ملک اور اہل ملک متمتع ہوں۔ غرض تمام برکات ایک مضبوط و باقوت حکیمانہ حکومت کے ہم کو حاصل رہیں۔

اب آپ ہی انصاف فرمائیے کہ وہ کونسی حکومت ہے جو ان برکات کا سرچشمہ ہے اگر خدانخواستہ دفعتاً کل حاکم وقت کا دست شفقت ملک پر سے اُٹھ جائے تو آپ خوب خیال فرما سکتے ہیں کہ مآل کار کیا ہوگا۔ ایک مدت تک ملک مثل دیگ کے جوش کھایا کرے گا۔ ہر قسم کا سوء عمل ہر طرح کی بدمعاشی ہر نوع کا مفسدہ اُبل کر اوپر آ رہے گا۔ شہر ویران رعایا تباہ ہوتی رہے گی۔ تاوقتیکہ کوئی جابر قوم باہر سے بخیال ترکتازی یا بفکر ملک گیری فوج کشی کرے اور ظالم و مظلوم۔ زبردست۔ زیردست دونوں کو یکساں اپنی تلواروں کے گھاٹوں پر پانی پلائے۔ نتیجہ ان سب کا یہ ہوگا کہ سو ڈیڑھ سو برس کی کاوش سے جو ترقیاں بتدریج اس وقت تک ہوتی آتی ہیں سب ایک چشم زدن میں خاک ہو جاویں گی۔ یہ فراغت یہ اسباب ترقی یہ مواقع تحصیل و دولت۔ یہ شخصی۔ یہ مذہبی آزادی جو اب ہمکو حاصل ہے پھر کبھی ہم کو حاصل نہ ہوگی۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ ہر شایستہ گورنمنٹ میں رعایا کا حق نکتہ چینی مسلم گنا جاتا ہے اور ہم رعایائے ہندوستان بھی گو اس حق سے محروم نہیں ہیں۔ مگر گورنمنٹ کی تدابیر اور تجاویز کی تقلید دو طرح سے ہو سکتی ہے ایک مدعیانہ اور ایک نیازمندانہ۔ مدعیانہ نکتہ چینی جو ہر فعل کو گورنمنٹ کی بدنیتی پر محمول کرتی ہے اور آسمانی مصائب کو بھی حکومت کی طرف منسوب کرتی ہے۔ کسی عاقل کے نزدیک جائز نہیں ہو سکتی۔ اور نہ کوئی قوی اور با اقتدار گورنمنٹ اس قسم کی نکتہ چینی کو رضامندی کی نگاہ سے دیکھ سکتی ہے۔ یہ مادہ فاسدہ مثل مادہ امراض وبائی کے ہے جس کا قلع قمع اول ہی سے واجب ہے تاکہ بڑھ کر ملک کو مصائب میں مبتلا نہ کرے۔ اگر اس قسم کی مدعیانہ تحریر و تقریر جائز نہ رکھی جائے اور یہ زہر

ملک میں پھیلتا جائے تو اس کا فاسد اثر خود غریب رعایا ہی کے لئے قاتل نکلے گا۔ حاکموں کا تو شاید بال بھی بیکا نہ ہوگا۔ باقی رہی نیا زمندانہ نکتہ چینی وہ اس عہد حکومت میں ہمارے حقوق قانونی میں داخل ہے۔ اگر ہم چاہیں تو اُس سے ہر وقت فائدہ اُٹھا سکتے ہیں۔ مگر تدابیر ملک داری میں صائب رائے دینا۔ ملک کے نفع و نقصان کو درست طور پر سمجھنا بقول ابرانیاں "خانۂ خالہ نیست" اس کے واسطے تو علم الخیر یہ درکار ہے۔ یہ وہ مسائل نہیں ہیں کہ ہر اسکول کالج کا کھڑا ہو جائے اور اُن تجاویز مملکت میں جن کو بڑے بڑے صاحب علم و تجربہ کار مدتوں غور و تامل کر کے جاری کرتے ہیں رائے زنی شروع کرے۔ اور ہم سے توقع کی جائے کہ ہم بھی اُس کی روانی تقریر پر تالیاں بجائیں اور واہ واہ کی صدا بلند کریں۔

اول ہم کو لازم ہے کہ ہم علم حاصل کریں اور پُرانی لکیر پیٹنا چھوڑ دیں اور وہ تدابیر اپنے لئے سوچیں جس سے ہم جدید علوم اور جدید طریقہ تمدن کو سمجھ سکیں اور اپنی ضرورتوں کے موافق اُن سے کام لے سکیں۔ پولیٹکل معاملات اور انتظامی تدبیرات کی نسبت رائے دینے کی قابلیت پیدا کریں۔ حکومتِ وقت کی مشکلات کو سمجھیں، اور ہمدردی اور وفاداری کے ساتھ اُن پر نظر ڈالیں۔ مختصر ایسی روش اختیار کریں کہ حکومت ہماری رائے کو وقعت کی نظر سے دیکھے اور ہم کو امور ملکی و مالی میں مشورہ دینے کا اہل سمجھے۔ جو منصب ہم کو کسی وقت اور کسی صدی میں حاصل نہ تھا۔ کوئی حکومت اُس کے اجزا کیسے ہی عاقل کیوں نہوں عیب سے خالی نہیں۔ کیونکہ انسان کی عقل ہر حالت میں محدود ہے۔ مگر جس حکومت کی رتق و فتق کا دار و مدار ایسے مدبرین و وزرا کی جماعت کثیر پر ہے جو علم و دانش و تجربہ سے آراستہ و پیراستہ ہیں اُن میں اُمید کی جا سکتی ہے کہ خطا کم ہوگی۔ ہر کام غور و فکر و استقلال کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ ایسی حکومت کی تجاویز و تدابیر میں جو کوئی رائے زنی کرے اُس کو بھی ضرور ہے کہ غور و فکر کے ساتھ رائے قایم کرے اور علم اور تجربہ سے کام لے۔ سفیہانہ اعتراض اور خود غرضانہ رائے زنی کو کام میں نہ لائے۔ ایک چھوٹی سی نظیر اس کی یہ ہے کہ "ہائیڈرو فوبیا"، یعنی دیوانے کتوں کے کاٹے ہوؤں کے علاج کے لئے جو شفاخانہ کھولا گیا ہے اُس پر ہندوستان کے بعض مقامی انجمنوں نے اعتراض کیا اور ایک عرض داشت ولایت سے مسٹر دادابھائی نوروزجی کی طرف سے بھی اخباروں میں شائع ہوئی اور بنائے اعتراض یہ ہے کہ اس علاج میں حیوانات پر بے رحمی کی جاتی ہے۔ میں اس بحث کو طول دینا نہیں چاہتا۔ مگر اس قدر پوچھنا بے موقع نہ ہوگا کہ جو

لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں اُنہوں نے اپنے ملک کے بیلوں اور ٹٹوؤں اور گھوڑوں پر جو خود اُن کے ہی قوم کے لوگ روزانہ ظلم کرتے ہیں اُس کے دفعیہ کی کیا فکر کی ہے اور اُس کے روکنے کی کیا تدبیر سوچی ہے۔ مسٹر دادابھائی نوروزجی کو تو انگلستان کی ایک پارٹی کے ووٹ حاصل کرنے کی ضرورت تھی۔ اگر ہم لوگ یہاں ہندوستان میں کس مُنہ سے یہ اعتراض کر سکتے ہیں جو بالمرہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو اپنی بار کش مویشی پر ظلم کرتے دیکھتے ہیں۔

جدید علوم کی نسبت بھی بعض پُرانے فیشن کے لوگ جو کبھی اپنے گھروں سے باہر نہیں نکلتے ہیں لانسلم کا کلمہ زبان پر لائیں گے۔ مگر ہم کو اُن سے بحث نہیں ہے۔ میں یقین کرتا ہوں کہ اکثر وہ حضرات جن کو اس کانفرنس کے اغراض کی دلچسپی ہے اس امر کو بطور اصول موضوعہ و علوم متعارفہ مان لیں گے کہ اگر ہم مسلمانوں کو اپنی قوم کی اصلاح اپنی دولت کی ترقی بلکہ اپنے نام و نشان کا بقا مدنظر ہے اور ہم اپنے آپ کو صفحہ ہستی سے مثل حرفِ غلط محو کر دینا پسند نہیں کرتے تو ہم کو ضرور ہے کہ ہم یوروپ کی زبانیں سیکھیں اور یوروپ کے علوم حاصل کریں آج کل بغیر علم موجودات عالم کے کوئی کام دنیا کا پورا نہیں ہو سکتا۔ صنعت، حرفت، تجارت، نوکری، طبابت، وکالت، سپہگری کسی فن میں بغیر جدید علوم کی مدد کی ہم ترقی نہیں کر سکتے اور یہ علوم ہم کو بغیر انگریزی کی میانجی گری کے سردست حاصل نہیں ہو سکتے۔ پس ہمارا فرض ہے کہ ہم انگریزی زبان کو اچھی طرح حاصل کریں۔ تاکہ مغربی علوم کے خزانہ کی کنجی ہمارے ہاتھ آئے اس وقت پھر اس بحث کو چھیڑنا کہ موجودہ کالجوں اور یونی ورسٹیوں سے یہ فائدہ ہم کو مل سکتا ہے یا نہیں محض تحصیل حاصل ہے۔ بارہا کانفرنس کے جلسوں میں اور اُس کے باہر بھی اس بحث پر گفتگو ہو چکی ہے اور جو لوگ اس طریقہ تعلیم کے بڑے طرفدار ہیں وہ خود معترف ہیں کہ یونی ورسٹیوں کی مجوزہ تعلیم بہت کچھ اصلاح کے لائق ہے۔ اور اس تعلیم سے اخلاق پر اور نفس انسانی کے اعلیٰ جذبات پر وہ اثر نہیں پڑتا جو عمدہ تعلیم کا جزو اعظم ہے اور نہ خود السنہ و علوم مغربی پر سوائے ایک سطحی اطلاع کے زیادہ عبور حاصل ہوتا ہے۔ الّا ماشاء اللہ۔ موجودہ تعلیم سے اس وقت تک کوئی بڑا عالم یا مدبر یا حکیم مسلمانوں میں پیدا نہیں ہوا اور نہ ہونے کی امید ہے نہ سر سالار جنگ مرحوم اور نہ سر سید احمد خاں منفور اسکولوں کے تعلیم یافتہ تھے۔ کیونکہ اُس تعلیم کا دارمدار امتحانوں پر ہے اور امتحانوں کی بھرمار سے بالاضطرار نہ کہ بالاختیار بہت سے منافذ علمی روشنی کے ہمارے لئے مسدود ہو جایا کرتے ہیں اور ایک بڑا ناقابل برداشت عیب اُس تعلیم میں یہ ہے کہ اپنے مذہبی عقائد و مسائل اور اپنی ملت کی

مقدس تاریخ سے ہمارے نوجوان گویا بالکل اجنبی رہ جاتے ہیں - اگرچہ اسلام میں نہ کلیسہ ہے نہ رہبانیت ہے ، مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ انصافاً اس قسم کی حکومت سے جیسی سلطنت برطانیہ ہے ہم توقع نہیں کر سکتے کہ کسی خاص قوم یا فرقہ کے لئے کسی مذہب یا ملت کو سرکاری طور پر سرکاری مدارس میں جاری کرے - دوسری تعلیمی اصلاحوں کی بھی کوئی قریب توقع نہیں اور اگر لو فرضاً اصلاح کی بھی جائے تو کیا معلوم ہے کہ ہماری مرضی کے موافق ہی ہو گی - ہم اپنی قومی ضرورتیں خود بہتر جانتے ہیں سرکار سے فقط اصلاح مربیانہ اور امداد فیاضانہ ملتی رہے تو کافی ہے نفس انسانی مثل ایک لوح کے ہے پیدایش کے وقت اُس کے دیباچہ پر فقط چند نقوش اُس کی قوم اور اُس کے آباؤ اجداد کے نقش کئے ہوئے موجود ہوتے ہیں - باقی لوح پر آدمی خود اپنے کردار رفتار گفتار کا کارنامہ لکھتا ہے اور اُس لوح میں یہ خاصیت ہے کہ قبیح اعمال سے اُس پر زنگ لگتا اور نیک افعال سے جلا ہوتی ہے اور ہر دھبہ زنگ یا جلا کا مثل طوطیا کے سرایت کرتا ہے اور پھیلتا جاتا ہے اور ہر فعل و ہر عمل حسن ہو یا قبیح اپنی جنس کو قوت بخشتا ہے اور نفس میں اپنے ہم جنس کو استعداد ترقی دیتا ہے - صداقت ، محبت ، صداقت ومحبت کو بڑھاتی ہے اور نیک خوبی کی استعداد کو ترقی دیتی ہے - دروغ گوئی اور بیحیائی - دروغ گوئی اور بیحیائی کو زیادہ کرتی ہے اور زشتی و بدی کی قابلیت کو قوت بخشتی ہے - تعلیم و تربیت کا یہ کام ہے کہ نفس کی اس خاصیت سے فائدہ اُٹھائے اور طفولیت سے انسان میں نیکی اور نیکوئی کی استعداد پیدا کرنے کی کوشش کرے - کیونکہ لوح جب بالکل زنگ آلودہ ہو گی اُس وقت معلم کے بنائے کچھ نہیں بنتی - اسی طرح وہ قوتیں نفس انسانی کی جس کو فہم ادراک سے تعلق ہے وہ بھی محتاج تربیت ہیں - اور اُن میں بھی ترقی و انحطاط مشق و مزاولت سے وابستہ ہے - اور یہی حال اُن ظاہری قوتوں کا ہے جو بدن سے تعلق رکھتی ہیں - پس تعلیم وہی درست ہے جو ان سب قوتوں کو زیر نظر رکھے اور سب کو اعتدال کے ساتھ ترقی دیتی رہے۔

یہ بات حاصل نہیں ہو سکتی الا جبکہ تمام اسباب اُس کے جمع ہوں - تعلیم علم و اخلاق سے آراستہ ہوں صحبت درست ہو - تلامذہ کم سنی سے ہاتھ میں لیے جاویں اور اُستاد اور نگران کار والدین سے زیادہ اُن کے حال پر متوجہ ہوں - اور نہ فقط درس و تدریس کے اوقات میں بلکہ کھیل کود مہلت و فرصت کے زمانہ میں بھی وہی اسباب مہیا کریں جن سے ان تمام اغراض کے حاصل ہونے میں مدد ملے اخلاق درست ہوں - خود شناسی اور خدا شناسی

کا مادہ پیدا ہو۔ اوامر ونواہی عقلی و شرعی کی وقعت دل میں جاگزیں ہو۔ نفس کی سیاست اور نفسانی خواہشوں کی مقاومت کی قوت کو ترقی ہو۔ ہمت زیادہ ہو، حوصلہ بڑھے، تحصیلِ کمال کی طرف طبیعت مائل ہو۔ پلید خیالات، ناپاک افعال، نجس خطرات سے تنفر زیادہ ہو۔

بھلا آپ ہی فرمائیے کہ دس روپیہ کے میاںجی اور بیس روپیہ کے بابو صاحب ان نکتوں کو کیا جانیں۔ اور یہ باتیں کہاں سے لائیں۔

ہمارے لڑکوں کو نہ گھر کی صحبتیں مساعد نہ ہمسایہ معاون۔ نہ مدارس پر اثر نہ مدرس باخبر ہم اگر اپنی تربیت کی فکر آپ ہی نہ کریں تو کام ہمارا کیوں کر بنے اور مقصود ہمارا کیونکر ہاتھ آئے؟

ایک صاحب بآواز بلند فرما رہے ہیں کہ اس عہد میں کسب معیشت بہ طریق مشروع ناممکن ہے۔ اس واسطے متمول لوگوں سے کہو کہ خمس و زکاۃ نکالا کریں تاکہ ہم لوگوں کی پرورش ہو۔

اے بندۂ خدا اگر ہم کسب معیشت نہ کریں گے تو دولت مند کہاں سے پیدا ہوں گے اور رہی سہی دولت کیونکر باقی رہے گی اور اگر دستگیری کی حیا ہم میں نہ رہی تو حمیت قومی کہاں ٹھہر سکتی ہے۔ اور وہ قوم کیونکر زندہ رہ سکتی ہے۔ جس نے حیا و حمیت کو خیرباد کہہ دیا ہو۔ آفرین ہے ہمت مردانہ پر اہل ندوۃ العلماء کے جنہوں نے اسی قسم کے اغراض حاصل کرنے کی کوشش شروع کی ہے۔ اور آفریں ہے ان بزرگوں کی فیاضی پر جنہوں نے دل و جان سے اس کام میں مدد دی ہے۔ ہمارے اغراض ان کے اغراض متحد ہیں اور ہم ان کی کوششوں کے ساتھ پوری ہمدردی کرتے ہیں۔ اگر فرق ہے تو تھوڑا سا فرق ہے۔ دونوں کا ہدف مراد اور منزل مقصود ایک ہی ہے۔ فقط وہ بزرگوار ایک راستہ اختیار کرتے ہیں، ہم دوسرے راستہ سے اسی منزل تک پہنچنا چاہتے ہیں۔ خداوند عالم دونوں کو کامیاب کرے اور دونوں کے مقاصد دلی بر لائے۔ کسی کو کیا معلوم کہ زمانہ کی ضرورتوں کو کون بہتر سمجھتا ہے اور کس کی تدبیر صائب اور مقتضائے وقت کے موافق ہے۔ اگرچہ میں اس کہنے سے باز نہیں رہ سکتا کہ میرا تیس ۳۰ بتیس ۳۲ سال کا ذاتی تجربہ شاہد ہے کہ جس طریقہ کو ان بزرگواروں نے اختیار کیا ہے اس میں کامیابی بہت دشوار ہے اور اس اختلافِ رائے سے قومی کوششوں کا بٹ جاتا اور سعی و کوشش کا منتشر ہو جانا

نہایت لایق افسوس ہے۔

اس سال عیسوی کے اوائل میں مجھے لکھنؤ جانے کا اتفاق ہوا تھا اور وہاں میرے پُرانے لایق و فایق دوست پرنسپل لا مارٹینیر کالج مسٹر سائکس کی عنایت و مہماں نوازی سے کالج کی سیر کا موقع ملا تھا۔ کوٹھی کی وسعت عمارت کی شان و شوکت و مضبوطی استحکام۔ اُس کے کمروں اور دالانوں کی تقسیم، لڑکوں کے رہنے سہنے کا انتظام اُستادوں کی بود و باش کا بندوبست، عملہ و بیوتات۔ باورچی خانہ، حوض، حمام عبادت گاہ، ایک سے ایک اعلیٰ اور عمدہ نظر آئے۔ کالج کا صحن بہت وسیع و پرفضا ہے دونوں جانب کالج کی زمین دور تک چلی گئی ہے۔ جس میں خوبصورت خوبصورت درخت قرینہ سے نصب ہیں۔ ایک طرف پھولوں کا باغ ہے۔ جدھر کالج کی زمین محدود ہے ادھر تیرنے کی مشق کرنے کے لئے ایک چھوٹا سا تالاب بنا ہوا ہے۔ اُس سے ہٹ کر گومتی ندی بہتی ہے۔ القصہ عمارت ایسی وسیع اور باشوکت اور حوالی اس درجہ پرفضا و دلربا ہے کہ خود بخود انسان کا وہاں دل لگے اور جس کسی نے وہاں رہکر تعلیم پائی ہو تمام عمر اپنے مدرسہ کو فخر کے ساتھ یاد کرتا رہے۔

اسی وضع اور اسی نام کا ایک مدرسہ کلکتہ میں اور ایک فرانس میں موجود ہے اور تینوں عمارتوں کا بانی ایک ہی شخص جنرل کلاڈ مارٹینر ہے جس نے نہ فقط اپنے خرچ سے یہ عمارتیں تعمیر کرادیں بلکہ دوام کے لئے اُن کے اخراجات کا بندوبست بذریعہ وقف چھوڑ گیا۔ لا مارٹینر کالج کے ذکر سے میری یہ غرض ہے کہ ہم کو دور جانا ضرور نہیں ہمارے ہمسایہ ہی میں ایک نظیر اس کی موجود ہے کہ ایک ذات واحد کس قدر پایندا اور فائدہ مند خدمت اپنی قوم کی کر سکتا ہے۔ دوسری غرض میری یہ ہے کہ عمارت کی شان و شوکت حوالی مکان کی صفائی اور سُہانا پن جو اس کالج میں دیکھا گیا اور جو اس سے بدرجہا زیادہ اکسفرڈ اور کیمبرج کے کالجوں میں دیکھا گیا ہے۔ بے علت و بے سبب نہیں ہیں۔ ایسی درسگاہوں میں جن کا اثر قوم پر ڈالنا مقصود ہے ایک مادہ مقناطیسی کا ہونا ضرور ہے جو اہل علم اور طالب علم کو اپنی طرف کھینچتا ہے اور اس مادہ کا مقناطیسی کے نسخہ میں حسن مقام اور حسن حوالی اور حسن عمارت جزو اعظم ہے۔ دوسرے ایک بڑا جزو یہ ہے کہ اہل علم اور اہل تہذیب اور اہل مذاق کی صحبت۔ جمع ہوتا کہ وہ مقام خود بخود طلبائے علم کا مرجع

اور تمام عمدہ قومی خدمات کا مرکز بن جائے جس طرح کہ سکندر اعظم کے خلفاء میں سے بطلیموس بادشاہ مصر کی وبانی نے اسکندریہ کی یونیورسٹی کی بنیاد ڈالی اور ایک عظیم کتب خانہ جمع کیا اور سرمایہ فراواں اساتذہ اور تلامذہ کے وظیفہ کے لئے مہیا کر دیا اور اس دارالعلوم کو وہ فروغ دیا کہ زمانہ قدیم میں ایتھنیہ کے انحطاط کے بعد علم و حکمت کا سب سے بڑا اور تمام بر آوردہ مرکز اسکندریہ ہی شمار کیا جاتا تھا۔

صرف و نحو، معنی و بیان و بدیع، شعر و شاعری، فلسفہ، حکمت، ہیئت، وہندسہ وطب، موسیقی ان سب فنون کے پروفیسر و معلم وہاں موجود ہو گئے تھے۔ خصوصاً فلسفہ وطب وریاضیات کو یہاں بے انتہا ترقی ہوئی۔ جالینوس اسی یونیورسٹی کا پروفیسر تھا۔ اقلیدس نے یہیں اپنے مقالات مدون کئے۔ بطلیموس یہاں مدرس رہا اور یہیں کتاب المجسطی تصنیف کی۔ فلسفہ اشراقی نے یہاں نئی رونق پائی۔ اور آخر کو ایک تازہ مذہب فلسفی اسکندریہ کے نام سے مشہور ہو گیا جس کا اثر عرب وایران کے فلسفی افکار پر بہت کچھ اب تک محسوس ہے اُن کے مقالات یہاں تدوین پائے۔ غرض کم وبیش بارہ سو برس تک فیض اس دارالعلوم کا جاری رہا۔

حضرات! ہم رجال و نحن رجال ہم اگر ہمت کریں اور استقلال کے ساتھ اپنے مقاصد کے حصول میں سعی کریں تو کیا ایک ہمارے ہی نامہ اعمال میں صرف ظفر و کامگاری تحریر نہیں ہوا ہے؟ کیا حرماں کے شایاں ایک ہم ہی قرار پائے ہیں؟ بڑی چیز سعی و کوشش ہے سعی و کوشش کے برکات خصوصاً سعی و کوشش
جب خلوص نیت کے ساتھ توام ہو اور اغراض نفسانی اُس میں شامل نہوں حصولِ مطلوب سے بھی قدر و قیمت میں برتر و بالاتر ہے۔ کیونکہ حصول مطلوب کے بعد پھر نفس کو بالطبع سکون ہو جاتا ہے۔ اور انسان کی روحانی ترقی کو سکون سے تنفر ہے۔ اور ہمت اور حوصلہ قناعت کا منافی ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ان کاموں کے لئے مادہ قابل ضرور ہے قابلیت نہ ہو تو کوئی قوم کوئی کام دینی یا دنیوی انجام نہیں دے سکتی ؎

عام ہیں اُس کے تو الطاف شہیدی سب پر — تجھ سے کیا ضد تھی اگر تو کسی قابل ہوتا

حافظ فرماتے ہیں ؎

ہر چہ ہست از قامتِ ناساز و بیدا اندام ماست — ورنہ تشریفِ تو بر بالائے کس کوتاہ نیست

خود ہم میں قابلیت و استعداد درکار ہے، ورنہ فیضانِ الٰہی ایک دریائے ناپیدا کنار ہے۔ جس کے آبِ حیات سے ہر طالب صادق سیراب ہوتا ہے اور کوئی پیاسا محروم نہیں پھرتا۔

افسوس ہے کہ علی گڑھ کالج میں یہ تمام صفات جمع نہیں ہیں۔ ہم کچھ بو باس ان سب کی پائی جاتی ہے۔ نہ کوئی کلاڈ مارٹنر سر سید مرحوم کو ملا کہ قوم کے واسطے اُس کا خزانہ خالی کرا لیتے۔ نہ قوم نے اُن کی ایسی مدد کی کہ وہ اپنے تمام تعلیمی خیالات اور منصوبوں کو پورا کر سکتے مگر اس میں شک نہیں کہ یہ سب منصوبے اُن کے دل میں تھے اور خدا اُن کی مغفرت کرے اور اُن کے اوپر رحمت نازل فرمائے کہ ایک حد تک ان منصوبوں کو اُس جاں نثار قوم نے پورا ہی کر دکھایا۔

مگر مرحوم و مغفور کا حال ہمیشہ اس شعر کے مصداق رہا ؎

ہزاروں حسرتیں ایسی کہ ہر حسرت پہ دم نکلے ٭ بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

آج علی گڑھ جا کر ملاحظہ کیجئے تو اس شعر کا مضمون آپ پر واضح ہو جائے گا۔ علی گڑھ کالج کے دو رُخ ہیں ایک رُخ تو اُس کا کامیابی سے مالامال ہے۔ طلبہ کی فراوانی تعلیم کی خوبی، قومیت کا جوش، اُستادوں کی شفقت، حکام کی ہمدردی، بہی خواہوں کا اجتماع یہ تمام صفتیں موجود ہیں۔ دوسرے رُخ پر نظر ڈالئے تو مسجد ادھوری، میوزیم ناتمام، کسی کی چھت نہیں ہے، کہیں دیوار نہیں اُٹھی، ایک بورڈنگ کا مکان جو وقع الوقتی کے خیال سے بنا تھا اب تک اُسی ابتدائی حالت میں پڑا ہے۔ پروفیسر آرنلڈ کا سا شفیق اور لایق اُستاد جو مدرسہ کی خدمت میں دلدادہ اور پُرجوش تھا ہم سے الگ ہو گیا اور ہمارے پاس اس قدر سرمایہ نہیں ہے کہ ہم سرکار سے پھر اُس کو واپس طلب کریں۔ چھوٹے بچوں کی ابتدائی تعلیم کے لئے اسکول ہاؤس کی تجویز منظور ہو چکی ہے، مگر رقم کہاں کہ مکان بنایا جائے۔ مگر روئے ہم رفتہ جیسا کہ میں اوپر عرض کر چکا ہوں جو کچھ کہ سیّد صاحب چھوڑ گئے ہیں وہ بھی غنیمت اور بسا غنیمت ہے۔ اور کسی مدرسہ اور کالج میں نہ تو یہ طرز تعلیم ہے نہ یہ صحبت ہے، نہ اساتذہ و تلامذہ میں اس قدر ہمدردی و اختلاط ہے، نہ کہیں انگریزی کی تعلیم عمدگی کے ساتھ مذہبی ارکان پر اس قدر زور دیا جاتا ہے۔

اگرچہ کالج کی عمر ابھی بہت کم ہے۔ گویا زمانۂ طفولیت ہی سمجھنا چاہئے۔ مگر اس تھوڑی

عمر میں دو سخت اور ناگہانی مصیبتیں اُٹھا چکا ہے۔ اول تو سیّد صاحب کی وفات اور اُن کے بعد کی نزاعیں اور اُس کی تھوڑی ہی مہلت کے اندر مسٹر بیک کا انتقال۔ مسٹر بیک جن کی ہمدردی و جانفشانی نے سید صاحب کو بھی بُھلا دیا تھا اور جس نے سارا کاربار کالج کے انتظام کا جسے سید صاحب لاوارث چھوڑ گئے تھے اپنے سر پر اُٹھا لیا تھا وہ مسٹر بیک جو اپنی قلیل آمدنی میں سے اس اسلامی کالج کی برابر مدد کرتے رہے اور جنھوں نے ایک اسلامی کالج اور مسلمانوں کی قومی مصالح کی کمک و اعانت میں بے انتہا محنت و شفقت برداشت کر کے اپنی جان عزیز تلف کر دی۔

مگر الحمد للہ کہ ان مصیبتوں کے وقت سید صاحب کے ایک قدیم دوست اور قوم کے جیّد خیر خواہ نواب محسن الملک بہادر نے یہ بار اُٹھانا قبول کیا اور بڑی طوفانی دریا سے کالج کا بیڑہ پار لگا دیا۔ اور کالج کے انتظام میں کیا مالی اور کیا تعلیمی بے انتہا ترقی کر کے دکھا دیا کہ اب بھی ہم مسلمانوں میں ایسے لوگ موجود ہیں جو سید صاحب کے کام اور سید صاحب کے نام کو رکھنے کی لیاقت و قدرت رکھتے ہیں۔

مگر نواب محسن الملک بہادر جن کی دوستی کا فخر مجھ کو بھی حاصل ہے مجھے معاف فرماوینگے اگر میں یہ عرض کروں کہ اُن کی تدبیریں اور کوششیں بھی بے سود ہوتیں۔ اگر ماریسن صاحب نے کالج سے علٰحدہ ہونے کا ارادہ فسخ نہ کیا ہوتا۔ اور اپنا استعفا واپس نہ لیا ہوتا۔ حق یہ ہے کہ کالج کی موجودہ کامیابی میں دونوں صاحبوں کا حصہ مساوی ہے۔ اور ہم پر اور ہماری قوم پر دونوں صاحبوں کا احسان برابر ہے۔

یہاں پر بے موقع نہ ہو گا کہ میں ایک مختصر سرگذشت کالج کی جو حیات سید صاحب مرحوم کی وفات کے زمانہ سے اس وقت تک کے حالات پر مشتمل ہو آپ کی خدمت میں عرض کروں تاکہ آپ کو موجودہ حالت پر اس مدرسہ کی کماحقہٗ آگاہی حاصل ہو۔ اور آپ ہماری ضرورتوں کا پورا موازنہ کر سکیں اور خود بھی کمک و اعانت میں دریغ نہ کریں اور قوم اور دولتمندانِ قوم سے ہماری پُرزور و پُرتاثیر سفارش کر سکیں۔

ابتدائی کیفیت سے اس مدرسہ کی آپ سب حضرات آگاہ ہیں۔ آپ سب صاحب جانتے ہیں کہ سید صاحب مرحوم اور اُن کے اعوان و انصار نے کس قدر محنت، کس قدر جانکاہی سے اس مدرسہ کی بنا ڈالی اور اس مدرسہ کے ذریعہ سے مسلمانوں کی حالت کی

اصلاح میں کوشش شروع کی۔

جب سے یہ مدرسہ قایم ہوا ہے ۱۸۹۵ء میں طلبا کی تعداد سب سے زیادہ تھی یعنی ۳۵۰ بورڈر یعنی مقیم طلبا اور ۲۳۰ ڈے اسکالر یعنی باہر کے جملہ ۵۸۰ طلبہ تھے منجملہ ان کے ۷۵ اکالج میں اور ۴۰۰ اسکول میں تھے۔ ۱۸۹۸ء میں سید صاحب کی وفات کے وقت صرف ۲۲۹ بورڈر اور ۹۴ ڈے اسکالر کل ۳۲۳ رہ گئے تھے۔ مگر ۱۸۹۹ء میں پھر ترقی پا کر تعداد بورڈروں کی ۳۹۴ تک پہنچی اور ڈے اسکالروں کی ۹۸ تک جملہ ۴۹۲ جن میں ۱۸۰ کالج میں شریک ہیں اور ۳۱۲ اسکول کلاسوں میں تعلیم پاتے ہیں اور لا کلاسوں میں ۳۲ طالب علم ہیں۔ اس طرح کل تعداد نومبر دسمبر ۱۹۰۱ء کو ۵۲۴ تھی۔ اگرچہ کل تعداد اب بھی ۱۸۹۵ء سے کم ہے۔ مگر بورڈروں کی تعداد بہت بڑھ گئی ہے۔ یہاں تک کہ بافسوس بیان کیا جاتا ہے کہ بوجہ عدم گنجائش بود و باش نئی درخواستیں بہ مجبوری نامنظور کی جاتی ہیں۔

کالج کی مالی حالت بھی کسی قدر جناب سرسید صاحب کی وفات کے وقت خطرناک تھی، قریب لاکھ روپیہ کے قرض کا بار تھا جس میں سے نقد رقم قرضخواہوں کو دینے کی پچاس ہزار سے زیادہ تھی۔ سید صاحب مغفور کے بعد اُن کی یادگار قایم کرنے کے لئے چندہ کھولا گیا جس کی آمدنی میں سے یہ رقم ادا کر دی گئی اور اب ستر ہزار اس فنڈ کے نقد موجود ہیں علاوہ ان کے چودہ ہزار کالج اسٹاف کی تنخواہوں وغیرہ کے لئے بطور رزرو فنڈ یعنی سرمایہ متحفظ جمع ہیں۔

حضرات! مدرسۃ العلوم علی گڑھ کی یہ کیفیت ہے جو اس وقت بالاجمال بیان کی گئی میں نے اپنی فہم ناقص میں اور اپنے ذاتی تجربوں کے موافق ایک اندازہ قوم کی تعلیمی ضرورتوں کا بھی آپ کی خدمت میں عرض کر دیا اگر آپ کی رائے صائب میں یہ ضرورتیں مسلم ہیں اگر آپ بھی قبول فرماتے ہیں کہ ہم مسلمانوں پر فرض عین اور عین فرض ہے کہ ہم اپنی اولاد میں زمانہ کے گونا گوں حوادثات اور وقت کی بوقلموں نیرنگیوں کی برداشت کی قوت پیدا کریں۔ اگر آپ بھی اس ناچیز کے ساتھ اتفاق کرتے ہیں کہ میدان سعی میں پس پا ہونا نامردی اور فقط نفسانی تعصبات کی بنا پر ممکن الحصول برکتوں سے اپنے آپ کو محروم رکھنا جہالت اور اپنی افزایش دولت و علم و ثروت و جاہ میں جان نہ لڑانا حماقت اور دست نگری اور دریوزہ گری پر قناعت کرنا بے حیائی ہے تو یقیناً آپ اس امر کو بھی تسلیم فرماویں گے کہ مدرسۃ العلوم علی گڑھ کی پوری اعانت کرنا اور اُس کے حدود و نفع رسانی کو وسعت دینا ہم مسلمانوں پر فرض ہے۔

اگر اس فرض کو اب بھی کوئی نہیں مانتا ہے اور اگر اب بھی کوئی اس مدرسہ کی فائدہ مندی میں شک کرتا ہے۔ اگر اب بھی کوئی علوم جدید سے بے بہرہ رہنا اور اپنی پُرانی لکیر پر چلے چلنا قوم کی بہتری کے لئے کافی سمجھتا ہے تو اُس سے کہئے کہ جاکر اُن اسلامی سلطنتوں کو دیکھ لے جو اس وقت ان ہی خام خیالیوں میں مبتلا ہیں۔ الجزائر کو دیکھئے جہاں سے حرکت کرکے طارق اور موسیٰ بن نصیر نے اندلس کو فتح کیا تھا۔ ٹونس کو دیکھئے جو ایک وقت میں مسلمانوں کی حکومت کا بڑا رکن رکین تھا اور جہاں کا جہاز راں دنیا میں مشہور تھا۔ مراکش کا حال پوچھئے جس کی یوسف بن تاشقین نے بنا ڈالی جو مرابطہ کا پہلا بادشاہ تھا اور جس کو سلطان ابو یوسف عبدالمومن کے پوتے نے تمام کیا اور شمالی افریقہ کا پایہ تخت قرار دیا۔ اب تمام الجزائر فرانس کے قبضہ میں ہے ٹونس پر بھی نیم قبضہ فرانس کا ہے اور قریب ہے کہ مراکش کا انجام بھی وہی ہو اگرچہ اُس پر اہل اسپین کو بھی بہت کچھ دعوے ہے۔ وہی اسپین۔ یا اندلس جس کو اسی ملک کے مسلمانوں نے ایک وقت فتح کیا تھا۔ مصر سے اس وقت تک ترکوں کی حکومت نکال دی گئی ہوتی اور طائفۃ الملوکی کی نوبت آگئی ہوتی اور تمام دولت برباد ہو گئی ہوتی اگر ہماری سرکار نے وہاں کا انتظام اپنے ہاتھ میں نہ لے لیا ہوتا۔ ایران کی حالت ناگفتہ بہ ہے۔ انھیں پُرانے خیالات اور تعصبات سے وہاں کی ترقی رُکی ہوئی اور سارے اُمور کا دارمدار یورپ کی قوتوں پر ہے۔

خود ایران کی حیثیت اس زمانہ میں ہندوستانی ریاستوں سے کچھ زیادہ نہیں ہے بلکہ ہندوستانی ریاستیں زیادہ امن وامان کے ساتھ فرائض ادا کر رہی ہیں اور کم وبیش ترقی کرتی جاتی ہیں۔ اس لئے حضرات آپ سے پھر عرض کرتا ہوں اور جب تک ممکن ہوگا عرض کرنے سے باز نہ رہوں گا کہ وقت ہاتھ سے نکلا جاتا ہے۔ حالت قوم کی روز بروز بدتر ہوتی جاتی ہے اب بھی کچھ نہیں گیا ہے۔ ہمت مردانہ کیجئے اور قوم کا بیڑا پار لگا دیجئے۔ اس وقت دل وجان سے اعانت کیجئے گا تو بہت مشکلیں آسان ہو جائیں گی۔ اور قوم کی اعانت اس وقت یہی ہے کہ اُس کی افراد کی تعلیمی حالت درست کیجئے اور علوم جدید کی برکتوں سے اُن کو بہرہ مند فرمائیے۔ قوم اور بزرگان قوم سے ہم جس اعانت کے خواستگار ہیں اُس کے دو درجے ہیں اور یہ درجے بمنزلہ دو زینوں کے ہیں جن سے ہم قوم کو ضعف و اضمحلال کی پستی سے قوت کی بلندی پر پہنچانے کی امید کرتے ہیں۔

ہم قوم سے اُمیدوار ہیں کہ اول تو مدرستہ العلوم کے دوام کی فکر کرے تاکہ اُس کی بنیاد مستحکم ہو جائے اور حوادث زمانہ سے بقدر طاقت بشری مامون و محفوظ کر دیا جائے اور اس کے بعد اس قدر اور ہمت کرے کہ اسی مدرسہ کو وسعت دے کر قریب زمانہ میں ہم ایک یونیورسٹی (جس کو عرب آج کل مدرسہ کلیہ کہتے ہیں) مسلمانوں کے لئے قایم کر سکیں جس میں مثل قدیم مدارس کلیہ قرطبہ و بغداد و سمرقند کے اگر تمام اسلامی بلاد دنیا سے نہیں تو خیر تمام ہندوستان کے اقطاع وصوبہ جات سے آن کر طلبہ تحصیل علم کر سکیں اور جو رفتہ رفتہ ہند کی اسلامی دنیا کے علمی و اخلاقی جذبات و خیالات کا ایک مرکز عظیم بن جائے۔ کیا عجب ہے کہ پھر اس مدرسہ کی بدولت ہمارے یہاں ایک نیا ابن رشد یا بوعلی سینا پیدا ہو جو فلسفہ جدیدہ کے شکوک کو حل کرتا رہے۔ نئے متکلمین نئے قسم کی استدلال سے زمانہ حال کے الحاد کو ساکت کریں۔ ہماری طب میں نئی طبعیات و علم حیات و علم کیمیا و نباتات کی مدد سے ایک نیا ابو ذکریا ئے رازی یا نیا ابن زہری نئی تحقیقاتیں کرے نئے نئے علاج نکالے۔ ایک نیا ابن موسیٰ نئے نئے پھل پیدا کرے۔ نئے نئے آلات اختراع کرے۔ ایک نیا ابن طوسی نئے نئے سیارے اور نادیدہ اقمار ہم کو دکھائے اور اُن کی گردش کی حدود بتائے کیا میں جو عرض کر رہا ہوں اُس کو کوئی خیال خام کہہ سکتا ہے ؟ آپ ابھی سن چکے ہیں کہ تعصب و جہالت و نا عاقبت اندیشی کی بدولت مغرب اقصیٰ، شمالی افریقہ کی اسلامی حکومتوں کی کیا حالت ہو رہی ہے۔ مگر اب اس کے برعکس جاپان کی تاریخ ملاحظہ فرمائیے۔ جاپان نے ان تعصبات اور از کار رفتہ خیالات کو ترک کرنے کی بدولت ۲۰ برس کے عرصہ میں کیا ترقی نہیں کی ؟ جو قوم کہ نزدیک زمانہ میں مغربی علوم اور مغربی اقوام سے بالکل متنفر تھی اور یوروپ کی سر بر آوردہ اقوام کے آگے کسی شمار و قطار میں نہ تھی۔ اب جدید علوم اور جدید خیالات سے فائدہ اُٹھا کر مغربی سلطنتوں کی ہمسری کا دعوے کر سکتی ہے، اور قوت میں مغربی سلطنتوں کے ہم پلہ شمار کی جا سکتی ہے۔ اُن کی تجارت اُن کی صناعی، اُن کی علمی تمدنی ترقی کسی سے کم نہیں ہے۔ روز بروز ملک و قوم کی وقعت و عزت میں زیادتی ہوتی جاتی ہے۔ علوم جدیدہ اُن کے ہاں علی العموم رائج ہیں اور اُن سے کام لیا جاتا ہے۔ تعلیم ہر طرف شائع ہے۔ یوروپ کی جدید صنعت و حرفت کی ہر شاخ سے فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ اور اُسے اپنے مصرف میں لاتے ہیں وہ ڈاکٹر جاپانی ایسے اپنے فن میں مخترع اور مجتہد اب موجود ہیں جن کا نام یوروپ

میں مشہور ہے اس نظیر سے صاف ظاہر ہے کہ ہم کو کبھی اپنی ترقی سے مایوس نہ ہونا چاہئے ایسی مایوسی گویا خداوند عالم کے رحم و کرم سے مایوسی ہے اور وہ فقط ناشکری ہی نہیں بلکہ نافرمانی بھی ہے۔

یونیورسٹی کے لئے دو چیزیں لابُدی ہیں۔ اول تو مکانات کی توسیع ضروری ہی دوسرے نفس تعلیم کے حدود کو بھی وسیع کرنا چاہئے۔ اس وقت علی گڑھ کالج میں منجملہ علوم نظری کے فقط فلسفہ و ریاضیات بڑے امتحانوں کے لئے کافی سمجھا گیا ہے یہ بجائے خود ایک بڑا نقص ہے اور جب یونی ورسٹی قایم کرنے کا خیال کیا جائے تو اُس وقت اور بھی زیادہ ضرور ہوگا کہ مختلف علوم کے درس کا سامان مہیا کیا جائے اور ہر علم کے لئے اُس کا ایسا ماہر مدرس مقرر ہو جس کے نام سے شائقین علم اُس کے درس میں شریک ہونے کی آرزو کریں۔

تیسری ایک جماعت ٹیوٹر لوگوں کی ضرور ہے جو مثل اکسفورڈ یا کیمبرج کے طلبہ کے خانگی معلم و دوست ناصح کا کام دیں۔ ہر ایک فن کے واسطے ایک علیحدہ ٹیوٹر ضرور ہے۔

چوتھے آلات و ادارات علمیہ کا مہیا کرنا لازم ہے جس کے حدود میں کتب خانہ بھی شامل ہی ابتدا میں شاید سوائے علی گڑھ کالج کے کوئی دوسرا کالج اس یونی ورسٹی سے متعلق نہو مگر تجویز کی کامیابی پر یقین ہے کہ تعداد کالجوں کی بڑھتی جاوے گی۔ کیونکہ اس قسم کی تعلیم سے ہر صاحب عقل اپنی اولاد کو متمتع کرنا چاہے گا۔ علاوہ بریں ایک کالج کا ترقی کرکے یونیورسٹی بننا کوئی نئی بات نہیں ہے۔ اس کی مثالیں تاریخ میں موجود ہیں دور جانا کیا ضرور ہے خود ڈبلن یونیورسٹی جس میں میرے دوست مرحوم مولوی میر اولاد حسین ایک عمر تک مشرقی زبانو کے پروفیسر رہے اُس کی بنیاد فقط ایک کالج ہے۔

یوروپ میں اس کی اور بھی نظیریں موجود ہیں۔ اصل یہ ہے کہ جب اس قسم کا کوئی درسگاہ ترقی کرتا ہے تو ایک حد سے گزرنے کے بعد خود بخود یونیورسٹی کی حیثیت پیدا کرتا ہے اور اس قدر ترقی کے اسباب مہیّا کرنا بالکل قوم کے ہاتھ میں ہے۔ اگر ہم ایسی ترقی کر دکھائیں تو ہرگز ہماری فیاض سرکار ہم کو سندِ یونیورسٹی عنایت کرنے میں دریغ نہ کرے گی۔ اب آپ خود خیال فرما سکتے ہیں کہ اس سب سامان مہیا کرنے کے لئے کس قدر زر کثیر درکار ہے۔

مگر میں ایک دوسرے جلسہ میں اس کانفرنس کے جس کی میرمجلسی کی عزت مجھے دی گئی تھی عرض کرچکا ہوں کہ قوم کے نزدیک یہ کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ اگر قوم چاہے تو ایک ہی وہلہ میں اس قدر سرمایہ جمع کردے کہ دوام کے لئے یونیورسٹی کا خرچ نکل آوے۔ فقط ایک زبردست محرک درکار ہے جو قوم کو اس طرف متوجہ کرے اور اُس سے کام لے۔ بعض قوم کے بزرگواروں نے جو ہماری کوششوں کو بنظر رضا و عنایت ملاحظہ فرماتے ہیں اور ہمارے ساتھ پوری ہمدردی کرتے ہیں اور ہماری تعلیمی ضرورتوں کو تسلیم کرتے ہیں، اور جن کی رائے میرے نزدیک نہایت درجہ وقعت اور تعلیم کے شایاں ہے اس تجویز پر نکتہ چینی کی ہے کہ کسی خاص مذہب کی قید کے ساتھ کوئی یونیورسٹی قایم ہونا مفید ہوگا۔ یونی ورسٹی کا دائرۂ افادہ وسیع ہونا چاہیئے۔ کسی مذہب و ملت کی خصوصیت نہ ہونی چاہیئے۔ ورنہ خیالات محدود اور تعصّبات غالب ہو جائیں گے جن سے بچنا ترقی علم کے لئے لازمی اور لابُدی ہے میں اس اعتراض کو اس حد تک تسلیم کرتا ہوں۔

سیّد صاحب مرحوم نے اس لئے علی گڑھ کالج کا دروازہ ہر ملت و مذہب کے لئے کشادہ رکھا تھا اور اب بھی کشادہ ہے۔ اور کوئی وجہ نہیں ہے کہ آیندہ کشادہ نہ رہے۔

میری ذاتی رائے ہمیشہ سے یہ ہے کہ ہندوستان کے لوگ جو ایک ملک کے رہنے والے ہیں ایک بادشاہ کی رعیت ایک قانون کے پابند ہیں۔ اُن میں اتحاد۔ اتفاق۔ اور برادرانہ برتاؤ زیادہ ہونا چاہیئے۔ گو ملت و مذہب علیحدہ ہو۔ نظر حقیقت بیں کے آگے ہندو۔ مسلمان۔ یہودی۔ عیسائی۔ سب راہِ حق کے تلاشی ہیں۔ فقط عقائد اور طرق مختلف ہیں۔ دیکھئے قرطبہ کی یونیورسٹی میں نصرانی طالبِ علم کس قدر موجود رہتے تھے پس اگر ہماری یونیورسٹی کا دروازہ بھی ہر ملت و مذہب کے واسطے کشادہ رہے تو میری رائے میں کوئی قباحت نہیں ہے بلکہ ایک توسع ہے۔ خود مسلمان طلبہ کے حق میں مفید ہوگا کیونکہ انصافاً ہمارے ہندو بھائی محنت و مشقت میں اور طالب علمی کی نفس کشی میں ہم سے بہت پیش قدم ہیں اور ہم کو اُن کی صحبت سے غبطہ کا فائدہ پہنچ سکتا ہے فقط وقت اس قدر ہے کہ ہم اپنے کالج اور یونی ورسٹی میں یہ خصوصیت پیدا کرنا چاہتے ہیں کہ طلبا دن رات اُس میں مقیم رہیں اور اُن کی روزانہ زندگی پر اساتذہ کی صحبت اور باہمی معاشرت کا اثر

پڑتا رہے۔ اور اس میں ہمارے ہندو بھائی شریک نہیں ہو سکتے اور تجربہ سے ثابت ہو گیا ہے
کہ خارجی طلبہ کا اثر رزڈنٹ یعنی مقیم طلبہ پر بُرا پڑتا ہے اس ایک قباحت کے علاوہ اور کوئی
خیال مانع نہیں ہے۔ اور اگر اسی پر کامیابی یونی ورسٹی منحصر ہے تو یقیناً ہماری تجویز کے اعوان
و انصار اُس کے قبول کرنے میں ذرا بھی تامل نہ کریں گے باقی رہی ہماری مذہبی تعلیم جس کو ہم
کسی عنوان چھوڑ نہیں سکتے، اس کا بندوبست مسلمانوں کے واسطے جیسا کہ اب کیا جاتا ہے
سب کچھ اضافہ کے ساتھ اُس وقت کیا جائے گا اور دینیات مثل کلام و تفسیر و حدیث و فقہ
و اصول وغیرہ کے لئے ایک فیکلٹی علیحدہ ہو گی جس سے مسلمان ہی فائدہ اُٹھائیں گے۔ اُس میں
غیر مذہب والا طالب علم کوئی کاہے کو شریک ہو گا۔ البتہ اس فیکلٹی کے اغراض حاصل کرنے
کے لئے ہم کو لازم ہو گا کہ ہم ضرورت کے موافق پروفیسر اور معاون تعداد مناسب میں مقرر
کریں اور اس شاخ کے لئے بھی مثل دوسری شاخوں کے وظائف ترغیبی یا فیلوشپ
یا دونوں تجویز کریں۔ بغیر اس شاخ کے پورے طور پر قایم ہوئے مسلمانوں کو ہرگز تشفی
نہ ہو گی اور نہ یونیورسٹی کا اثر پورا مسلمانوں پر پڑے گا۔ مختصر ہم یونیورسٹی سے اپنی
نہایت مہتم بالشان غرضیں پوری کرانا چاہتے ہیں۔ اول تو یہ ہے کہ کوئی مسلمان لڑکا اپنے
مذہبی عقائد و مسائل سے ناواقف نہ رہے اور اپنے بزرگان دین کی تہذیب و اخلاق سے
عاری نہ ہو۔ اور اُس کے ساتھ ہی مغربی علوم پر جامعیت کے ساتھ عبور حاصل کرے۔ او
مغربی خیالات سے پورے طور پر متمتع ہو۔ دوسری غرض یہ ہے کہ ہماری یونی ورسٹی ایک ا
مرکز علوم و فنون بن جائے کہ اُس کا اثر صالح تمام ہندوستان کے مسلمانوں پر پڑتا رہے ا
اُن کے خیالات کی اُن کے طرز معیشت کی اور سب سے زیادہ اُن کے لٹریچر کی اصلاح کرے
آپ بے خبر نہیں ہیں کہ علی گڑھ نے اور تہذیب الاخلاق نے تھوڑے ہی عرصہ میں ہمارے
لٹریچر پر کیا اثر ڈالا تھا۔ میں بلا مبالغہ کہہ سکتا ہوں کہ جتنی اُردو زبان کی کتابیں اس بیس پچیس
سال کے عرصہ میں تصنیف ہوئی ہیں اُن میں سے وہی قابل اعتبار نکلیں گی جن پر علی گڑھ
طریقہ تحریر کا اثر پڑا ہے۔ ورنہ بہت سی ناولیں اور بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں جن میں
اکثر یا تو مادہ سے خالی ہیں یا اُس بیہودہ اور غیر مہذب رنگ میں رنگی ہوئی ہیں جس کی ہما
پبلک بعض خاص خاص سوسائٹیوں کے پلید اور چرک آلود اثر سے عادی ہو رہی تھی۔ عا
کے لئے اشارہ کافی ہے۔ اگر فسانہ عجائب سے لے کر اس وقت تک کی اُن ناولوں تک جو

مصنفین کے نزدیک بہت مہذب طور پر لکھی گئی ہیں غور سے نظر ڈالی جائے اور خاص کر اس نکتہ کی طرف توجہ کی جائے کہ اُن میں عورتوں کے ساتھ کس قسم کا برتاؤ کیا گیا ہے تو آپ پر حقیقت کھل جائے گی اور معلوم ہو جائے گا کہ اُن میں یورپ کے بدترین اور ذلیل ترین ناولوں کی تقلید کی گئی ہے جن کو کوئی صاحب ذوق سلیم کبھی ہاتھ بھی نہیں لگاتا۔ اور اُس کا نام تہذیب رکھا گیا ہے باقی باتیں وہی قایم ہیں جو پچھلے وقتوں سے وراثتاً اُن کو ملی ہیں۔ ہم کو پورا یقین ہے اگر یونی ورسٹی قایم ہو گئی تو بہت جلد یہ دھبہ ہمارے لٹریچر سے مٹ جاوے گا اور قابل قدر کتابوں کی تعداد بڑھتی جائے گی۔ اور مصنفین کے تفکرات و تخیلات میں اصلاح ہو جاوے گی۔

ہم کو جس امر پر سب سے زیادہ اصرار ہے وہ یہ ہے کہ کسی طرح ہماری اولاد زمانہ تعلیم میں ان پلید صحبتوں سے بچے جو ہمارے موجودہ طریقہ کا لازمہ ہے۔ کوئی کم گھر ایسا ہوگا جہاں لڑکے کم سنی کے زمانہ میں لونڈی باندیوں کی صحبت نوکر چاکروں کے اختلاط ہمسایہ اور محلہ کے رذیل اور آوارہ ہم عمروں کی یک جائی مکان اور حوالی مکان کی گندگی سے محفوظ رہ سکے ہوں۔ کیا آپ ایک لحظہ کے لئے بھی خیال کر سکتے ہیں کہ ان سب مراتب کا اثر طبیعت اور اخلاق پر نہیں پڑتا کیا آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اس زمانہ کی کان میں پڑی ہوئی یا آنکھوں دیکھی ہوئی باتیں کبھی فراموش ہوئی ہیں۔ اور ان کا اندیشہ ناک اثر اُس عمر کی سریع الانفعال طبائع پر نقش کالحجر نہیں ہوتا۔ اور اُن کی تاثیر سے خیالات ناپاک اور معاشرت گندہ اور چرک نہیں ہوئے۔

دودھ اور خربزہ کو اطبا سریع الاستحالہ کہتے ہیں۔ یعنی بہت جلد خلط غالب کی طرف مستحیل ہو جاتا ہے۔

وہی حالت بچوں کی ہے۔ جو رنگ غالب ہو اُس میں مل جاتے ہیں اور پھر تمام عمر وہ رنگ نہ دھوئے دھلتا ہے نہ چھڑائے چھٹتا ہے۔ اگرچہ از روئے عقل سلیم و از روئے شرع شریف والدین ذمہ دار ہیں مگر انصافاً و ایماناً فرمائیے کہ کتنے صاحب اولاد ہم میں ایسے ہیں جو اس ذمہ داری کے واجبی وقعت اور درست اندازہ کرتے ہوں۔ ہمارے یہاں اولاد کی حد بلوغ تک سب سے زیادہ ذمہ داری والدین کے نزدیک یہ گنی جاتی ہے کہ چھٹی، چھلہ۔ بسم اللہ۔ ختنہ۔ منگنی۔ شادی۔ دھوم دھام سے ہو۔ اور اُس میں زر کثیر صرف کیا جائے۔ آپ کو

شاید تعجب ہوگا کہ بعض شہروں میں کلمہ کارِ خیر کا مدلول عوام و خواص محاورہ میں لڑکیوں کی شادی قرار پاگیا ہے۔ جب کوئی کارِ خیر کا ذکر کرتا ہے تو سامع کسی کی لڑکی ہی کی شادی سے اُس کو تعبیر دیتا ہے۔ تعلیم کی ذمہ داری بہت ہی سرسری خیال کی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ عام طور پر متمول لوگوں کو بھی اُستاد کی تنخواہ یا مدرسہ کی فیس ادا کرنے میں لیت و لعل ہوا کرتا ہے۔ بعض امیروں کا میں نام لے سکتا ہوں جن سے مدرسہ کی فیس تو درکنار بورڈنگ کا خرچ وصول ہونے میں دقت ہوتی ہے کہنے میں ایسے ہیں جو اپنی اولاد کے ناشائستہ کرداروں سے دیدہ و دانستہ اغماض کرتے ہیں۔ اور جو صاحبِ اولاد اپنی ذمہ داری کو سمجھتے بھی ہیں تو اُس سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش کرنے میں اُن کو بھی دنیا کے مشاغل اور تحصیل معاش کے جھگڑے کب فرصت دیتے ہیں کہ وہ اس طرف دل سے متوجہ ہوں اور معتد بہ وقت اپنا اس کام میں صرف کریں۔ غرض صاف صاف یہ ہے کہ اس زمانہ میں کسی مسلمان کو منظور ہو کہ اپنی اولاد کو زیورِ علم و اخلاق سے مزین کرے تو اُس کو ضرور ہے کہ وہ اُسی علی گڑھ جیسے تعلیم گاہ میں کم سنی کے زمانہ سے داخل کر دے۔ اور اُن کے اخراجات کا جو مقابلہ فوائد بہت ہی کم ہیں متکفل رہے بلکہ میں ایماناً کہہ سکتا ہوں کہ ہر دولتمند مسلمان پر فرض ہے کہ ایک یا دو یا زیادہ غریب مسلمانوں کی تعلیم کے واسطے بھی اسی مدرسۃ العلوم میں وظائف مقرر کر دے خداوند عالم ضرور اس کارِ خیر کی برکت اُس کی اولاد کے آگے لائے گا۔ اور اس نیکی کی جزا اُس کو دنیا و عاقبت میں عطا فرمائے گا۔

میرے نزدیک ہم مسلمانوں میں کوئی گروہ اس قدر تعظیم و تکریم کا مستحق نہیں جس قدر علما کا گروہ ہے۔ جو اپنے علم و فضل و تقوے کی برکتوں سے ہم اہلِ دنیا کو مستفیض کرتے ہیں اور دینِ اسلام کو ہمارے لئے زندہ رکھتے ہیں۔ خدا اُن کو زندہ رکھے۔ اور اُن کی برکتوں سے ہمیشہ ہم کو مستفیض کرے۔ مگر جنابِ من ہر شخص فقیہ و محدث نہیں ہو سکتا اور نہ ہر شخص صلاحیت فقاہیت و اجتہاد و ارشاد کی رکھتا ہے۔ دین کا استحکام اصلاحِ معاش کے ساتھ وابستہ ہے۔ کوئی قوم جو اپنی دنیا کی اصلاح سے کنارہ کرے اور افزونی معاش کی تدابیر سے دست کش ہو اُس کے دین میں بھی بہت جلد رخنہ پڑ جائے گا۔ اور دین و دنیا دونوں ہاتھ سے جاتے رہیں گے۔ ہر مسلمان پر فرض ہے کہ وہ اپنے عقائد درست رکھے۔ اور اوامر و نواہی پر مطلع ہو۔ اور اپنے مذہب کی عبادات اور معاملات کے ضروری مسائل سے آگاہ ہو۔ باقی اُمور

گروہ علماء پر محول ہیں۔ ہم دنیا داروں کو وقتاً فوقتاً اُن سے ہدایت مل سکتی ہے آپ یاد رکھئے کہ ہم مسلمان کبھی اپنی دینی دولت کو تلف نہ ہونے دیں گے۔ اس کے لئے نہ ہم کو ترغیب کی ضرورت ہے نہ انجمنوں کی حاجت ہے۔ اسلام کو اگر خوف ہے تو زیادہ تر اس کا خوف ہے کہ ہم خوابِ غفلت میں مبتلا رہیں اور دنیوی برکات زمانہ کے ہمارے ہاتھ سے نکل جائیں۔ اور ہم اپنی کاہلی اور ناجواں مردی سے منہ دیکھتے رہ جائیں، اور حق تو یہ ہے کہ ہم اپنی نافہمی سے دنیا کو ترک کیا چاہیں تو دنیا ہم کو کب ترک کرتی ہے۔ اور جب دنیا ہم کو ترک نہیں کرتی تو ہم کیوں اپنے دنیوی مصالح میں علم و دانش سے مدد نہ لیں۔ اور کیوں ایسے ضروری کاموں میں اپنی ساری توتیں صرف نہ کریں اور جاہلانہ طور پر دنیا داری کرنے کے عوض میں ہم کیوں نہ عاقلانہ طریقہ اختیار کریں۔

حضرات! ہم مسلمانوں میں آجکل ایک نیا مرض شائع ہو گیا ہے جس کو اسلاف پرستی کہتے ہیں۔ اکثر انگریزی داں نوجوان ہمارے خصوصاً علی گڑھ کے طلبا اس میں بکثرت مبتلا ہیں۔ اور اس مرض کی اشاعت کے بانی اول دو چار یوروپین مورخ ہیں۔ مگر زیادہ تر بعض ہمارے ہی گروہ کے بزرگوار ہیں۔ نام لیتے ہوئے میں ڈرتا ہوں۔ مگر خیر مجمع بہت بڑا ہے عجب نہیں کہ میرے بھی حامی و مددگار یہاں بہت نکل آئیں

حضرات! بڑے بڈھے اُن میں کے نواب محسن الملک بہادر ہیں اور دوسرے شبلی نعمانی ہیں۔ میرے قدیم کرم فرما مولانا حافظ نذیر احمد صاحب بھی اگرچہ کبھی کبھی اس کوچہ میں بہک نکلتے ہیں۔ مگر وہ وقت پر نہیں چوکتے۔ کڑوی بات بے دھڑک کہہ جاتے ہیں جو تریاق کا حکم رکھتی ہے۔ اِن حضرات نے او دھم مچا دی ہے آفت برپا کر دی ہے، کوئی مسلمانوں کی علمی دولت کو شمار کرتا ہے، کوئی تمدنی خوبیاں گنتا ہے، کوئی ہمارے مدارس و یونیورسٹیوں کی فہرست تیار کرتا ہے، کوئی ہماری یونانی کتابوں کے ترجموں کا حساب دیتا ہے، کوئی اندلس کی حکومت کا زور دکھاتا ہے، کوئی ہارون و مامون کی شان بیان کرتا ہے۔

حضرات! اس میں شک نہیں کہ اسلاف پرستی بہت عمدہ شیوہ ہے، مگر اُسی حد تک کہ ہم اپنے بزرگوں کی خدمات کی داد دیں اور اُن کی عزت کریں، اور اصل طریقہ اُن کی بزرگیوں کی داد دینے اور قدر کرنے کا یہ ہے، کہ ہم اُن کے قدم بقدم رکھیں اور

اُن کی محنت، اُن کی یک رنگی، اُن کی نفس کشی کی تقلید کریں، اور اُن کا سا صبر استقلال اُن کا سا انہماک طلب علم میں پیدا کرسکیں، اور جس فن کو اختیار کریں، اُس میں اُن کی سی نظرِ تحقیق حاصل کریں، نہ یہ کہ ہمارے بزرگوار جو کچھ اپنے وقت میں کرگئے ہیں اُس پر غرّہ کریں۔ اور مثل زن بیوہ کے اُن کے نام پر بیٹھ رہیں۔ اور اُن کی علمی بزرگیوں کا تذکرہ دوسروں سے سن کر زمانہ حال کی دولت علمی کو حقیر سمجھیں اور اُس کے دریافت سے اغماض کریں۔ مختصر یہ کہ اسلاف پرستی کو اپنی جہالت یا کاہلی یا نفس پروری کا بہانہ گرداننا ہرگز جائز نہیں ہے۔ اور نہ یہ جائز ہے کہ اُن کی بزرگیوں کو یاد کرکے ہم اپنے عیوب سے غافل ہوجائیں اُس شخص نے تاریخ پر بالکل کورانہ اور ناقہم نظر ڈالی ہے جو یہ دعویٰ کرتا ہے کہ اُس وقت کے لوگوں میں کوئی عیب نہ تھا۔ اور ہمارا ہی زمانہ بدیوں سے بھرا ہوا ہے۔ کوئی وقت عیب سے خالی نہیں ہوا کرتا۔ جو نقصانات ہم میں اس وقت کسی قدر مبالغہ کے ساتھ موجود ہیں اُس وقت بھی موجود تھے اور ہماری ناکامی کا تخم بو رہے تھے۔ "مَن عرف نفسہ فقد عرف ربہ" خداشناسی کے واسطے اول خودشناسی ضرور ہے جب تک ہم اپنے عیوب سے واقف نہ ہوں اور اُن کو صداقت کے ساتھ تسلیم نہ کریں۔ کبھی ہماری حالت کی اصلاح نہیں ہوسکتی۔ مگر بے شک یہ آخر العلاج الکی کا حکم رکھتا ہے۔ اس سے اذیت بہت ہوتی ہے۔ نفس انسانی جو بالطبع خوشامد پسند ہے، اپنی عیب چینی کے گزند سے چیخ اُٹھتا ہے۔ اور ناصح صادق سے ہمیشہ ملول رہتا ہے۔ عین الرضا ہر شخص کو پسندیدہ ہے۔ عین السخط کی نقادیوں سے ہر کوئی گھبراتا ہے۔ کیونکہ ؎

وعین الرضا عن کل عیب کلیلۃ ولکن عین السخط تبدی المساویا

ایک عیبوں پر پردہ ڈالتا ہے، دوسرا اُن کو ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر نکالتا ہے، مگر یاد رہے کہ عین السخط ہی ہمارا اصلی دوست ہے۔ دوسرا جو ہماری عیب پوشی کرتا ہے وہ دراصل ہمارا دشمن ہے۔ "والعاقل تکفیہ الاشارہ"

حضرات! آپ لوگ جو قوم کی طرف سے بطور وکلا یہاں جمع ہوئے ہیں آپ کا منصب بہت عظیم ہے۔ آپ کے اختیارات اور آپ کے اقتدارات نہایت وسیع ہیں۔ آپ جس قومی اصلاح کے کام میں باتفاق وخلوص نیت سعی وکوشش کریں ممکن نہیں اُس میں کامیاب نہ ہوں۔ ہمت ہار دینا اور ارادہ نہ کرنا امر علیحدہ ہے۔ اس لئے آپ سے

اُمید ہے بلکہ آپ کی قوم آپ سے بہ اعجنسر ملتجی ہے کہ اس جلسہ کو، اس موقعہ کو آپ غنیمت جان کر ہمارے قومی مقاصد کے حصول میں ایسی سعی و کوشش کریں کہ بہت جلد کوئی عملی نتیجہ نکل آئے۔ پھر ایسا موقع بارہ مہینوں کے بعد دستیاب ہوگا۔ مصرع۔ "تا سال دگر مے کہ خورد زندہ کہ ماند" اور اگر آپ نے کچھ نہ کیا تو یہ سال بھی بیکار جائے گا اور ہماری ناکامی کے اسباب زور پکڑتے جائیں گے میرا منصب یہ نہیں ہے کہ میں آپ کو ہدایت کروں کہ عملی کارروائی کس نہج سے شروع کی جائے۔ مگر میں اس قدر عرض کرنے کی جرأت کرتا ہوں کہ ہر مسلمان پر جو اس کانفرنس میں شریک ہے فرض و واجب ہے کہ جہاں تک اُس کا دسترس ہو، خود اُس طرف متوجہ ہو، اور دوسروں کو متوجہ کرے اور ایک مستقل اور مقتدر سرمایہ اس قومی کام کے لئے جمع کرنے کی کوشش کرے۔ مگر چونکہ منفردہ کوشش سے کامیابی کی توقع نہیں کی جاسکتی اس لئے ضرور ہے کہ کانفرنس کی اس قسم کی عملی کارروائیوں کو ایک قاعدہ و انتظام کے سلسلہ میں منتظم کیا جائے۔ اور اُس کے لئے باتفاق رائے کانفرنس کوئی معقول طریقہ قرار دیا جائے۔ میں اس عرض کرنے کی معافی چاہتا ہوں کہ اس وقت تک کانفرنس کے جلسوں میں اراکین و حاضرین کا وقت زیادہ تر تقریروں میں صرف ہوتا رہا ہے۔ رزولیوشن بعضے بہت عمدہ اور مفید منظور ہوئے ہیں مگر اُن کی فائدہ مندی رپورٹوں کی حد تک محدود رہی ہے۔ اُن پر اس وقت تک جس طرح لازم ہے عمل نہیں ہوا۔ ہوتا تو اس وقت تک ہم اپنی منزل مقصود سے کسی قدر قریب تر پہونچے ہوتے۔ کانفرنس کی رپورٹوں کے ملاحظہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک جلسہ میں یہ رزولیوشن منظور ہوا تھا کہ ہر شہر اور قصبہ میں کانفرنس کی کمیٹیاں مقرر ہوں اور وہ مسلمانوں کی عام تعلیم اور اُن کی درسگاہوں کے متعلق رپورٹیں پیش کیا کریں شروع شروع میں اس رزولیوشن کی کسی قدر تعمیل ہوئی۔ مگر پھر اجلاس چہارم کے بعد نہ کوئی رپورٹ پیش ہوئی نہ اس مفید تجویز کا ذکر آیا اور نہ کوئی مقامی کمیٹیاں کہیں قایم ہوئیں۔ حالانکہ اس تجویز کی تعمیل سے جس قدر فوائد منصور ہیں آپ حضرات خود خیال فرما سکتے ہیں۔ ایک دوسری تجویز یہ قرار پائی تھی کہ مختلف حصوں کے مسلمانوں کی تعلیمی حالت کا صحیح اندازہ کیا جائے، تاکہ معلوم ہو کہ کتنے مسلمان اپنے بچوں کو تعلیم دے سکتے ہیں۔ مگر نہیں دیتے۔ پھر اُس کے اسباب دریافت کئے جائیں اور یہ معلوم کیا جائے کہ کتنے مسلمان ایسے ہیں جو بوجہ افلاس

اپنے بچوں کو تعلیم نہیں دے سکتے"۔ اغراض بالا کے واسطے تعلیمی مردم شماری پر چند روز کچھ توجہ کی گئی۔ اور مسٹر بیک کو اس بات میں خاص دلچسپی رہی۔ مگر اراکین کی بے توجہی سے یہ کام بھی پورا نہ ہوا۔ اگر اس خاص مادہ میں درست طور پر معلومات حاصل کی جاتیں تو آپ صاحبوں پر واضح ہو جاتا کہ مسلمانوں کی تعلیمی حالت کس قدر افسوسناک ہی نہیں بلکہ شرمناک ہے۔ میرا ذاتی تجربہ یہ ہے کہ عموماً مسلمان لوگ اپنے بچوں کی تعلیم سے غافل ہیں اور جہاں ذرائع تعلیم اُن کے دروازہ دہلیز کے متصل موجود ہیں وہاں بھی وہ سوائے معدودے چند اس سے فائدہ نہیں اُٹھاتے۔ مذہبی تعلیم جس پر بہت زور دیا جاتا ہے سب بقول عوام زبانی جمع خرچ ہے۔ گھر پر والدین کو اس طرف مطلق توجہ نہیں۔ فقط اسکول بھیجنے کے لئے اُن کو یہ بہانہ مل جاتا ہے کہ وہاں مذہبی تعلیم نہیں ہوتی۔ کیونکہ جن مدارس میں مذہبی تعلیم کے واسطے تاکید بلیغ کی گئی ہے اور نماز میں شریک ہونے کو اصرار کیا جاتا ہے وہاں دیکھا گیا ہے کہ یہ تاکید واصرار سرکار ہی کے حکم تک محدود رہتے ہیں۔ والدین کو عموماً اس سے دلچسپی نہیں ہے۔ میں بلاخوفِ مبالغہ کہہ سکتا ہوں کہ مسلمان لڑکے جو شاذ و نادر کچھ حاصل کر لیتے ہیں اُن پر والدین کا احسان چنداں نہیں ہوتا، عموماً اپنے ہی شوق سے یا اُستادوں کی توجہ سے کچھ حاصل کر لیتے ہیں۔ مگر یہاں اس بحث کو طول دینا بے موقع ہے۔ ایک اور بہت عمدہ تجویز یہ قرار پائی ہے کہ غریب طالبعلموں کی تعلیم کے لئے وظیفہ مقرر کیا جائے اور وظائف کی رقم بذریعہ چندہ جمع کی جائے اس کی کوشش صرف ۱۸۹۸ء میں ہوئی اور گو وعدہ آٹھ ہزار روپیہ سے زیادہ کا ہوا۔ مگر فقط تین ہزار نو سو بائیس روپیہ علی گڑھ کالج کو اور پانچ سو اسّی روپیہ حمایت اسلام لاہور کو وصول ہوئے۔ کیا اس تجویز کی نسبت اب کوشش نہیں ہو سکتی اور قوم کی فیاضی اس حقیر حد تک محدود رہنے کے قابل ہے۔ مجھے تو اپنی قوم سے اس قدر مایوسی نہیں ہے بشرطیکہ آپ حضرات اس تجویز کی تکمیل میں بالاتفاق کوشش فرمائیں۔ مگر سب سے ضروری، اور باعتبار مقاصد قومی سب سے زیادہ مہتم بالشان تجویز سید صاحب کی وفات کے بعد پیش اور منظور ہوئی کہ جو مدرستہ العلوم کی تکمیل کر کے اُسے یونیورسٹی کے درجہ تک پہنچایا جائے۔ اور اس کے لئے کم سے کم دس لاکھ روپیہ جمع کیا جائے۔ اس تجویز کی بابتہ جس پر دار و مدار ہماری تمام آرزوؤں کا ہے۔ شروع شروع میں بہت جوش اور سرگرمی ظاہر کی گئی، اور یونیورسٹی کی حقیقت اور اُس کی تعلیم و تربیت کے اصول قرار دینے کے لئے بہت سی مفید رائیں

جمع کی گئیں اور جا بجا ڈیپوٹیشن بھیجے گئے، اور قریب تین لاکھ کے چندہ کا وعدہ بھی کیا گیا۔ مگر اب تک فقط ایک لاکھ پچیس ہزار روپیہ وصول ہوئے ہیں۔ اور اس سال میں جو ختم ہوتا ہے سوائے ایک بڑی رقم کے جو ہز ہائینس نواب صاحب رام پور نے بمقدار پچیس ہزار عطا فرمائے، وصول ہوئے ہیں کچھ زیادہ روپیہ جمع نہیں ہوا۔ اس میں بھی ایک لاکھ روپیہ قرض کے ادا کرنے میں صرف ہوا اور ہوگا۔ اور اصل تجویز یونیورسٹی کے لئے ہمارے ہاتھ میں پچیس ۲۵ ہزار باقی رہ جائے گا۔ اور اس عرصہ میں وہ جوش جو ہندوستان کے مختلف مقامات میں اس تجویز کی نسبت ظاہر کیا گیا تھا روز بروز سرد ہوتا گیا اور سرد ہوتا جاتا ہے۔ اور اب اگر فوراً بلا درنگ متفقہ کوشش سچے دل سے اور خلوص نیت سے اور نہایت مستعدی سے اور سرگرمی کے ساتھ نہ کی گئی تو یہ نقش جو مسلمانوں نے ایک لحظہ کے لئے عالم رویا میں دیکھا تھا کبھی مجسم ہو کر ان کے آگے نہ آئے گا۔ اور اس خواب کی تعبیر کبھی ظاہر نہ ہوگی۔ آپ سب حضرات جو اپنی قوم کے بہی خواہ ہیں یقیناً قبول فرمائیں گے کہ یہ سب تجویزیں خصوصاً یہ اخیر تجویز جس پر میرے نزدیک دار و مدار تمام قومی صلاح و فلاح کا ہے اس لایق ہے کہ جاری کی جائے اور قوم سے اس میں مدد لی جائے۔ مگر قوم سے کام لینے کا کوئی مستحکم سلسلہ قایم ہونا چاہئے۔ اس وقت تک کوئی اس قسم کا مستحکم سلسلہ قایم نہیں ہے۔ اس کے لیے سب سے ضروری یہ امر ہے کہ اسٹینڈنگ کمیٹی کانفرنس جس کا مستقر علی گڑھ ہے اس کے دفتر میں ایک خاص لیاقت کا شخص مقرر کیا جائے جس کا صرف یہ کام ہو کہ وہ سال بھر تک کانفرنس کی مفید تجویزات کے تعمیل پر مختلف مقامات کے لوگوں کو متوجہ کرتا رہے۔ اور بذریعہ خط و کتابت برابر یاد دہانی کا سلسلہ جاری رکھے اور جن شہروں میں خاص خاص لوگ اس کام سے دلچسپی رکھتے ہیں ان کو ہمیشہ بیدار کرتا رہے اور پھر بھی کافی نہیں ہے کہ علی گڑھ کے دفتر سے فقط اشتہار بانٹے جائیں اور خطوط جاری کئے جائیں۔ بلکہ ضرور ہے کہ کم سے کم دو یا تین آدمی ایسے مقرر کئے جائیں جو مختلف اضلاع میں دورہ کرتے رہیں اور برانچ کمیٹیوں کے قایم کرنے میں ساعی ہوں۔ اور جہاں کمیٹیاں قایم ہو چکی ہوں ان کی کارروائی کو دیکھتے رہیں۔ جا بجا مسلمانوں میں کانفرنس کے مقاصد مسلمہ اور فوائد و ضرورت تعلیم کی ہدایت کرتے رہیں۔ آپ خوب سمجھ سکتے ہیں کہ اس محنت و بار کے تحمل کی امید ان لوگوں سے نہیں ہو سکتی جو چند روز کے لئے اپنے

شوق سے بلامعاوضہ یہ کام اپنے ذمہ لیں، بلکہ ضرور ہے کم سے کم دو تین آدمی تنخواہ دار مقرر کئے جائیں، جو بالطبع اس کام سے دلچسپی رکھتے ہوں اور تحریر و تقریر کا مادّہ بھی اُن میں موجود ہو۔ اور چونکہ یہ تجویز بغیر رقم کے نہیں چل سکتی، اس لئے اس کے واسطے علیحدہ چندہ کیا جائے اور اسی سال سے کام شروع کر دیا جائے۔ اس سال کے واسطے انتخاناً ڈھائی ہزار روپیہ کے چندہ کی فہرست کھولی جائے اور یہ رقم علیحدہ اس کام کے واسطے رکھی جائے۔ اور ایک سال اس تجویز کا تجربہ کیا جائے تاکہ معلوم ہو کہ اُس سے کیا فائدہ ہوتا ہے اور کہاں تک ہمارے مقاصد میں مدد ملتی ہے۔ میری تو یہ رائے ہے کہ اگر یہ تجویز استقلال اور درستی کے ساتھ کی جائے اور لایق لوگ منتخب ہوں اور صدر کمیٹی پوری نگرانی کرے تو نہ صرف کانفرنس کے مقاصد و اغراض کو مدد ملے گی، بلکہ روپیہ بھی وصول ہوگا، اور آیندہ اس آمدنی سے خرچ چل سکے گا۔ کیا اگر فکر و کوشش کی جائے تو سارے ہندوستان میں پانچ چھ ہزار مرد مسلمان ایسے نہ ملیں جو پانچ ۵ روپیہ سالانہ چندہ ممبری کا دیا کریں۔ صرف ترغیب دینا اور لوگوں کو آمادہ کرنا اور ایک مستحکم طریقہ پر باقاعدہ طور سے کام چلانا ضرور ہے۔ چنانچہ آپ ہی کی اسٹینڈنگ کمیٹی نے ۱۸۹۰ء میں وظائف کے جمع کرنے کی کوشش کی اور چار ہزار چھ سو روپیہ ایک ہی سال میں جمع کر لیا۔ اگر وہی کوشش اُسی طور پر برابر جاری رہتی تو کیا ممکن نہ تھا کہ ہر سال اُسی قدر رقم وظائف کے لئے جمع ہوتی جاتی۔ مگر یہ توقع کرنا کہ صرف چند آدمی چندہ کے لئے مخصوص کر لئے جائیں اور اُنہیں سے بار بار چندہ وصول کیا جائے عقل کے خلاف اور طریقۂ انصاف سے بعید ہے۔ پس اگر حضرات! آپ کو اپنے لئے اور اپنے بال بچوں کے لئے اور اپنی قوم کے لئے کچھ کرنا ہے تو اس قسم کا کوئی طریقہ جس پر آپ سب لوگوں کو اتفاق ہو، اور جو آپ لوگوں کے نزدیک مستحسن قرار پائے اختیار کیجئے اور عملاً کچھ کر دکھائیے۔ باقی مرثیہ خوانی، اور پرانی کتابوں کی ورق گردانی، یا رونے دھونے، اور تین چار دن مجلس گرم رکھنے سے نہ اب تک کچھ ہوا ہے اور نہ آیندہ ہونے کی کچھ امید ہے۔

حضرات! میں نے آپ کی سمع خراشی کی، اور اپنے دل کے جوش سے سب کچھ رطب و یابس بک ڈالا جس کے لئے میں معافی مانگتا ہوں۔ اور آپ کا نہایت درجہ مشکور ہوں کہ آپ نے اپنے حسن خلق سے میری شکستہ و از ہم گسستہ تقریر کو توجہ کے ساتھ سماعت فرمایا۔ اب میں اُمیدوار ہوں کہ آپ اس زاویہ کے کارفرماؤں کو اجازت دیں گے

کہ وہ اپنے اپنے مقاصد آپ کے سامنے پیش کریں تاکہ آپ کی راے اور مشورہ سے
قوم مستفیض ہو۔ مگر قبل اس کے کہ میں اپنی تقریر کو ختم کروں چاہیے ہے کہ اول تو اس شہر کی کھلی
مہمان نوازی کا شکریہ ادا کروں۔ خصوصاً ان بزرگوں کا بھی جو یہیں باقی کے اعضاء اور عالی الخصوص
والی ملک عالی جناب نواب صاحب رامپور کا جن کا نام نامی قوم کے محسنوں کے دفتروں میں
ہمیشہ کے لئے درج رہے گا اور جن کی فیاضی نے مدرستہ العلوم علیگڈھ کو اور مسلمانوں کی
ان کوششوں کو جان تازہ بخشی ہے۔ ہم سب لوگ جو دور دراز مقاموں سے آپ کے حسب الطلب
آئے ہوئے ہیں تمام عمر آپ کے اخلاق، آپ کی خاطرداری، آپ کی مہمان نوازی نہ بھولیں گے
شاید ہم اپنی قوم کے محسنوں کو نہیں بھول سکتے ہیں جن کی فیاضی اگر سید صاحب کی کمک نہ کرتی
تو ان کے خیالات و تفکرات ان کے دل ہی دل میں رہ جاتے تھے نقش آن کا صفحۂ ہستی
پر مصور نہ ہوتا۔ خصوصاً سرتاج مسلمانان ہند والی ریاست حیدرآباد دکن ولی نعمت اعلٰے
حضرت نظام الملک آصف جاہ خلد اللہ ملکہٗ کے بے بہا احسانوں کا شکریہ قوم پر واجب ہے۔
ادام اللہ منہ و برکاتہ لنا و للعلمین و حفظ اللہ و بلاده من حوادث الزمان و نوائب الحدثان -
اور اخیر میں میرا فرض ہے کہ میں اُس سرکار ابد قرار کا شکریہ تہ دل سے ادا کروں کہ جس کی
بدولت ہم اس قسم کی قومی اغراض میں باتفاق کوشش و سعی کرنے پر مقتدر رہیں اور جو ہر طور سے
جائز اور مفید مقاصد میں ہم کو ہر وقت مدد و کمک دینے کے لئے آمادہ ہے خصوصاً حکمران
ممالک مغربی و شمالی جو اول سے مدرستہ العلوم علی گڑھ کو فیاضانہ کمک دیتے رہے اور
لفٹننٹ گورنر حال کا کہ انھوں نے عین وقت پر مدرسہ کو بے بہا مدد سے سرفراز کیا اور ہمیشہ
اُس پر نظر مربیانہ مبذول رکھتے ہیں۔ یہ سال عیسوی جو آجکل حالت اختتام میں ہے بڑا پر مصائب
سال تھا، ایک طرف طاعون کی ترکتازی، ایک طرف قحط سالی کے حملے، ادھر جنگ ٹرنسوال
کے مہمات، اُدھر چین کی پیچیدہ مشکلات لیکن الحمد للہ کہ ہماری ملکہ معظمہ قیصرہ ہند خلد اللہ ملکہا کی نیک نیتی
اور اُن کے کارپردازوں کی لیاقت و فطانت سے سال بخیر و خوبی گذر گیا اور تمام مشکلات
کامیابی کے ساتھ حل ہو گئیں۔ اور نائرہ شر و فساد برطرف ہو گیا۔ خدا اُن کا ظل عاطفت
ہم رعایا کے سروں پر ہمیشہ قائم و دائم رکھے۔ فقط

پنے اپنے مقاصد آپ کے سامنے پیش کریں تاکہ آپ کی راے اور مشورہ سے
ہو۔ مگر قبل اس کے کہ میں اپنی تقریر کو ختم کروں مجھ پر واجب ہی کہ اول تو اس شہر کی کمیٹی
کا شکریہ ادا کروں۔ خصوصاً ان بزرگوں کا بھی جو میز باتی کے اعضار اور علی الخصوص
عالی جناب نواب صاحب رامپور کا جن کا نام نامی قوم کے محسنوں کے دفتروں میں
لئے درج رہے گا اور جن کی فیاضی نے مدرسۃ العلوم علیگڈھ کو اور مسلمانوں کی
نسوں کو جان تازہ بخشی ہے۔ ہم سب لوگ جو دور دراز مقاموں سے آپ حسب الطلب
ہیں تمام عمر آپ کے اخلاق، آپ کی خاطرداری، آپ کی مہمان نوازی نہ بھولیں گے
قوم کے محسنوں کو ہم بھول سکتے ہیں جن کی فیاضی اگر سید صاحب کی ... ترقی
خیالات و
تاخصو ...
م الملک
نہ وبرکاتہ
میرا فرض
قسم کی
مقاصد
و شمالی
رحا

افسوس هے که انریبل مسٹر جسٹس باقم کا فوٹو حاصل
نهیں هوسکا - اگر کسی صاحب کے پاس هو تو براه کرم
مستعار مرحمت فرماویں - بعد کار برآری انشاء الله تعالی
واپس کیا جاویگا *

عون کی ترلتا ازی، ایک طرف قحط سالی ... اور جناب سرسو
کی پیچیدہ مشکلات لیکن الحمدللہ کہ ہمارے ملکہ معظمہ ... ملکہ کی نیک نیتی
وازوں کی لیاقت و فطانت سے سال بخیر و خوبی گذر گیا اور تمام مشکلات
حل ہوگئیں۔ اور نائیرہ شر و فساد برطرف ہوگیا۔ خدا ان کا ظل عاطفت
سروں پر ہمیشہ قایم و دایم رکھے۔ فقط

اجلاس پانزدہم

(منعقدہ ۱۹۰۱ء مدراس)

صدر آنریبل جسٹس باڈم صاحب چیف جسٹس ہائی کورٹ مدراس

حالات صدر

جسٹس باڈم علماء یورپ کے ان نامور اور نیک نفس لوگوں میں سے تھے جو اس خیال سے ہندوستان میں آئے کہ اپنی نیک نفسی اور قابلیت سے ان لوگوں کو نفع پہنچانے کی کوشش کریں جو علم کے لحاظ سے اس ملک میں کم زور ہوں، ان کی سروس کا تعلق مدراس پریسیڈنسی سے رہا انھوں نے دیکھا کہ صوبہ مدراس کے مسلمان نہ صرف تعداد کے لحاظ سے اپنے دیگر ابنائے وطن کے مقابلہ میں پس ماندہ نظر آتے ہیں بلکہ ان میں علمی، اخلاقی، مادی ہر قسم کی کم زوریاں موجود تھیں۔ اگر ان کے کم زور جسم میں طاقت نہ پہنچائی گئی اور ان کے قوائے دماغی کی تربیت علمی روشنی سے نہ کی گئی تو دوسری بلند حوصلہ اقوام کے مقابلہ میں ان کی پوزیشن توازن قوت کے لحاظ سے بہت ہلکی ہو جائے گی چنانچہ اس خیال کو انھوں نے شروع سے پیش نظر رکھ کر مسلمانانِ مدراس کی ذہنی اور تعلیمی ترقی میں حتی المقدور کوشش کی اور ان کی ہر طرح پر اخلاقی امداد اس وقت کی جبکہ وہ مدراس ہائی کورٹ کے چیف جسٹس اور انجمن مفید اسلام مدراس کے پریسیڈنٹ تھے۔ یہ انجمن مسلمانان مدراس کی تعلیمی

اور دماغی خیالات کی اصلاح میں اس زمانہ میں نہایت مفید خدمت انجام دے رہی تھی انجمن مذکور کے قیام سے اور جسٹس موصوف کی سرپرستی اور ہمدردی سے مسلمانان مدراس کی تعلیم میں ان کو بڑی مدد ملی مدرسہ اعظم جو نوابان کرناٹک کی یادگار ہیں عربی فارسی کی قدیم درسگاہ تھی اور اب تقریباً اسی برس سے انگریزی تعلیم کا سرکاری مدرسہ بن گیا ہے جسٹس باڈم کی بڑی خواہش تھی کہ مسلمانان مدراس کوشش کر کے گورنمنٹ سے اس مدرسہ کو اپنے ہات میں لے لیں اور جنوبی ہند کے مسلمانوں کے لئے بہترین کالج کے درجہ تک اس کو ترقی دیں وہ مسلمانان مدراس کے انڈسٹریل اسکول کے بھی کئی سال تک پریسیڈنٹ رہے۔

مسلمانان مدراس نے جب کانفرنس کو مدراس میں دعوت دئے جانے کا تہیہ کیا تو جسٹس باڈم نے نہ صرف اس تجویز کو پسند کر کے اس کی تائید کی بلکہ عملی طور پر اپنے اثر اور ہمدردی سے اجلاس کانفرنس کو کامیاب بنانے میں ساعی ہوئے کانفرنس کی تاریخ میں یہ پہلا جلسہ تھا جو اس کے مرکز سے اتنے دور دراز فاصلہ پر نواب محسن الملک مرحوم آنریری سیکرٹری کانفرنس کی سرگروہی میں کامیاب طریقہ سے انجام پذیر ہوا تھا جسٹس باڈم کی اخلاقی ہمدردی کے برتاؤ نے مسلمانوں کو آمادہ کیا کہ وہ کانفرنس کی صدارت کے لئے بجائے اس کے کہ کسی مسلمان کا انتخاب کریں جسٹس باڈم کو صدر بنائے جانے کی تحریک کی اور اس طرح پر وہ کانفرنس کے پندرھویں سالانہ جلسہ کے پہلے یوروپین صدر قرار پائے۔

کانفرنس کے جلسہ میں تحریک انتخاب صدر کی تائید میں اس وقت خواجہ غلام الثقلین۔ بی اے مرحوم نے تقریر کرتے ہوئے کہا تھا "اگرچہ مسلمانان مدراس تعداد میں کم، تعلیم میں پیچھے، سرکاری ملازمت میں کم ہیں، لیکن اس وجہ سے وہ اپنے شمالی ہندوستان کے بھائیوں سے زیادہ خوش نصیب ہیں کہ ان کی کمیٹی کا پریسیڈنٹ، ان کی ترقی میں عملی کوشش اور محنت کرنے والا، ان کی فلاح اور بہبودی میں اپنا بیش قیمت وقت قربان کرنے والا، آنریبل جسٹس باڈم جیسا قابل جنٹلمین موجود ہے۔"

بے شبہ جن پاکیزہ خصلت انگریزوں نے اپنی عمدہ تعلیم عمدہ اخلاق اور اچھی خصلت کی امداد سے ہندوستان میں حکومتِ برطانیہ کو استوار کرنے کی کوشش کی ہے ان میں ایک جسٹس باڈم بھی تھے۔

اب ہم اُن کے اس ہمدردی آمیز اور قابلانہ ایڈرس کو درج ذیل کرتے ہیں جو اُنھوں نے چھبیس[۲۶] برس قبل مدراس کانفرنس میں بحیثیت صدر اجلاس کانفرنس پڑھا تھا۔

خطبۂ صدارت

حضرات! آپ صاحبوں نے مجھے ناردرن انڈین اینگلو اورینٹل ایجوکیشنل کانفرنس کے پندرھویں اجلاس کا صدر مقرر فرمایا، میں اس کو اپنے لئے موجب افتخار سمجھتا ہوں مگر اس کے ساتھ ہی میں کئی وجوہ سے اس انتخاب پر تاسف کرتا ہوں۔ بہت مناسب ہوتا کہ اگر آپ ہی کی جماعت سے کوئی صدر منتخب کیا جاتا کیونکہ قومی اتحاد کے لحاظ سے کانفرنس کے متعلقہ اور اُس کے متوقعہ نتائج میں آپ کا اور اُس کا خیال یکساں ہوتا۔ وہ آپ ہی کی زبان میں تقریر کرتا اور دوسری تقاریر جو یہاں ہوتیں اُن کو بخوبی سمجھتا، قطع نظر اس کے جو تحریکات کہ مجلس کے روبرو پیش ہوتیں اُس کی نگرانی اور رہنمائی پورے طور سے کر سکتا۔ آپ کو بھی اُس پر زیادہ اعتماد ہوتا اور اُس کی رائے کو بہ نسبت میرے خیالات کے بوجہ اس کے کہ میں غیر مسلمان ہوں، آپ کی نظر میں زیادہ وقعت ہوتی۔

لیکن بدنصیبی سے اس صوبہ کے مسلمانوں میں کوئی بڑا جوشیلا مسلمان لیڈر جس کی تابعداری سب لوگ آسانی سے قبول کر سکتے موجود نہیں ہے۔ نہ یہاں کی کمیونٹی میں باہم دگر اتفاق ہے اور نہ کوئی موثر انتظام اُن میں قایم ہے۔ ہر کہیں جُدے جدے مجمعے نظر آتے ہیں مگر قومی اغراض اور مقاصد سے بے خبر۔ اس وجہ سے اور نیز مسلمانوں کی ایک بڑی جماعت کی جہالت، بدگمانیوں اور باہمی حسد کے سبب سے صدارت کے لئے کسی مدراسی مسلمان کا منتخب ہونا متعذر رہا۔ مگر میں وثوق کے ساتھ امید کرتا ہوں کہ اس دفعہ کانفرنس کا یہاں منعقد ہونا مسلمانوں میں ملاپ اور دلوں میں قومی حمیت پیدا کرے گا اور یہ بات اُن کے ذہن نشین ہوگی کہ وہ سب ایک ہی کمیونٹی کے اجزا ہیں اور سب کا بڑا مقصد ایک ہی ہے۔ یہ خیال اُن کی باہمی نا اتفاقی اور حسد کو دور کرنے اور آیندہ اپنی اور اپنی اولاد کی ترقی کے لئے ایک دل ہو کر کام کرنے کو کافی ہے۔ ان وجوہات سے میں نے صدارت کی خدمت قبول کی مگر بڑے تردد اور حیص وبیص کے بعد اس امید پر میں نے یہ کام قبول کیا کہ میری دلی خواہش جو ایسے نازک وقت میں قوم کو مدد دینے کی ہے میری عدم لیاقت کی تلافی ہو جائے اس لئے میں امید رکھتا ہوں کہ بہ حیثیت صدر جو قصور مجھ سے صادر ہوں اُن سے اغماض فرما دیں۔ میری کوشش پر سختی سے اعتراض نہ فرمائیں اور میرے اڈریس کو اگلی فاضلانہ تقاریر کے ساتھ موازنہ نہ کریں۔

گزشتہ اجلاس کے بعد دو سانحے دنیا کے دو جُدے مقامات میں گزرے جن سے ہم سب کو سخت رنج و ملال ہوا۔ مغرب میں جس ملک کا میں رہنے والا ہوں ہماری عزیز کوئن ایمپریس وکٹوریہ نے رحلت فرمائی اور آپ کے ملک کے آستان پر آپ کی قوم کے ایک رکن رکین امیر عظیم الاقتدار افغانستان نے انتقال کیا۔ اس نئی صدی کے پہلے سال میں ان دو بڑے بادشاہوں کے انتقال سے دنیا کو جو صدمہ پہنچا اُن کا ہم سب کو رنج و افسوس ہونا چاہئے اُن میں سے ایک نے با وصف اپنے علو منصب کے تعلیم یافتہ اُناث میں جو عمدہ اور علےٰ خصائل ہونا چاہئیں اُن کا ثبوت اپنی ذات میں دیکر دنیا میں عزت بزرگی اور ہر دل عزیزی حاصل کی۔ دوسرے نے اپنی مردانہ صفات سے لوگوں کو اپنا مداح اور قدردان بنالیا۔ ہر ایک نے اپنی جداگانہ حیثیت زندگی اور مجمع میں با وصف تکلف اوضاع نمایاں بزرگی پائی اِن ہر دو کی زندگی سے اس سلطنت کو دائمی امن اور سرسبزی حاصل ہوئی شاید آپ کا خیال ہوگا کہ ایسے مجمع میں اِن واقعات پر اپنا اظہار رنج کریں۔ اس لئے میں نے اس مشترکہ اور عدیم البدل نقصان کی نسبت اسی چھوٹی تقریر پر اکتفا کی۔

آپ خوب جانتے ہیں کہ بانی مبانی اِس کانفرنس کے سرسید احمد خاں بہادر تھے اور اُنھوں نے ہی علی گڑھ کالج کو قایم کیا۔ اِن دونوں کی دائمی کامیابی سے بڑھ کر کوئی یادگار کسی شخص کے واسطے نہیں ہو سکتی۔ ہر سال اُن کی طلب پر ہندوستان کے سارے مقامات سے لائق اور ذی ہمت اراکین اسلام آتے رہے تاکہ مسلمانون کی تعلیمی ضروریات پر مل کر غور کریں اور جو کالج کہ اُنھوں نے قایم کیا اُس میں روز بروز نوجوانوں کو وہ تعلیم دی جاتی ہے جو اُن کو سودمند اور جو شیلے سٹیزن ہونے کے لئے مفید ہو اور اُن ہی تعلیم یافتوں کی کوشش اور رل مل سے اس کانفرنس نے بہت کچھ اچھا کام کیا اور کر رہی ہے۔

اس کانفرنس کی غرض یہ ہے کہ مغربی اعلیٰ درجہ کے علوم کا نشر مسلمانان ہند میں ہو اور سینس و لٹریچر میں جو کچھ بہتر ہے اور جس کے لئے وہ اگلے زمانہ میں مشہور تھے اُن میں محفوظ رہے۔ بلحاظ اس امر کے جو لوگ قوم کے بہی خواہ ہیں وہ ضرور اِس کانفرنس کی تایید کریں گے۔ فی زمانناً یہ خوشی کی علامت ہے کہ مسلمانوں نے جو اب تک اُن تعلیمی آسانیوں سے جو سرکار نے پیش کیں فائدہ حاصل نہ کیا تھا اب ہوشیار ہو کر قومی تعلیم کے مسئلہ کے حل کرنے کے لئے تدبیریں سوچ رہے ہیں۔ ایک مدت تک مسلمان انگریزی تعلیم کو تعصب و بے پروائی اور نفرت کی نظر سے دیکھتے رہے مگر بتدریج یہ بات کم ہوتی جاتی ہے۔ اُس بڑے آدمی سرسیّد احمد خاں بہادر نے ایسی مشکلوں کے دفعیہ کے لئے اینگلو اورنٹیل کالج کی بنیاد ڈالی

جو بذاتہ ایک پُرکیفیت کالج ہے اور اہل اسلام کو سمجھایا کہ قوم کی نجات ذاتی محنت و اعتماد پر موقوف ہے۔ آج تک کانفرنس کی کارروائی اسی تعلیم کی تائید میں رہی اور میں اُمید کرتا ہوں کہ آیندہ بھی اُس کا یہی عمل رہے گا۔ تاسف کی بات ہے کہ کانفرنس کے اغراض و مقاصد بعض مقامات میں صحیح طور سے سمجھے نہیں گئے ہیں اور اس سبب سے زیادہ ضرور تھا کہ اس سال کانفرنس کا اجلاس مدراس میں ہو کیونکہ بلحاظ قومی ترقی کے مدراس دوسرے شہروں سے بہت پیچھے پڑا ہوا ہے۔ اگر کانفرنس سے صرف اتنا ہی نتیجہ ہوا کہ مسلمانوں کے دلوں میں تعلیمی جوش پھیلا تو یہ خود اُس کی تائید اور ہمدردی کے لئے بڑے استحقاق کی بات ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ کانفرنس کے جمیع اغراض و مقاصد ابھی حاصل نہیں ہوئے اور اس کے تمام اقرار پورے نہیں ہو سکے مگر اُس نے اچھا کام کیا اور کر رہی ہے۔ اگر کھوئی ہوئی بزرگی دوبارہ حاصل کرنا منظور ہو تو ذاتی تائید اور ذاتی بھروسہ مسلمانوں کا نصب العین رہنا چاہیئے، بے اعتنائی اور بحث کے عوض مسلمان اپنی نازک حالت پر غور کریں۔ زندگی کی لڑائی میں جو بے طاقت ہوتا ہے وہ ضرور شکست کھاتا ہے۔ یہ مسئلہ جیسا اشخاص کے واسطے صحیح ہے ویسا ہی قوموں کے واسطے بھی راست ہے۔

کسی کو اس میں شک نہیں کہ کانفرنس سے مسلمانوں کو نفع پہنچتا ہے۔ صدیوں تک جب دوسری قومیں ترقی کرتی رہیں مسلمان سوتے رہے۔ کسی زمانہ میں مسلمانوں کی قوم بڑی معزز تھی اور مجھے کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ وہ آیندہ پھر اپنا قدیم مرتبہ دنیا میں حاصل نہ کرے۔ مگر یہ سب کچھ اُنھیں پر موقوف ہے۔ اگلے زمانہ میں مسلمانوں کی بزرگی صرف اُن کے جواں مرد اور فاتح ہونے سے نہ تھی بلکہ وہ علوم میں بہت مشہور تھے اور یہ بزرگی اُن کی جنگی ناموری سے فائق تھی۔ جو لوگ اِن ایام میں عالم کہلانا چاہتے تھے عربی مدارس میں کئی سال تحصیل دینیات، قانون، منطق، حکمت اور فلسفہ میں گزارتے تھے۔ مسلمانوں کے بڑے بڑے دارالعلوم قاہرہ، بغداد اور سمرقند میں تھے جہاں ہر گوشہ سے لوگ تحصیل علم کے لئے آتے تھے۔ اسپین جو اس وقت فتح ہو چکا تھا وہ بھی ایک عربی دارالعلوم کا مستقر تھا اور اُس زمانہ میں مسلمانوں کے لٹریچر کو بڑی ترقی تھی۔ اس بزرگی کے زمانہ کو اُسی وقت یاد کرنا مناسب ہو گا جب اُس کی یاد سے اُس کو دوبارہ حاصل کرنے کا شوق دل میں پیدا ہو۔ مگر اُن کی یاد صرف اپنے دل کو ٹھنڈا کرنے کے لئے ایسی ہی حماقت ہے جیسے کوئی اپنی آج کی اشتہاء کو کل کی ضیافت کی یاد سے مارنا چاہے۔ وہ دن گزر گئے برسوں آپ سوتے رہے اور جو لوگ چالاک تھے اُن کو بڑھ جانے کی گنجایش دیدی۔ آپ اپنے کو دوسری اقوام سے دولت قدرت

اور علم سے پیچھے پاتے ہیں۔ نواب عماد الملک سید حسین بلگرامی جو گزشتہ اجلاس کانفرنس کے صدر تھے اور جن کا نام اُن کے الفاظ کو لوگوں کی نظروں میں وقعت دلانے کے لئے کافی ہے یوں کہتے ہیں "تنزل اور ادبار کا تخم جب ہی سے بویا گیا کہ ہم نے آرام کا ارادہ کرلیا۔ اگلی فتوحات پر قناعت کی اور جدید علوم و جدید تحقیقات سے غفلت کی۔ اس سے سب کچھ کھو بیٹھے۔ ہمت جواں مردی اور اُمنگ قوم سے کم ہونے لگی اور اُسی کے ساتھ قدرت اور دولت بھی۔ یہ بڑی غلطی ہے جو مسلمان سمجھے ہیں کہ دولت کے زوال سے راحت کا زوال ہوا۔ تاریخ اس کے برعکس سبق دیتی ہے۔ یعنی ہم نے اپنی قدرت کھودی۔ کیونکہ قدرت کو بچانے اور قایم رکھنے کے جو اسباب تھے ہم نے اُن کو آگے ہی سے کھودیا۔"

اس زمانہ میں علم قدرت ہے۔ جو لوگ جاہل متعصب اور پیچھے رہ گئے ہیں وہ تباہ ہوتے ہیں جو زمانہ کی رفتار کے ساتھ ہیں اور علم حاصل کرنے اور اُس کو بڑھانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں دیتے وہ لوگ سبقت لے جاتے ہیں اور عزت و منصب حاصل کرتے ہیں۔

بڑا مقصد کانفرنس کا یہ ہے کہ آپ اپنی اور اپنی اولاد کی بہتری کے ذریعے ڈھونڈ نکالیں اور ایسے علم کی تلاش کریں جس سے آپ کی اولاد دوسری اقوام کے ساتھ برابری کر سکے۔

کانفرنس آج تک اِس اصول پر برابر کارروائی کرتی تھی کہ مسلمانانِ ہند ہنوز دوسری رعایائے شاہی کے ہم پلہ نہیں اور جب تک وہ اپنے کو صاحبان کوتنڈ سروس کے ہمسر نہ کریں ایسے پولیٹیکل حقوق کے مستحق نہیں ہو سکتے۔

مسلمانوں کے لئے یہ قابل قدر بات ہے کہ اُنھوں نے اِس امر کو ہمیشہ پیش نظر رکھا ہے اور اُن کو سرسید احمد خاں کی تعلیم کے موافق برٹش گورنمنٹ پر بھروسہ ہی۔

سرسید کی اور میری بھی یہی رائے ہے کہ جب گورنمنٹ اپنی گوری رعیت کی طرح مسلمانوں پر اعتماد کرے گی اُن کو بھی وہی حقوق دے گی۔ اب یہ سوال ہوتا ہے کہ ایسا اعتماد کس طور سے حاصل ہو اور اسی مسئلہ کو کسی قدر حل کرنے کے لئے کانفرنسوں کی ضرورت ہے ان کانفرنسوں کی بدولت متفرق حصص ہند کے لوگ جن کو مسئلہ تعلیم مسلمانان میں مذاق ہے یکجا جمع ہوتے ہیں اور راعیان قوم اپنی اپنی رائے ایک دوسرے پر ظاہر کرتے ہیں۔ اس طور سے باہمی موافقت زیادہ ہوتی ہے۔

ایک صوبہ والے دوسرے مقام کے بھائیوں کے تجربہ سے مستفید ہوتے ہیں۔ ان کے مابین کتنا ہی بُعد و مسافت رہے اور اُن کے پیشے کیسے ہی مختلف ہوں، مگر بہ لحاظ رفاہ قومی کے وہ ایک

جسم ہیں۔ عام حاجتوں میں ایک دوسرے پر اعتماد کرتے ہیں اور متحدانہ و متفقانہ کارروائی سے حتی الوسع اپنے کام کو فروغ دینے کی کوشش کرتے ہیں۔

مصلحین قوم کی یہ اصولی رائے ہے کہ ہندوستان میں آجکل جو تعلیم دی جاتی ہے وہ مسلمانوں کی ضروریات کو کافی نہیں۔ اس لئے ان کو اپنی تعلیمی آسائیوں کو ترقی دینے کے لئے جان توڑ کر کوشش کرنا چاہیئے۔ ضروریات قوم جو مدارس میں پوری نہیں ہوسکتیں اُن کو آپ زیادہ جانتے ہیں اور آپ کا کام ہے کہ ایسی مجالس میں اُن کو بیان کریں اور اُن کو پورا کرنے کی تدابیر سوچیں۔ زمانہ گورنر جنرل اول سے اس وقت تک کہ حضور لارڈ کرزن اِس لیاقت کے ساتھ نیابت شاہی کر رہے ہیں، گورنمنٹ ہند تعلیمی اُمور میں ہمیشہ اپنی دلچسپی بخوبی ثابت کرتی رہی۔ جس کسی نے حال میں اُس کانفرنس کی کارروائی جو بصدارت لارڈ کرزن منعقد ہوئی تھی دیکھی ہے اُس کو معلوم ہوگا کہ اس بارہ میں سرکار کی پالیسی اب بھی وہی ہے جو پیشتر تھی مگر اس خیال سے آپ حضرات ہرگز اپنی قوم کی تعلیمی ترقی میں سہل انکاری نہ کریں۔ اِس مقام پر میں آنریبل مسٹر جسٹس امیر علی صدر جلسہ کانفرنس کلکتہ کی تقریر کے ایک حصّہ کا اقتباس کرتا ہوں۔ کیونکہ میرے خیالات اُنھوں نے مناسب اور زوردار الفاظ میں بیان کئے ہیں۔ "اب ایک نئی صدی کی ابتدا ہے۔ کوئی شخص اس صدی میں آیندہ کیا ہونے والا ہے خیال نہیں کرسکتا مگر یہ کہ اُمیدوں کی خوشی سے اُس کا دل بھر جاتا ہے۔ ہمارے نوجوانوں کو ضرور یہ امید ہونی چاہیئے کہ یہ صدی قومی لیاقت و ترقی کی یادگار ہوگی اور یہ ترقی اُنہیں کی ذاتی کوششوں پر موقوف ہے آپ کی تقدیر ایک بڑی اور شایستہ گورنمنٹ کے ہات میں ہے۔ میرے سخن کو باور جانئے کہ دوسری کوئی گورنمنٹ اپنی رعایا کی بہبودی کا اس قدر خیال نہیں رکھتی اور نہ اُن کو ترقی کرنے کے لئے اس قدر گنجایش و موقع دیتی ہے۔ غلطیاں تو اکثر ہوتی ہیں وہ صرف خدائی سرکار ہے جو کامل ہے مگر موجودہ گورنمنٹوں میں کسی کو اس قدر خیال اپنی رعایا کی ترقی کا بلا لحاظ قوم و مذہب نہیں جیسا اس گورنمنٹ کو ہے جس کے زیر سایہ ہم ہیں۔ اعلیٰ سے لے کر ادنیٰ عہدہ دار تک جو ہندوستان کو آتے ہیں اُن کا یہی خیال رہتا ہے کہ حتی المقدور ہندوستانیوں کو نفع پہنچائیں۔ مجھے ان الفاظ کا کہنا ضروری ہے تاکہ باقی تقریر کے لئے مطلع صاف ہو۔ آپ جانتے ہیں کہ ہم قومی کا لحاظ ہندوستان کے کسی متفرق اقوام و مذاہب میں نہیں۔ یہ ملک مختلف قوموں کا ہے ایک قوم کا نہیں اور ہر قوم متفرق قبائل پر منقسم ہے اور ہر قبیلہ کے مذہبی اور قومی خیالات جدے ہیں اس وجہ سے سرکار کو بڑی مشقت کا سامنا ہوتا ہے۔ کیونکہ اُس کو ہر فرقہ کی بہبودی مدنظر ہے۔ یہی گورنمنٹ کی جنرل پالیسی ہے اور کوئی راست باز آدمی انکار نہیں کرسکتا کہ یہی نہایت معقول اور

عنایت آمیز پالیسی ہے۔ اگرچہ گورنمنٹ کسی قوم کی اندرونی کوششوں کی جو ترقی کے لئے کی جاتی ہیں تائید اور اچھی تائید کرسکتی ہے۔ مگر اُس انداز تک کہ اُس سے دوسری قوم کا نقصان یا اتلاف حق نہ ہو کیونکہ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ بعض کام نیک نیتی سے کسی قوم کے ساتھ کئے جاتے ہیں اور اُس کی وجہ سے میزان عدل میں اُس قوم کا پلّہ گراں ہو جاتا ہے۔ پس جہاں تک دوسری قوم پر صدمہ یا ظلم نہ ہو سرکار اپنی رعایا میں سے ہر ایک قوم کے ساتھ حتی الوسع مدد کرنے کو تیار رہے۔ جب یہ بات ہے تو موجودہ انتظام تعلیم ہماری ضرورتوں کی نسبت کیسا ہی ناموافق رہے ہم یہ اُمید نہیں کرسکتے کہ سرکار صرف ہمارے خاص فائدے کے لئے اس کو بدل دے گی۔"

میں بھی مسٹر جسٹس امیر علی کا ہم زبان ہوں۔ انتظام موجودہ تعلیمات ہند گو دوسری اقوام کو کیسے ہی موافق ہوں اگر اہل اسلام کی ضرورتوں کو کافی نہیں تو اس کا تکملہ خود آپ کو کرلینا چاہئے۔ اگر سرکار اس امر میں دوسری اقوام پر ظلم کئے بغیر آپ کی تائید کرسکتی ہے تو مجھے یقین ہے کہ وہ مدد کرے گی۔

لارڈ کرزن نے فرمایا کہ کوئی تعلیم جو مذہب پر مبنی نہیں کامل نہیں ہوسکتی، اس قول کی صداقت کو ثبوت کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ جس تعلیم سے آدمی کا رویہّ درست نہیں ہوسکتا وہ کامل اور سود مند نہیں ہوتی۔ دنیوی تعلیم جو مذہبی تعلیم پر مشتمل نہیں صرف ایک تادیبی انتظام ہے اور وہ جسمانی اور دماغی قوتوں کو بڑھانے اور اُن کو راستی پر لانے کے لئے موضوع ہے، تاکہ اتفاقات زمانہ سے انسان جس کام میں لگے اُس میں وہ قوتیں اُس کے کام میں آئیں۔ تعلیم اپنے پورے معنی میں اس سے کہیں بڑھ کر ہے۔ کیونکہ آدمی کیسا ہی لایق اور چالاک ہو جب تک اُس کی لیاقتیں درست طور پر کام میں نہ لائی جائیں وہ اپنے آپ کو اور قوم کو نفع پہنچانے کے عوض محل خطر ہوتا ہے۔ جب میں ولایت میں بارسٹری کرتا تھا اُس وقت ایک مقدمہ درپیش ہوا، جس سے میرے دعوے کی تشریح و تصدیق ہوتی ہے۔ کسی ریلوے کمپنی نے ایک نوجوان آدمی پر جھوٹے ٹکٹ طیار کرنے اور اُن کو استعمال کرنے کی نالش کی۔ وہ شخص ایک انجنیر کے آفس میں نقاش تھا۔ گو اس کی تنخواہ کم تھی مگر نقشے اچھے کھینچتا تھا۔ وہ ہر شام کو اپنے کام سے فراغت پاکر دوسرے مقام کو جو وہاں سے ریل پر آدھے گھنٹے کی مسافت پر تھا جانے کا عادی تھا۔ چونکہ ٹکٹ خرید کرنے کی اُس کو گنجائش نہ تھی وہ خود جھوٹے ٹکٹ بنانے پر آمادہ ہوا اور اُس میں حروف اور نشان اور تاریخ ڈال کر کئی مہینے ریل پر بے اُجرت جاتا رہا۔ اُس نے اس صفائی سے جھوٹے ٹکٹ تیار کئے کہ مدت تک ریلوے کمپنی کو باوصف علم اِس امر کے کہ دغا چل رہی ہے گرفت کرنے کی گنجایش نہ دی۔ دریافت کے وقت جب ٹکٹ پیش کئے گئے کہ اُن میں اصل کون ہے اور جعلی کون ہے پہچاننا دشوار ہوا۔ بہرحال اُس پر ثابت ہوا اور قید دراز کی سزا

دی گئی۔ اس سبب سے جو کچھ امیدِ بہبودی اُس کی روشن دماغی سے متصور تھی وہ سب ہمیشہ کے لئے برباد ہو گئی دیکھنا چاہیئے کہ اُس شخص نے ایک وجہ سے اچھی تعلیم حاصل کی تھی مگر ایسی تعلیم نہیں جو اُسے سوسیٹی کا ایک رُکن بنا سکے۔ برخلاف اس کے اُس تعلیم سے وہ موجب ضرر سوسیٹی ہوا۔ اگر اُس نے سوائے خاص دنیوی تعلیم کے دوسری تعلیم پائی تھی تو اُس سے نفع نہ اُٹھایا۔ جس تعلیم سے رویہ کی آراستگی اور اخلاق کی درستی متصور نہ ہو وہ تعلیم کامل اور سودمند نہیں ہو سکتی۔

اہل اسلام ابتدائی مذہبی تعلیم کو زیادہ ضروری اور معتبر جانتے ہیں اور اُن کا یہ خیال صحیح بھی ہے۔ اس تعلیم کی غرض یہ ہونی چاہیئے کہ اعلیٰ خیالات اور نیک سمجھ جو اچھی زندگی کے لئے شرط اول ہیں سکھائے جائیں۔ یہ بات مسلّم سمجھی جاتی ہے کہ ہر شخص تعلیم کے فوائد سے آگاہ ہے اور جو باپ کہ خود تعلیم یافتہ ہو وہ اپنا فرض منصبی جانتا ہے کہ اپنی اولاد کو بھی اچھی تعلیم دے۔ لیکن کیا فی الواقع ایسا ہی ہوتا ہے؟ کیا ہم نہیں دیکھتے کہ بہت سے اچھا لباس پہنے ہوئے مسلمانوں کے لڑکے گلی کوچوں میں کھیلتے رہتے ہیں اور جب بڑے ہوتے ہیں اپنی جوانی بیکاری میں ضائع کرتے ہیں؟ کیا اکثر مسلمانوں کی یہ عادت نہیں ہے کہ جب اپنے بچوں کو کسی دہقانی اُستاد کے پاس پڑھنے کو بٹھلاتے ہیں یا کسی اسکول کو بھیجتے ہیں تو سمجھتے ہیں کہ جو کام اُن کے لئے کرنا تھا کر چکے؟ کیا اسی قدر اُن کا کام تھا؟ کیا فی الواقع اکثر مقاموں میں ایسا ہی نہیں ہوتا؟ اور کیا وہ بچوں کو اسکول بھیجنے کے بعد پھر کبھی اُن کے تعلیمی اُمور کا خیال کرتے ہیں؟ بمجرد اس کے کہ لڑکا کسی قدر پڑھنا لکھنا حساب کرنا سیکھ جائے کیا وہ اسکول سے الگ نہیں کیا جاتا اور کیا اُس کی تعلیم کامل تصور نہیں کی جاتی؟ ایسے لڑکے جہالت میں پڑے ہوتے ہیں اور اکثر بُرا چلن اختیار کرتے ہیں۔ اس کی جوابدہی اُن کے ماں باپ پر ہے کیونکہ اُنھوں نے خیال نہیں کیا کہ بچوں کے لئے کس قسم کی تعلیم ضروری تھی اور اُس کو کیسے حاصل کرنا چاہیئے تھا یا اُن کے بچاؤ کی کونسی صورت تھی۔

اس میں بالکل شک نہیں کہ لڑکوں کی ابتدائی مذہبی تربیت پر زور دینے سے یہ غرض ہے کہ اُن کے دلوں کو جو عالم طفولیت میں زیادہ اثر پذیر ہوتے ہیں پاک، نیک اور اعلیٰ خیالات سے مملو کریں اور اس اصول پر ایک مفید اور کارآمد تعلیم کی بنیاد قایم کی جائے۔ اس سے بہتر کوئی بات نہیں۔ مگر تعلیم کا سلسلہ اسی پر ختم نہ ہونا چاہیئے۔ یہ ضروری امر ہے کہ جب لڑکا نشو ونما پاتا ہے اور اُس کا دل وسعت پیدا کرتا ہے تو نیک اور پاک خیالات اور اچھے طور سے زندگی کرنے کی خواہش اُس کے دل میں اور بھی جمائی جائے۔ ہم انگریزوں کے یہاں لڑکا ماں کے زیر تربیت رہتا ہے وہ سب باتیں سیکھتا ہے جس پر ابتدائی خیالات اور خواہشات بنا ہوتے ہیں۔ جب وہ اسکول جانے کے قابل ہوتا ہے تو کسی بورڈنگ اسکول کو

بھیجا جاتا ہے جہاں اس کی مذہبی تعلیم برابر جاری رہتی ہے اور اُستادوں کی خبرگیری سے اِس کے اخلاق درست ہوتے ہیں جب وہ کالج جاتا ہے تو پبلک اوپینین (جمہوری رائے)، دلی جواں مردی اور اگلی تربیت کا اثر اُس کو بُرے کاموں میں پڑنے سے روکتا ہے۔ اگرچہ بہت سے ایسے بھی ہوتے ہیں اور ہمیشہ ہوتے رہیں گے کہ جب اُن کو دنیا اور اُس کے لُبھانے والے فتنوں کا سامنا ہوتا ہے، تو اپنی اگلی تعلیم و تربیت کو نسیاً منسیا کر دیتے ہیں۔

اگر خفگی کا باعث نہ ہو تو میں یہ کہوں گا کہ کم سِن بچے کو پاکی، سچائی اور درست فہمی سیکھنے کے لئے ماں کی آغوش سے کوئی مقام بہتر نہیں۔ تمام ابتدائی اور عمدہ خواہشات ماں سے حاصل کرنا چاہیئے جیسا زندگی مابعد میں پاک اور اعلیٰ خیالات بذریعہ عورت کے حاصل ہوتے ہیں۔ کوئی قوم بڑی نہیں ہو سکتی جب تک وہ اپنی اولاد کی عزت و قدر نہ کرے اور عورتیں اپنے شوہروں کے مقاصد و اغراض کو نہ سمجھیں اور اُس میں حصّہ نہ لیں۔ ایسا ہونے کے لئے میری نظر میں یہ نہایت ضروری امر ہے کہ کانفرنس میں قومی لڑکیوں کی تعلیم پر اوّل خیال کیا جاوے۔ ہر قوم کی لائف اور ہر شخص کی حیات اور تعلیم میں اُناث کے آئین اور اُن کی پوزیشن کا بڑا اثر ہوتا ہے۔ آپ کی لڑکیوں کی تعلیم تشفی بخش حالت میں ہے یا نہیں، اس پر غور کرنا آپ کا کام ہے۔ اگر تشفی بخش نہ ہو تو اس بارہ میں کیا کرنا چاہیئے اس طرف میں آپ کے خیال کو توجہ دلاتا ہوں۔

مثل مشہور ہے کہ "لڑکا ہی بڑھ کر باپ ہوتا ہے"۔ اس قلمرو میں مسلمان لڑکوں پر ابتدا ہی سے بوجھ زیادہ پڑتا ہے، بلکہ ایک دو مقام کے سوا ہر کہیں ایسا ہی ہے۔ شاید منجملہ دوسرے وجوہات کے ایک وجہ یہ بھی قوم کی پسپائی کی ہو۔ مدراس میں یہ دقت اور بھی زیادہ ہے، کیونکہ ہندوستانی یہاں ملکی زبان تسلیم نہیں کی جاتی۔ عالم طفولیت ہی میں اگر کچھ سیکھنا چاہے تو اپنی مادری زبان کے سوا دوسری زبان سیکھ سکتا ہے اور علوم حاصل کرنے کے لئے اس زبان کو اچھے طور سے سیکھنا پڑتا ہے۔ رفتہ رفتہ ایک تیسری زبان میں اُس کو لیاقت حاصل کرنے کی ضرورت داعی ہوتی ہے تاکہ وہ ملکی زبانوں میں امتحان دے کر کامیابی حاصل کرے، یہ بلا شبہ بڑی مشکل کی بات ہے۔ اس کا دفعیہ ممکن ہے یا نہیں اس مسئلہ پر اغلب ہے کہ آپ لوگ آپس میں غور و بحث کریں گے۔ اگر مجھ سے پوچھتے ہو تو میں کہوں گا کہ اس کا علاج اپنے پر سوائے زیادہ بار کشی اختیار کرنے کے اور کوئی نہیں۔ اس امر کو ظلم سمجھنے سے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوتا۔ یہ بے شک بدنصیبی ہے اور اس کو سہنا ہی پڑتا ہے اور اس مشکل پر غالب آنے کے لئے کیا کرنا چاہیئے یہ آپ کا کام ہے۔

دوسری مشکل مذہبی تعلیم ہے۔ یہی تعلیم مسلمانوں کے پیچھے رہ جانے کا سبب بتلائی گئی ہے۔ تاآں کہ یہ ضرور نہ ہو کہ مذہبی تعلیم میں قوانین شرعی بھی لڑکے کو سکھلائے جائیں۔ میں وثوق کے ساتھ رائے دے سکوں گا کہ دینی اور دنیوی تعلیم پہلو بہ پہلو ہونا چاہیئے۔ تاکہ ایک دوسرے کے مزاحم نہ ہو۔ یہ صحیح ہے کہ جب تک آپ اپنے لڑکوں کو دنیوی تعلیم کے لئے صرف ایسے اسکول میں بھیج سکتے ہیں جہاں دینی تعلیم نہیں ہوتی تو لڑکوں کو مشکل کا سامنا ہوتا ہے۔ کیونکہ اُن کی مذہبی تعلیم دوسرے مقام میں ہونا چاہئے، عمدہ اسکول مسلمانوں کے لئے وہی ہے جہاں دینی تعلیم کے ساتھ دنیوی تعلیم بھی منضم ہو۔ یہ جب ہی ممکن ہے کہ اسکول خاص قومی ہو یا زیر انتظام قوم رہے دوسرے صوبہ کے اسکولوں سے ہم فائدہ اُٹھا نہیں سکتے کیونکہ ہم اُن سے بہت دور ہیں۔ اس صوبہ میں صرف دو ہی اسکول ہیں جہاں میٹری کیولیشن کے درجے تک پڑھائی ہوتی ہے۔ ایک مدرسہ اعظم جو سرکاری اسکول ہے۔ دوسرا ہارس ہائی اسکول جو مشن سے تعلق رکھتا ہے اور جہاں عیسوی مذہب کی تعلیم ہوتی ہے مدرسہ اعظم ابتدا میں عربی وفارسی اسکول تھا اور نوابانِ کرناٹک کی فیاضی سے اُس کا خرچ چلتا تھا۔ مگر قریبًا پچاس سال سے وہ سررشتہ تعلیم سرکاری کے علاقہ میں آگیا۔ وہاں صرف دنیوی تعلیم ہونے کی وجہ سے اُن کے تلامذہ کو مذہبی تعلیم وہاں جانے سے پہلے سیکھنے کی ضرورت داعی ہوتی ہے۔ میں سنتا ہوں کہ اگلے زمانہ میں وہ اسکول اچھا کام کر رہا تھا۔ مگر چند سال سے اُس کی وقعت جاتی رہی۔ اب اُس کا انتظام نئے سرے سے ہونا چاہیئے۔ ہارس اسکول جیسا میں نے پہلے کہا مشن اسکول ہے اور چرچ مشنری سوسائٹی سے علاقہ رکھتا ہے۔ ۱۸۵۴ء میں جنرل ہارس پہلوان سرنگ پٹن کی یادگار میں اُس کی بنا ہوئی اور تعمیر کا پہلا پتھر لارڈ ہارس گورنر مدراس کے ہاتھ سے رکھا گیا۔ اُس میں انجیل پڑھائی جاتی ہے وہ بہت اچھا اسکول ہے اور مسلمان اس کو پسند کرتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یوروپین پرنسپلوں نے یکے بعد دیگرے اُس میں بڑی محنت کی مغربی تعلیم کا وہاں اچھا اہتمام ہے۔ وہاں کے قدیم طلبہ وفادار ہیں اور سوائے چند افراد کے سرکار میں شایستہ خدمات پر مامور ہیں مدراس کے سوائے دوسرے مقامات میں مسلمان ہندوؤں کے لئے مقرر کئے ہوئے اسکولوں میں پڑھتے ہیں اور کالجوں میں بھی ہندوؤں کے ساتھ رہتے ہیں۔ بڑا نقص مسلمانوں کے لئے سرکاری مدارس میں یہ ہے کہ وہاں صرف دنیوی تعلیم ہوتی ہے۔ اگر یہ ناگزیر امر ہے تو بہتر ہے کہ وہاں ہندو اور مسلمان دونوں داخل رہیں کیونکہ لڑکوں کے

لئے مقابلہ اچھی چیز ہے۔ یہاں کے مسلمانی مدارس میں صرف دنیوی تعلیم ہوتی ہے۔ مذہبی تعلیم کا انتظام کرنا غیر ممکن نہیں۔ میں سنتا ہوں کہ پنجاب میں سرکار نے اجازت دی ہے کہ اسکولو میں کمیونٹی اپنے خرچ سے اپنے لڑکوں کی مذہبی تعلیم کا انتظام کرلے۔ یہ تعلیم اوقاتِ مقررہ اسکول میں نہیں ہوسکتی اور نہ اسکول کی معمولی درسیات میں اُس کو داخل کرسکتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جب لڑکے اسکول کو آتے ہیں تازہ دم نہیں رہتے۔ ایسا انتظام یہاں بھی کرسکتے ہیں مگر وہ تشفی بخش ہوگا یا نہیں غور طلب امر ہے اور آپ کی توجہ کے قابل۔

عمدہ مسلمانی مدرسہ وہی ہے جہاں دینی اور دنیوی تعلیم دونوں ہوں، تاکہ لڑکے اسکول کو کم عمری میں جاسکیں اور دوسری قوم کے لڑکوں سے اول مکتب نشیں ہونے کی ضرورت نہ رہے اب جو مذہبی تعلیم سب لڑکوں کو دی جاتی ہے صرف حافظہ سے تعلق رکھنے کی وجہ سے دماغ کو کند اور وقت کو ضائع کردیتی ہے، اگر وہ دنیوی تعلیم کے ساتھ ملادی جائے تو تعلیم بھی اچھی ہوگی اور وقت بھی بچے گا۔ علی گڑھ میں دونوں قسم کی تعلیم ملی ہوئی ہے مگر وہ گورنمنٹ کالج نہیں ہے بلکہ اُس کا انتظام و اہتمام خاص مسلمانوں کے ہات میں ہے اور گورنمنٹ کی طرف سے گرانٹ اِن ایڈ ملتی ہے۔ دوسری بات یہ کہ علی گڑھ کالج ایک بورڈنگ کالج ہے جہاں دور دور سے لڑکے آتے ہیں اور اُن کی حفاظت کی جاتی ہے یہی بات ہے جو آپ یہاں اور ہر ایک پراونس میں چاہتے ہیں۔ یعنی ایک مسلمانی اسکول زیر انتظام مسلمانان جس کے لئے گورنمنٹ گرانٹ ان ایڈ مقرر ہو اور جس کے متعلق بورڈنگ ہوس اور ہوسٹل بیرونی طلبہ کے لئے ہوں۔ بہتر تجویز مسلمانوں کے لئے یہ ہوگی کہ مدرسۂ اعظم کو سرکار سے لے کر اُس کو گرانٹ ان ایڈ اسکول کے طور پر قایم کریں، تاکہ وہاں مذہبی تعلیم سکھلانے کا انتظام ہوسکے اور مشکلاتِ حال دفع ہوجائیں۔ اس کے لئے سیلف ہیلپ ضرور ہے۔ میں جانتا ہوں کہ یہاں کے مسلمان مالدار نہیں۔ آیا اس کام کا انجام آپ ہی سے کسی قدر خارجی تائید کے ساتھ خواہ وہ مسلمانوں سے ہو یا دوسروں سے ممکن ہے یا نہیں نہایت غور طلب امر ہے۔ آپ کو مطمئن رہنا چاہیئے کہ جو لوگ اپنی مدد آپ کرتے ہیں گورنمنٹ اُن کی تائید رضا و رغبت سے کرتی ہے یہ امر بہت دشوار معلوم ہوتا ہے، مگر آپ ہی کے زیادہ حوصلہ لوگوں سے جو کوششیں حال میں وقوع میں آئیں اُن پر نظر کرتے یہ امر غیر ممکن نہیں۔ اگر یہ کام کرنے پر آپ آمادہ ہوں تو اس کا وقت یہی ہے، کیونکہ میں سنتا ہوں کہ مدرسۂ اعظم کے لئے نیا مقام لینے کا انتظام ہوچکا ہے اور میں تائید کرتا ہوں کہ آپ جنوبی ہندوستان میں ایک

کالج بنانے کے لئے جیسا سر سید احمد خاں نے شمالی ہند کے لئے بنایا کوئی کوشش اُٹھا نہ رکھیں سچ جانئے کہ یہ امر غیر ممکن نہیں - آپ جانتے ہیں کہ یہاں ہندو اور دوسری اقوام نے کانفرنس کی کامیابی کے لئے آپ کی تائید کی - کیا آپ شک کرتے ہیں کہ جب آپ ویسا اسکول کھولنے کی کوشش کریں جہاں مسلمان لڑکے علم حاصل کرکے موجب افتخار ملک و قوم ہوں تو وہ آپ کی تائید نہ کریں گے۔ یہ بات اُن اقوام سے بعید ہے - آپ کی کوششیں اُن کی جوشیلی ہمدردی کے قابل ہوں گی اور مجھے شک نہیں کہ آپ کو سرمایہ سے امداد ملے گی - بڑی بات یہ ہے کہ پہلے آپ اپنے اسکول کا انتظام اپنے ہات میں لے لیجئے بورڈنگ ہوس اور ہوسٹل بعدہ قایم ہو سکتے ہیں - ایک شخص چند کمرے اور دوسرا علیٰ ہذاالقیاس بنا سکتا ہے اور رفتہ رفتہ مستقل مزاجی سے آپ اپنا کالج یہاں بنا سکتے ہیں - آپ صرف ہاتھ باندھے ہوئے نہ رہیں کہ ہم غریب ہیں مجھے خوف ہے کہ اکثروں کا منشا یہ ہے کہ جو کچھ اُن کو مطلوب ہو گورنمنٹ مہیا کرے یہ غیر ممکن امر ہے مگر مجھے یقین ہے کہ جب آپ اپنی مدد کرنے پر صاف آمادگی ظاہر کریں گے گورنمنٹ بھی خوشی سے آپ کی تائید کریگی۔

جیسا کہ آپ کے عروج کے وقت علوم و فنون کا مقام مشرق تھا ویسا ہی آج کے روز مغرب اُن کا مقام ہے - علاوہ برآں سرکاری زبان انگریزی ہونے سے یہ ضروری امر ہے کہ ابتدا ہی سے یہ زبان سکھلائی جائے تاکہ مغربی لٹریچر اور مغربی علوم حاصل ہوں میں سنتا ہوں کہ مغربی علوم کو آپ کے بہت سے علما بدظنی کی نگاہ سے دیکھتے ہیں - اُن کا یہ دعویٰ ہے کہ جو کچھ مسلمانوں کی کافی تعلیم کے لئے ضروری ہے وہ سب عربی لٹریچر میں موجود ہے - میں امید کرتا ہوں کہ یہ رائے اور خیالات بہت کم اشخاص کے ہوں گے - اگر اُن کی مخالفت خرابی مذہب کے اندیشہ پر مبنی ہے تو میں کہوں گا کہ اسلام کو کوئی اندیشہ نہیں - اسلام کبھی اپنے آپ کو مرنے نہ دیگا، ہمیشہ علما کا ایک طبقہ ہو گا جو اُس کو زندہ رکھے گا - وہ ایسا بڑا مذہب ہے کہ اُس کو ایسے امور میں تبدیل خیالات سے کوئی صدمہ پہنچنے کا اندیشہ نہیں - پس مذہب کے بارہ میں آپ کو خوف کا محل نہیں - آج کل کسی تمدنی صیغہ کی کامیابی کے لئے اعلیٰ درجہ کی تعلیم بذریعہ انگریزی زبان کے ناگزیر ہے - ابتدا ہی سے لڑکوں کو انگریزی اور اچھی انگریزی سکھلانا چاہئے تاکہ اُن کے نشو و نما کے ساتھ اُن کی انگریزی بھی نشو و نما پائے اور اُن کی ترقی کے ساتھ اس کی بھی ترقی ہو۔ یہ بات حاصل نہیں ہو سکتی جب کہ لڑکوں کو انگریزی سکھانے کے پیشتر ایک ورناکلر زبان کے پڑھانے کی ضرورت ہوتی ہے، کیونکہ اُس وقت لڑکا انگریزی جلد شروع نہیں کر سکتا - آپ چاہتے ہیں کہ ہندوستانی کے ساتھ انگریزی پڑھائیں یہ خود ایک سبب ہے کہ آپ اپنا خاص ایک سکول رکھیں یا اقل مرتبہ اُسکا انتظام آپ کے ہاتھ میں رہے تاکہ وہاں نہایت لایق اور مسلم الثبوت اُستاد مقرر کئے جائیں جن کے ذاتی اثر سے لڑکوں کا رویہ درست و اعلیٰ ہو جائے۔

مگر صرف اتنا ہی کافی نہیں، اُس کے ساتھ اُن کی اخلاقی درستگی کا بھی خیال رکھنا چاہیئے اور یہ بات اُس وقت حاصل ہوگی کہ جب وہ بورڈنگ ہوس ہوسٹل یا اور کہیں ذی لیاقت اور ادیب لوگوں کی نگرانی میں رکھے جائیں جہاں وہ اچھے اثر سے گھیرے جائیں اور اُن کا رویہ درست ہو جائے اور اس ذریعہ سے اُن کو ذاتی علم بردباری اعلیٰ خصائل اور عمدہ انسانی خیالات حاصل ہوں اور وہ بُرے خیالات سے بالکل الگ تھلگ رہیں۔ آج کل کی تعلیم میں یہ بات حاصل نہیں اور اسی سبب سے لوگوں میں اچھے بُرے کا تفاوت باقی ہے۔ بُری صحبت بے اعتنائی اور اعلیٰ خیالات کا نہ ہونا اچھی سے اچھی دنیوی تعلیم کو بے کار کر دیتا ہے۔ کوئی لڑکا کیسی ہی لیاقت حاصل کرے جب تک اُس لیاقت کو اچھے طور سے کام میں نہ لائے وہ بالکل بیکار ہو جاتی ہے؛ اس لئے میں آپ کو تاکید کرتا ہوں کہ اس کا انتظام کیجئے۔

جیسا مدارس میں ایجوکیشن کمیشن کی سفارشوں پر جو اہل اسلام سے متعلق ہیں خیال رکھا گیا اور سرکاری مالی حالت کے اقتضا کے موافق اُن کی تعمیل کی گئی کسی اور شہر میں ایسا نہیں ہوا۔ بہ نسبت دوسرے شہروں کے مدراس طلبا کی کثرت کے لحاظ سے سر برآوردہ ہے، اور اس امر میں بھی مدراس کو شرف ہے کہ بہ نسبت دوسری اقوام کے اہل اسلام کے طلبا، کا حصّہ بلحاظ اسکول کو جانے کی حیثیت رکھنے والی آبادی کے زیادہ ہے مگر اس سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ اہل اسلام ہنود سے زیادہ تعلیم یافتہ ہیں۔ کیونکہ عدد مذکورہ بالا میں قرآن خواں لڑکے بھی شامل ہیں۔

اگر اعلیٰ تعلیم کے شعبوں میں اُن کی تعداد کو دیکھیں تو بالکل تشفی بخش نہیں۔ جنوبی کالجوں میں اُن کا حصّہ اُن کی تمام آبادی کے لحاظ سے ایک ثلث سے بھی کم ہے۔ اگرچہ بعض کالجوں میں اُن کی تعداد کسی قدر بڑھی ہوئی ہے مگر اُس میں آدھے لوگ نارتھ ویسٹ پراونس کے ہیں۔

اس قلمرو کی پرائمری اسکولوں میں اگرچہ لڑکوں اور لڑکیوں کی تعلیم میں ترقی معلوم ہوتی ہے مگر لوئر سکنڈری اسکولوں میں تعلیم کی حالت خراب ہے اور ہائیر ایجوکیشن میں رونے کے قابل۔ سنہ ۹۲-۱۸۹۱ء میں اگر۔۔ الڑکے اسکول جانے کی عمر کے تھے تو اُن میں سے ۲۴،۲ لڑکے فیصدی اور لڑکیاں صرف ۲،۸ فیصدی اسکول میں تھیں فقط ۳۲ لڑکے مٹریکیولیشن میں کامیاب نکلے اور ۲ بی اے میں سنہ ۱۸۹۹ء سنہ ۱۹۰۶ء میں ۵۲،۸ لڑکے اور ۴،۱۰ لڑکیاں فی صدی اسکول میں تھیں ۴۲ لڑکے مٹریکیولیشن میں کامیاب نکلے۔ ۷۔ ایف اے میں ۱۱۔ بی۔ اے میں۔ مگر اِن ۱۱ میں صرف ۳ بی۔ اے کی ڈگری انگریزی زبان کے ڈویژن میں کامیاب نکلے۔ پرائمری اسکولوں میں (جن میں خانگی اور مکتبی قرآن خوانوں کی تعداد شامل نہیں) ۴۰۷،۵ لڑکے تھے اور لوئر سکنڈری میں ۱۵۲۹۔ کوئی مسلمان ایم ایل یا فن طبابت یا انجنیری وغیرہ میں پاس نہیں ہوا۔ دارالعلوم مدراس کی سالانہ رپورٹ سے جس میں میسور ترا ونکور و حیدرآباد شامل ہیں معلوم ہوتا ہے کہ

جملہ ۷۲۳۰ گریجوئیٹس میں صرف ۵۷ مسلمان ہیں

۵۷۰۷ بی-اے صرف ۴۳ مسلمان	۳۵ ایم-بی میں ایک بھی مسلمان نہیں
۱۱۶ ایم-اے " ۲ "	۶ ایم-ڈی " " "
۹۰۰ بی-ایل " ۷ "	۷۳ بی-سی-ای " " "
۱۱ ایم-ایل ایک بھی مسلمان نہیں	۲۳۲ ایل-ٹی " " "
۱۵۰ ایل-ایم-ایس میں " " "	

یہ نتیجہ مسلمان لڑکوں کی عدم لیاقت کا نہیں - جن لوگوں نے اُن کو کالجوں میں دیکھا ہے اُن کی ذکاوت پر گواہی دیں گے اور بعض شمالی طالب علموں کو جو ولایت میں بڑی کامیابی حاصل ہوئی اُس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ بڑے سے بڑے ذہین ہندو لڑکوں کے ساتھ مقابلہ کر سکتے ہیں - اس وجہ سے بڑے افسوس کی بات ہے کہ اتنے کم اُن میں سے پرائمری یا سکنڈری درجہ تعلیم سے تجاوز کرتے ہیں - کیا یہ آپ کی قومی خصوصیت کا سبب ہے یا آپ کی بے پروائی کا ؟ - یا یہ اُس خیال کا نتیجہ ہے کہ بغیر دینی تعلیم کے کوئی تعلیم پوری نہیں ہوسکتی یا یہ اپنے علوم و فنون لٹریچر کی طرفداری کی وجہ سے ہے ؟ یا آپ آجکل جو اپنے چاروں طرف تغیرات دیکھ رہے ہیں، اُن کے ساتھ اپنے کو برابر نہیں کر سکتے - بایں سبب کہ آپ کے احکام دینی جو ہر ایک اُن میں کا قرآن یا حدیث یا اجماع پر مبنی ہے بدل نہیں سکتے - ایک مشہور ولایت کا مورخ اس بارہ میں لکھتا ہے کہ اسلام عرب کے واسطے تھا - نہ کہ دنیا کے واسطے، اور وہ بھی چھٹویں صدی کے عرب کے لئے تھا - نہ کہ تمام زمانوں کے عربوں کے واسطے اگر وجوہات بالا مسلم ہوں تو ہندوستانی مسلمانوں کی تعلیم کا مسئلہ جب ہی حل ہوگا کہ دینی اور دنیوی تعلیم منضم ہو اور اسلام کے لٹریچر اور سینس کو باقی رکھ کر مغربی لٹریچر اور سائینس کو بھی اُس کے ساتھ شامل کریں، تاکہ طالب علم زمانہ کی ضروریات پر حاوی ہوں اور دنیا کے نوخیز طالب علموں کی صف میں اپنے مقام پر رہیں - یہی کام علی گڑھ کالج کی تعلیم میں سرسید نے کیا اور اسی وجہ سے اُس کو اس قدر کامیابی حاصل ہوئی - اب وہ وقت ہے کہ اگر اہل اسلام کامیابی اور اعلیٰ خدمات حاصل کرنا چاہتے ہو تو جو کچھ کرنا ہو وہ جلد کریں -

بلحاظ اعداد مذکورہ بالا کیا یہ تعجب کی بات نہیں کہ گورنمنٹ سروس میں اہل اسلام با وصف اپنا پروپوشن پورا رکھنے کے کم خدمات پر ہیں - گورنمنٹ بلحاظ قوم جو سب سے فایق آدمی ہو اُس کو کام دیتی ہے اور اُس کا معیار صرف تعلیمی امتحانات ہیں - بعض بے شک کہیں گے کہ خطا ہماری نہیں، گورنمنٹ کو ہمارے لئے اور کچھ زیادہ کرنا چاہیے میں کہتا ہوں کہ بالفعل گورنمنٹ سے جس قدر ممکن تھا وہ آپ کے لئے ہو چکا اور جب تک آپ اپنی تائید نہ کریں اور اپنے کو

آپ سُدھاریں گورنمنٹ اور کچھ زیادہ کر نہیں سکتی۔ رعایت کرنا دوسری اقوام پر ظلم ہوگا، کیونکہ ہر قوم کے ساتھ گورنمنٹ کو بلا طرفداری کے رہنا ضرور ہے۔ ناظم صیغۂ تعلیمات مدراس کی رپورٹ سنہ ۱۹۰۰ء و سنہ ۱۸۹۹ء میں یہ لکھا ہے "اس صیغہ کی توجہ کئی سال سے مسلمانوں کی تعلیم کی طرف بخصوصیت کے ساتھ اس قوم کی تائید کی گئی، مدت سے سرکاری اسکول اور کالجوں میں اُنھیں آدھی فیس دینے کی رعایت حاصل ہے۔ جو لوگ اُستادی کے لئے تربیت پاتے ہیں اُن کو سرکاری اسکول اور کالجوں میں زیادہ اسکالرشپ سے مدد دی جاتی ہے۔ گرانٹ ان ایڈ کے قانون کے موافق سب مسلمانی مدارس بلالحاظ اعداد غریب طلبا پورا اسکول شمار کئے جاتے ہیں وہاں کے اُستادوں کو دو ماہ کا گرانٹ زیادہ دیا جاتا ہے اور رزلٹ گرانٹ مسلمان لڑکوں کو فیصدی پچیس ہزار ملتا ہے۔ خدمات کی تقسیم میں بھی مسلمانوں کا خیال رکھا جاتا ہے۔ اگر اُن کی تعداد بہ نسبت دوسری اقوام کے اس صیغہ میں کم ہے تو اُس کی وجہ صرف یہ ہے کہ مسلمان درخواست کنندوں میں سرکاری شرائط کے موافق لایق لوگ کم ہوتے ہیں۔" اور ایک مقام پر یوں لکھا ہے "سال گزشتہ کے موافق ۱۰۔۷۔۶ اسکالرشپ مسلمان لڑکوں کے لئے مقرر ہوئے مگر ۹۔۴۔۲ دیئے گئے۔ سوائے اِس کے ۴۔اسکالرشپ بی اے کے لئے جاری ہوئے۔ اِن سب کے علاوہ خاندانی لڑکوں کی اسکالرشپ کے متعلق گورنمنٹ نے گذشتہ پانچ سال میں سالانہ سات سو روپیہ خرچ کر کے ۵۴ لڑکوں کی جن کے والدین کی ماہواری آمد پچاس سے زائد نہ تھی مدد کی۔

اس سال مسلمانی اور مایلا اسکولوں کا خرچ ۲۵۵۲۳۳ روپیہ ہوا اور اُس کا نتیجہ کیا ہے؟ یعنی ۱۱۔ بی۔ اے جن میں صرف ۳ انگریزی زبان کی لینگویج ڈویزن میں پاس ہوئے اور ایک ایف اے میں۔ آپ کے برادران شمالی کے پیش کرنے کے لئے یہ دردناک کیفیت ہے مگر یہ وقت ہے کہ وہ آکر آپ کو ترقی کے راستے بتلائیں وہ آپ کی بہ نسبت خوش نصیب ہیں۔ میں اُمید کرتا ہوں کہ گو مَیں آپ کی مانند غریب نہیں ہیں بہرحال وہ اسکول رکھتے ہیں جیسے مسلمانوں کے واسطے ہونے چاہئیں۔ آپ کو اُن سے سیکھنا چاہئے کہ ایک اسکول جس کا انتظام درست ہو اور جہاں دینی اور دنیوی تعلیم دونوں دی جاویں، بہت ضرور ہے جہاں اُستادوں کے ساتھ قوم اور لڑکے محبت کریں اور اُن کو عزیز رکھیں، جہاں کم سنی سے اچھے طور سے انگریزی پڑھانے کا زیادہ خیال رہے۔ تاکہ طلبا کو مغربی لٹریچر حاصل کرنے کا موقع ملے اور وہ آیندہ قوم کے کارآمد اور قیمتی رکن ہوں، لوگ اُن کا ادب کریں، اور وہ بھی ادب سے باہر نہوں اور جہاں تعلیم یافتہ طلبا اپنے یقینی عزتی مقام سے محبت کے ساتھ اپنے طالب علمی کے زمانہ کو یاد کریں، اور اپنے دارالعلوم اور اُس کے بانی کے لحاظ سے تمام ہندوستان میں پھر کر اپنی قوم کی تائید کریں، اور اپنی مثال دکھلا کر اُن کی اور اُن کی اولاد کی بہتری کا ذریعہ بنیں۔

لوگ کہتے ہیں اور میں جانتا ہوں کہ وہ صحیح بھی ہے کہ یہاں کے مسلمان بے حد غریب ہیں۔ اُس کی وجہ یہ ہے

کہ اُنھوں نے موقع کو ہاتھ سے کھو دیا۔ اگر آپ پورے طور سے ڈوب جانا نہیں چاہتے ہیں تو نہایت ضروری ہے کہ اپنی اولاد کے لئے کچھ کریں، تاکہ وہ اُن فوائد کو جو آپ نے کھو دئے حاصل کریں۔ کیا آپ اپنی رسوم میں خرچ کرنے کے لئے غریب نہیں اور اس خرچ سے آپ کو یا آپ کی اولاد کو کیا نفع ہے؟ کیا آپ کی عزت و وقار اِس سے زائد ہوتا ہے کہ آپ کی مدت حیات تک ایک چکّی کا پتھر آپ کے گلے میں باندھا جاوے تاکہ بعض جاہل احمق آدمی کہیں کہ آپ کیسے بڑے آدمی ہیں۔ اگر آپ کو اپنی تباہ کرنے سے کچھ نفع ہوتا ہے تو ایسا کوئی راستہ نکالئے جو آپ کی اولاد کے لئے فائدہ مند ہو۔ مگر ایک روز کی ناموری اور نمایش کے لئے اپنے سرمایہ کو ضائع نہ کیجیے۔ اگر آپ کی رسوم ضروری ہوں تو اُن کو باقی رکھئے ورنہ وہ خرچ گھٹا دیجئے اور اس روپیہ کو اپنی اولاد کی تعلیم و ترقی میں خرچ کیجئے آپ میں سے کسی متمول شخص کو اس بات کی ابتدا کرنا چاہئے تاکہ دوسرے لوگ اُس کو اختیار کریں آپ کوئی انتظام کر کے ایک تعلیمی فنڈ قایم کیجئے جس میں ہر شخص بقدر استطاعت گو وہ کتنی ہی کم ہو مدد کرے۔ میں دیکھتا ہوں کہ آپ کی درخواست نادار بچوں کو تعلیمی تائید دینے کے لئے بیکار نہیں ہوئی، بلکہ لوگوں نے اُس کو خوشی سے قبول کیا اور میں تم کو یاد دلاتا ہوں کہ بعض غیر اقوام نے تائید کا وعدہ کیا ہے۔ چاہیئے کہ آپکے مالدار لوگ اپنے غریب بھائیوں کی کشادہ دلی سے تائید کریں یہاں نہ سرسید احمد خاں ہیں نہ ایسے ارکین قوم موجود ہیں جو ایک علی گڑھ ثانی جنوبی ہند میں قایم کردیں۔ یہ کام خود آپ کو کرنا چاہیئے اور وہ اُسی وقت ہوگا کہ آپ اپنے اوپر مشقت جھیلیں۔ اگر آپ اب پیچھے ہٹ جائیں تو یہ موقع ابد الآباد تک آپ کے ہاتھ سے نکل جائے گا ایک بڑی قوم کی یادگار یلا امید جاں بری ڈوب جائیگی۔

حضرات۔ آپ لوگ جو دوسرے مقامات ہند سے آئے ہیں اور کانفرنس یہاں ہونی قرار پائی ہے آپ کا دوہرا شکریہ ہم پر واجب ہے۔ میں یہاں کے مسلمانوں کی طرف سے آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں، کہ آپ نے صرف یہاں کانفرنس ہی مقرر نہیں کی بلکہ اتنی دور آ کر اپنی شرکت، تجربہ اور نصیحت سے جس کی نہایت ضرورت تھی مدد کی۔ میں اندیشہ کرتا ہوں کہ علی گڑھ کالج کو واقعی فائدہ پہنچانے کے لحاظ سے ہم آپ کو معقول مدد دینے کی امید نہیں کرسکتے، مگر مجھے یقین ہے کہ آپ کو یہاں آنے سے پچھتانا نہ ہوگا۔ کیونکہ مجھے اُمید ہے کہ یہ اجلاس کانفرنس یہاں کے مسلمانوں کے لئے ایک یادگار رہوگا اور اُن کے جوش کو بڑھائے گا، جس کی وجہ سے آیندہ یہاں کے مسلمانوں میں کامل ترقی ہوگی۔ مجھے آپ سے اُمید ہے کہ آپ اس اجلاس کے ختم ہونے سے پہلے یہ ظاہر کردیں گے کہ اس سے آپ نے کیا فائدے حاصل کئے اور کیا اس قلمرو میں کیا دوسرے قلمرو میں کس قسم کا انتظام کیا جائے جو ہر طرح سے مفید ثابت ہو۔ تاکہ اس سلطنت کے تمام مسلمان

اس کام کی انجام دہی میں اتفاق باہمی مدد دیں۔ آپ لوگوں کی باہمی مدد اور جوش ترقی تعلیم اس قدر عالمگیر ہونا چاہیئے کہ کوئی پراونس، شہر، قریہ، محلہ، گلی، کوچہ اس سے خالی نہ ہو۔ غالباً آپ میں سے بعض لوگوں نے یہ مشاہدہ کیا ہوگا کہ دیمک کا ایک چھوٹا سا کیڑا جو سوئی کی نوک کے برابر ہوتا ہی جب کھانے لگتا ہے تو اپنی برادری کو اپنے ساتھ اس قدر جمع کر لیتا ہے کہ بڑے بڑے تودے بنا کر ایک بڑی چٹان کی صورت پیدا کر لیتا ہی۔ اسی طرح آپ کو بھی چاہیئے کہ اپنی تعلیمی ترقی کے لئے ایسا انتظام کریں جس سے چھوٹی چھوٹی رقمیں کثرت سے جمع ہو کر ایک ایسے خزانہ کی شکل پکڑیں جس سے آپکے کالج اور دوسرے اسی طرح کے کالجوں کی جو ہندوستان کے ہر مقام پر قائم ہو سکیں، سربراہی باآئین شایستہ ہو سکے۔ جو لوگ رقم سے مدد نہیں کر سکتے وہ اپنے وقت اور محنت سے مدد کریں۔ اگر یہاں کا ہر ایک رکن اس بات کا ذمہ لے کہ ہر ایک ڈسٹرکٹ یا شہر یا کوچہ کے لوگوں سے کچھ کچھ وصول کرے اور ایک وقت نہیں بلکہ ہر ماہ میں، تو چند سال کے عرصہ میں بڑا سرمایہ جمع ہو جائے گا جس سے ہندوستانی مسلمانوں کی تعلیمی شکل ہی بدل جا سکتی ہی، اور جس سے سر سید احمد خاں کے ابتدائی ارادہ کو بھی پورا کر سکیں، علی گڑھ کالج کو یونیورسٹی بنا سکیں۔ اور دوسرے مقامات میں بھی ویسے ہی کالج کی جیسا اس محسن قوم نے علی گڑھ میں کھولا ہی بنیاد قایم کر سکیں۔ میری رائے ہی کہ آپ اس کام کے لئے ایک فنڈ قایم کیجئے جس سے ہر پراونس کی اس کی ضرورت کے موافق مدد کی جائے۔

حضرات۔ میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے اس صبر کے ساتھ یہ تقریر سنی۔ میں نے مدراس کے بارہ میں تقریر کرتے ہوئے آپ کا بہت سا وقت لیا۔ مگر کیا مجھے اس کے لئے سبب نہیں تھا۔ مجھے بعض ایسی باتیں کہنا پڑیں جو اکثر صاحبان کو خوش نہیں معلوم ہونگی مگر دوست کا کام نہیں کہ میٹھے الفاظ سے آپ کی خوشامد کرے۔ جو کچھ میں نے کہا صحیح کہا۔ اور ایسا کہنے سے آپکے کام میں مدد کرنا منظور ہے۔ اگر آپ اپنی خود مدد نہ کریں تو اور کوئی مدد دے نہیں سکتا۔ گورنمنٹ کو جو کچھ کرنا تھا آپکے لئے کر چکی اور جب تک آپ نہ بتلائیں کہ گمنامی کی گڑھے میں ڈوبنا نہیں چاہتے جب تک آپ اپنی سستی کو جو آپکا خاصہ ہے دور کریں، جب تک آپ اپنی نمائشی شان و شوکت کی خواہش دل سے خارج نہ کریں اور اپنے خرچ کو جو اپنی ذات پر ہو یا رسوم میں کم نہ کر دیں اور بچت کو اپنی اولاد کی تعلیمی ضروریات میں صرف نہ کریں اور جب تک آپ ایک انتظام کر کے رقم جمع نہ کریں تاکہ آپ کی اولاد کی تعلیم آپکے ہاتھ میں اور آپ کی صوابدید کے موافق ہو میں اندیشہ کرتا ہوں کہ آپ کو اپنی مدد کے لئے گورنمنٹ سے اپیل کرنا بے فائدہ ہوگا۔ اس لئے آپ اپنے وقت کو بیکار بحث میں ضائع نہ کیجئے بلکہ اپنے دلوں کو اس طرف متوجہ کیجئے کہ قوم کی تعلیمی حالت جو ابتر ہو رہی ہی اس کی کیا وجہ ہی اور اس کا کیا علاج ہی، صرف اپنی ذات اور اپنی کوششوں پر تکیہ کیجئے اور اگر ہو سکے جیسا اب تک ہوتا آیا ہے گورنمنٹ آپ کی مدد کرے گی اور اس بات کی سب قدر کریں گے کہ مسلمانان ہند ناکارہ نہیں۔



ہز ہائی نس آغا خاں
صدر اجلاس ہفدہم کانفرنس (دہلی سنہ ۱۹۰۲ ع)

اجلاس شانزدہم

(منعقدہ دہلی ۱۹۰۲ء)

صدر ہز ہائنس ہز سلطان محمد شاہ آغا خاں جی سی آئی ای

حالاتِ صدر

ہز ہائنس نسباً حضرت علی علیہ السلام کی اولاد ہیں جب مصر میں بنی فاطمہ کی حکومت قایم تھی تو اس بارگاہ خلافت کے تکراں آپ ہی کے آبا و اجداد تھے جب خلفائے بنی فاطمہ پر زوال آیا تو آپ کے بزرگوں نے ایران کی سکونت اختیار کی۔ آپ کی دادی فتح علی شاہ قاچار کی بیٹی تھیں۔ اس وقت آپ کے دادا حسن علی شاہ آغا خاں (کرمان) کے گورنر تھے۔ ایران پہونچ کر خاندان قاچار سے پیوند قرابت ہونا ہز ہائنس کے خاندان کے علو مرتبت ہونے کی دلیل مبرہن ہے۔ سیاسی وجوہ کی پیچیدگیوں کے باعث حسن علی شاہ آغا خاں کو ایران چھوڑنا پڑا اور وہاں سے افغانستان ہوتے ہوئے ہندوستان میں آئے۔ سندھ میں جنرل نیپیر کی رفاقت حاصل کر کے جنگ افغانستان اور سندھ میں شرکت کی جنھوں نے گورنمنٹ برطانیہ کے حق میں کارنمایاں انجام دینے کے بعد بمبئی اور پونا میں مستقل طور سے سکونت اختیار کر لی۔ بصلہ حسن خدمات آغا حسن علی شاہ کو معقول وظیفہ ملا؛ ہز ہائنس کے خطاب سے ممتاز کئے گئے جنھوں نے ۱۸۸۱ء میں چوراسی برس کی عمر میں وفات پائی ان کے بعد ان کے سب سے بڑے بیٹے ہز ہائنس آغا علی شاہ جانشین قرار پائے جو صرف چار برس زندہ رہ کر فوت ہو گئے۔ ۱۸۸۵ء میں ہز ہائنس سر سلطان محمد شاہ آغا خاں اپنے باپ کی وفات کے بعد دس برس کی عمر میں ان کے جانشین ہوئے اور اسماعیلیہ فرقہ کے پیشوا کی حیثیت سے مسند ارشاد پر بیٹھے۔ ہز ہائنس کی والدہ نے جو ایران کے نظام الدولہ کی صاحبزادی ہونے کے علاوہ نہایت ذکی، سنجیدہ حالات زمانہ سے باخبر خاتون

تھیں شروع عمر سے ہز ہائنس کی تربیت اور تعلیم پر خاص توجہ فرمائی شفیق اور صاحبِ تدبیر ماں کے آغوش تربیت میں آپ نے عربی، فارسی اور انگریزی علوم میں اعلیٰ قابلیت حاصل کرنے کے علاوہ مردانہ کھیلوں، نشانہ بازی، گھوڑے کی سواری اور ورزش جسمانی پر بھی کافی طور سے توجہ کی۔

ہز ہائنس نہ صرف فرقہ اسماعیلیہ کے مذہبی پیشوا اور سردار ہیں بلکہ ہندوستان کے مسلمان عام طور پر آپ کو سوشیل، پولیٹیکل اور تعلیمی تحریکات میں اپنا لیڈر اور سردار مانتے ہیں۔

ہز ہائنس نے اپنی بلند شخصیت اعلیٰ قابلیت، حسن تدبیر اور اس اثر اور طاقت کی وجہ سے جو آپ کو مشاہیر مسلمانان ہند میں ممیز کئے ہوئے تھے، جب کبھی مذکورہ بالا اغراض سہ گانہ میں قوم کو آپ کی امداد اور رہ نمائی کی ضرورت پیش آئی ہے تو موصوف نے اپنے اثر سے اور اپنے بہترین خیالات سے قوم کو فائدہ پہونچانے میں قوم کی کافی خدمت کی ہے۔ سنہ ۱۹۰۶ء میں نواب محسن الملک مرحوم جب مسلمانوں کا مشہور ڈیپوٹیشن لارڈ منٹو کی خدمت میں لے کر شملہ پہونچے ہیں اور جس نے اس ملک میں مسلمانوں کے درجے اور ان کی اہمیت کے سوال کو ویسرائے کی زبان سے منوا کر اُن کے حقوق نیابت کو تسلیم کرالیا کوئی شبہ نہیں کہ اس جسیم ڈیپوٹیشن کی روح ہز ہائنس ہی کی بلند شخصیت میں مضمر تھی۔

ایک طرف سنہ ۱۹۰۶ء میں انھوں نے مسلمانوں کی سیاسی اہمیت اور طاقت پیدا کرنے میں صرف ہمت کی تو دوسری طرف سنہ ۱۹۱۰ء میں وہ انگلستان سے اپنے ساتھ پیام امید لے کر ناگپور کے اجلاس کانفرنس میں شریک ہوئے اور مسلم یونیورسٹی کے قیام کی کوشش میں ایک لاکھ روپیہ کا گراں قدر ڈونیشن عطا کرکے قوم سے تیس لاکھ روپیہ جمع کرنے کی اپیل کی اور خواہش ظاہر کی کہ قوم اپنی بقا اور زندگی کی خاطر مذکورہ بالا رقم اعلیٰ حضرت ملک معظم کی تشریف آوری ہندوستان سے پہلے جمع کرکے ملک معظم کے دست مبارک سے یونیورسٹی چارٹر حاصل کرنے کی کوشش کرے۔

ہم ناگپور کے اجلاس کانفرنس میں شریک تھے پندرہ برس اس واقعہ کو گذر چکے ہیں کیفیتوں، حالتوں اور خیالات میں انقلاب عظیم کی لہریں دوڑ چکی ہیں، ہز ہائنس کا پیام امید ہاتھ میں لے کر صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب کا انداز خاص میں کھڑا ہونا، اس کو سنانا، پر اثر اور پر جوش فقروں پر جلسہ کا جھومنا اور بہ یک چشم زدن غیرت عمل میں جوش و تموج کا اٹھنا اور سعی عمل و حصول چارٹر مسلم یونیورسٹی میں والہانہ بیتابیاں کانفرنس اسٹیج کے جوش میں اور عمل تاریخی کا ایسا دیباچہ تھیں جس کا منظر اس سے پہلے نہ آنکھوں نے دیکھا اور نہ کانوں نے سنا تھا۔

یہ ایک کرشمہ تھا اس دلچسپی یا دل آویزی یا حسن عقیدت کا جو ہز ہائنس کی ذات سے مسلمانان ہندوستان

کو تھی اس پیام امید نے صورت عمل متحرک تصاویر بن کر ۱۹۱۱ء میں ہندوستان کے ہر گوشہ کو راہ عمل بنا کر قوم میں جان ڈالنے کی کوشش کی جس کی ایک آواز پر تیس لاکھ روپیہ قوم نے مسلم یونیورسٹی کے لئے دیدیا۔ کہتے ہیں کہ جذبات قومی کے مظاہرے پورے طور سے اس وقت ابھرتے ہیں جب کہ سیاسیات یا مذہب کی چاشنی اس کے توام حسن میں حل کر دی جائے لیکن محض تعلیم کے لئے قوائے ملیہ اور قوت مدرکہ نے جس جوش و انہاک کا مظاہرہ ۱۹۱۱ء میں پیش کیا مسلمانوں کی تاریخ عالم محض اکتساب علوم دنیوی کی کوشش میں ایسا کوئی کارنامہ پیش کرنے سے عاجز ہے۔ اور تاریخ کے صفحے اس واقعے سے خالی نظر آتے ہیں البتہ سلاطین اسلام کی علمی فیاضیاں اور طالبان علم کی ہمت افزائیاں یا رجال اسلام میں فرداً فرداً تحقیق علوم وفنون کی کاوشیں اور سحر انوازیاں آج بھی جس قدر تاریخ اسلام میں محفوظ ہیں اور تحقیق مسائل علمیہ میں ان کی جانکاہیاں علمی دنیا کے لئے جو پُر بصیرت شوق اپنے اندر پنہاں رکھتی ہیں اس امنگ اور ولولہ سے دنیائے علم کا یہ دورِ جدید بھی بے مثالی نظر آتا ہے

جوش ملت نے روپیہ تو تیس لاکھ فراہم کر دیا لیکن حالات ایسے پیش آئے کہ اس وقت تو یونیورسٹی چارٹر نہ مل سکا اور اس کے کئی سال بعد یہ دیرینہ آرزو پوری ہوئی لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ مسلم یونیورسٹی کا قیام اس کے مفید نتائج نونہالان اسلام کی زندگی کو جب تک سیرابی اور تازگی بخشتے رہیں گے اس آبیاری کی کوشش میں ہز ہائنس کا نام نامی بابِ علم کا سرنامہ اور طغرائے امتیاز رہے گا۔ نواب محسن الملک مرحوم کی ذات جہاں قوم کے لئے بہت سی خیر و برکات کا موجب تھی وہاں ان کا یہ کارنامہ حیات بھی فراموش کرنے کے قابل نہیں ہے کہ ہز ہائنس کو دارالعلوم علی گڑھ سے دلچسپی اور تعلق پیدا کرنے کا باعث انھیں کا جذبہ کشش تھا محسن الملک نے نہ محض علی گڑھ تحریک کا ہز ہائنس کو سرپرست بنا کر چھوڑا بلکہ اُن کے دل میں حب قومی اور خدمت قومی کی جھک اور لگن پیدا کر دی۔ نتیجہ یہ ہوا اور ہونا تھا کہ قوم کو ہز ہائنس کی توجہ سے فوائد عظیمہ کیا بہ لحاظ پولیٹیکل حالات کے اور کیا بہ لحاظ تعلیمی کیفیت کے حاصل ہوئے اور خود ہز ہائنس کو یہ جزائے عمل ملی کہ وہ ایک محدود فرقہ کی پیشوائی سے ترقی کر کے کل قوم کے پیشوا بن گئے اور ساری قوم نے اُن کی سرداری کے آگے سر نیاز جھکا دیا۔

علی گڑھ میں ہز ہائنس کے متعدد مرتبہ کے ورود مسعود نے تاریخی حیثیت حاصل کر لی ہے۔ انھوں نے طلباء کی امداد میں کالج کی اعانت دائمی میں یونیورسٹی کے جذبے میں نہ صرف خیالات سے مدد کی بلکہ لاکھوں روپیہ اپنی جیب سے دیا اور دوسروں سے دلوایا اور جس دن سے اُن کے ذہن عالی میں خدمت قوم کا خیال جاگزین ہوا ہے اندرون ہندوستان یا بیرون ہندوستان جہاں کہیں بھی ہوں وہ قوم کی اصلاحی کوششوں اور اس کے

ترقی کن وسائل کی تلاش میں مصروف نظر آتے ہیں آل انڈیا مسلم لیگ جو مسلمانوں کے پولٹیکل حقوق کی محافظ ہے اُس کی سرپرستی اُنھوں نے اس طرح پر کی کہ بے دریغ روپیہ لیگ کو اپنے مقاصد میں خرچ کرنے کے لئے مدتوں دیتے رہے۔ ۱۹۰۲ء میں وہ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس منعقدہ دہلی کے صدر منتخب ہوئے۔ اُسی زمانہ میں لارڈ کرزن وائسرائے ہند نے دہلی میں دربار تاجپوشی ملک معظم قیصر ہند منعقد کیا تھا اس تقریب نے دلی کی رونق اور زینت کا جو سماں پیدا کر دیا تھا وہ دید نی تھا راجا اور پرجا سے لے کر دنیا کی مخلوق دلی میں اُمنڈ پڑی تھی مسلمانوں کا تعلیمی دربار کانفرنس کا اجلاس اپنی شان و شوکت ہز ہائنس کی صدارت اور منتخب افراد ملت کی شرکت سے افسردہ قوم کی روح زندگی بنا ہوا تھا۔ قوم کے امرا، علماء، فضلاء کی جماعت کے علاوہ لارڈ بمپرک لارڈ ہاسکل مکس لیچ وزیر خزانہ انگلستان، لارڈ کچنر مشہور سپہ سالار ہندوستان اور پارلیمنٹ انگلستان کے بعض ممبر اس پلیٹ فارم پر صدر محترم کے گرد مثل ہالے کے نظر آتے تھے۔ حاضرین اجلاس کی کثرت، اعیان قوم کا مجمع، ہز ہائنس کے اوصاف ذاتی اور وجاہت ظاہری نے شان اجلاس میں جس دل ربائی کی کیفیت پیدا کر دی تھی آخر علامہ نذیر احمد ضبط کی تاب نہ لاسکے اور صدر ضیا بار کے گرد جھوم کر دالہانہ اور بے تابانہ انداز میں ان کا گیت حقیقت گا نا

آفاقہا گردیدہ ام مہر بتاں ورزیدہ ام
بسیار خوباں دیدہ ام لیکن تو چیزے دیگرے

پچیس برس گزر گئے لیکن اس کیف سے چشم و دل دونوں اب تک خالی نہیں۔

۱۹۱۱ء میں جب دوبارہ ورود شاہی کی تقریب کے پرمسرت موقع پر کانفرنس کا اجلاس دہلی میں ہونا قرار پایا تو ہز ہائنس پھر اس اہم اجلاس کے صدر بنائے گئے لیکن موصوف کی غیر متوقع عدم شرکت کے باعث ہز ہائنس کا خطبہ صدارت نواب عماد الملک بہادر کو سُنانا پڑا یہ دونوں خطبے اپنے اپنے موقع پر نذر ناظرین کئے جاتے ہیں۔

دعا ہے کہ اس مہر درخشاں کی ضیاباری زمانہ دراز تک نور افشاں رہے۔[ف]

خطبہ صدارت

جنٹلمین! میرا پہلا فرض اور خوشی یہ ہے کہ میں آپ صاحبوں کا شکریہ ادا کروں کہ آپ نے مجھ کو اس کانفرنس کا پریسیڈنٹ ہونے کی عزت بخشی۔ اس کرسی پر بیٹھنا ایک ایسا امتیاز ہے کہ ہر مسلمان کے واسطے

[ف] ہز ہائنس کے کچھ حالات صحیفہ زریں مطبوعہ مطبع نول کشور سے لکھے باقی ذاتی مشاہدات ہیں۔

باعثِ فخر ہو سکتا ہے ۔ لیکن آپ نے مجھ کو ایک خاص اعزاز بخشا ہے کہ اس شاہی شہر میں اور تواریخی موقع پر مجھ کو پریسیڈنٹ تجویز کیا ۔ میں اس اعزاز کی بابت آپ صاحبوں کا صدق دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں ۔

چوں کہ آپ صاحبوں نے مجھ کو اپنی طرف سے گفتگو کرنے کا حق عطا کیا ہے لہذا میں بلا تضیع وقت اُس خیال کو ظاہر کرنا چاہتا ہوں جو یقینی ہم سب کے دلوں میں ہے ۔ من جانب محمدن ایجوکیشنل کانفرنس میں مہمانوں اور ڈیلیگیٹوں کا جو کہ دور دراز مقامات سے آئے ہیں خیر مقدم کرتا ہوں اور اُن کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ اس جلسہ میں شرکت کا اعزاز بخشنے کے واسطے اُن صاحبوں نے دور دراز مسافت کی تکالیف گوارا فرمائیں ۔

بالخصوص میں اس مسلمان جلسہ کا شکریہ ان معزز گورنران اور فرماں روایان کی خدمت میں پیش کرنا چاہتا ہوں جنھوں نے اس جلسہ میں شرکت کا وعدہ فرمایا ہے یہ بات ضرور خاص قابل شکر گذاری اور نیز اس کانفرنس کے واسطے باعثِ اعزاز ہے کہ بڑے بڑے مدبران و منتظمان ملک نے باوجود ملکی تردداتِ اور مشاغل کے یہ گوارا فرمایا کہ اس جلسہ میں شرکت فرما کر اپنی دلچسپی ایک ایسی قوم کے مذہبی، قومی اور تعلیمی مسائل سے ظاہر کریں جو اُن کی اپنی قوم نہیں ہے ۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اس بات سے تعجب بھی ہوتا ہے اور نیز مبارک باد دینے کو دل چاہتا ہے کہ منجملہ معزز حاضرین کے ایک صاحب ہی کو یہ خیال پیدا ہوا کہ شان شوکت کے نظارہ کو جو کہ اس مقام سے تھوڑے فاصلہ پر موجود ہے ترک کریں اور اس مقام پر تشریف لائیں ۔ قبل ازیں کبھی ہندوستانی والیان ملک کو اتنے بڑے شان و شوکت کے کام میں شریک ہونے کا اتفاق نہ ہوا ہوگا ۔ نہ کبھی ہم نے سلطنت ہندوستان کی شان و شوکت کو اس طرح پر ایک جگہہ جمع دیکھا ۔ اور نہ کبھی اس شاہی شہر کی پُرانی دیواروں نے اتنے بڑے شاہنشاہ کی تخت نشینی کا جلوس دیکھا ہوگا ۔

آپ کی اس کانفرنس میں محض تشریف آوری ایسے موقع پر جب کہ بہت سی دوسری چیزیں قابل دید ہیں اس بات کا ثبوت ہے کہ ہم صرف اس بات پر بحث نہیں کر رہے ہیں کہ مدارس میں کیا پڑھایا جائے اور کیا نہ پڑھایا جائے بلکہ اہم معاملات زیر بحث ہیں ۔ اگر میں اس کانفرنس کے مقاصد کے سمجھنے میں غلطی نہیں کرتا تو ہم اس بات پر غور کرنے کے واسطے جمع ہوئے ہیں کہ ہم کو اپنی قوم کے مقاصد کیا قرار دینے چاہئیں اور کس طریقہ پر وہ حاصل ہو سکتے ہیں ۔ اس سوال کا صحیح طور پر حل ہونا کوئی چھوٹی بات نہیں ہے بلکہ مسلمانوں کی قسمت کا فیصلہ اسی پر منحصر ہے ۔

اپنی قوم کے مقاصد اور خواہشات کی اصلاح کرنا ایک بہت بڑا کام ہے۔ لیکن اس کام کے انجام دینے کے واسطے ہم مسلمانان ہند کو خاص مواقع حاصل ہیں۔ ہم کو یہ ایک کتنا بڑا فائدہ حاصل ہے کہ ہم ایک ایسی گورنمنٹ کے تحت میں رہتے ہیں کہ جو امیر اور غریب اور مختلف مذہب اور ملت کے اشخاص کے ساتھ یکساں انصاف کا برتاؤ کرتی ہے۔ اس کے علاوہ ہم کو پوری آزادی حاصل ہے کہ اپنی قوم کی فلاح کے واسطے جو تدابیر چاہیں اختیار کریں۔ ہم کو اس بات کا کوئی اندیشہ نہیں ہے کہ اگر ہم تعلیم کی ایسی اسکیم تجویز کریں گے کہ جو گورنمنٹ کی تجاویز کے مطابق نہ ہو تو ہمارے مباحثے بند کر دیئے جائیں گے۔

ہم جانتے ہیں کہ کوئی کتاب اور کوئی علم ایسا نہیں ہے جو ہمارے واسطے سرکاری طور پر ممنوع ہو اور بالآخر ہم کو یہ بھی معلوم ہے کہ ہم کو برٹش سلطنت کے زیر سایہ پوری آزادی ہے کہ جو تدابیر خواہ وہ سوشل ہوں یا اکانومک ہم مفید خیال کریں ان پر انجام تک عمل کریں۔ ہماری دولت سے لالچ پیدا نہیں ہوگا اور نہ ہمارے ترقی علم پر فرماں روایان ملک حسد کریں گے۔ سب سے زیادہ قابل لحاظ یہ امر ہے کہ ہم ایک ایسی سلطنت کے ممبر ہیں کہ جس میں علم اور دولت کے ایسے مواقع ہیں جو ایشیا کے کسی دوسرے ملک میں حاصل نہیں ہیں۔ ہم کو صرف یہ کرنا چاہئے کہ اپنی سمجھ اور قوت کے ذریعہ سے مواقع کا استعمال مناسب کریں۔ یہ حقوق ہمارے ہم مذہبوں کو ٹرکی یا پرشیا میں حاصل نہیں ہیں۔ ان ممالک کی بابت یہ بہ مشکل کہا جا سکتا ہے کہ وہاں تجارت اور صنعت اور نیز آزاد پیشوں کے ذریعہ سے دولتمند ہونے کے مواقع حاصل ہیں ان دونوں ملکوں میں علم اور آزادی خیال کے واسطے قیود اور بندشیں ہیں۔ پس ہم مسلمانان ہند کو لاجواب فوائد حاصل ہیں اور اپنے ہم مذہبوں میں ہماری عجیب پوزیشن ہے۔ بشرطیکہ ہم فوائد سے مناسب طور پر مستفید ہوں اور اپنے فرائض ادا کریں تو ہم کو تمام دنیا میں اسلامی ترقی کا رہنما ہونا چاہئے۔ اس ملک میں ہم کو آزادی ہے کہ اپنی سوسائٹی کے مقاصد کے حصول میں سعی کریں۔ ہم کو آزادی ہے کہ اُن پر مباحثہ اور غور کریں اور ہم کو اندرونی اور بیرونی غنیموں سے امن حاصل ہے۔ ہم بلا اندرونی اور بیرونی خدشات کے اپنی تدابیر کا سرانجام کر سکتے ہیں۔ برخلاف اُس کے ہمارے بھائی بند جو ٹرکی اور پرشیا میں ہیں ان کو سب سے پہلے فوجی تیاریاں اور ڈپلومیٹک انتظامات کی جانب خیال رجوع کرنا ہوتا ہے تاکہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ادہر تو وہ تدابیر ترقی کر رہے ہوں اور اُدہر کوئی غیر لبرل خود مختار یورپین سلطنت اُن کی آزادی کا خاتمہ کر دے اور اس طور پر یکبارگی آئندہ ترقی کے کل مواقع ہاتھ سے نکل جائیں۔ ہم لوگ جو کہ انگلستان کی آزاد حکومت میں رہتے ہیں اپنے

خیالات کے موافق ترقی کرنے کے وہ کل ذرائع رکھتے ہیں کہ جن کی کسی قوم کو ضرورت ہوتی ہے۔

جنٹلمین۔ اب ہم کو اس سوال پر غور کرنا چاہیئے کہ مسلمانان ہند نے اُن مواقع سے کیوں کر فائدہ اُٹھایا ہے کہ جو مشیت ایزدی سے اُن کو حاصل ہیں۔ اس بحث کا ہماری کانفرنس سے خاص تعلق ہے ہم کو شرم اور افسوس کے ساتھ اقرار کرنا چاہیئے کہ اس وقت تک ہم ناکام رہے ہیں۔ ہندوستان میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک کتنے قومی اسکول ہیں کہ جن میں مسلمان لڑکے اور لڑکیاں جدید تعلیم اپنے مذہب کی تعلیم کی ساتھ حاصل کر سکتے ہیں؟ کیا جہاں سو ہونے چاہئیں وہاں ایک بھی اسکول ایسا ہے کہ جس کی ہماری قوم کو ضرورت ہے اور جو ہم قایم کرتے اگر ہم بھی منجملہ ترو تازہ اقوام کے ہوتے۔ بیشک ایک خاص تعداد ایسے مدارس اور مکاتب کی ہے کہ جہاں کلام مجید طوطے کی طرح پڑھایا جاتا ہے۔ لیکن ان مقامات میں بھی اس بات کی کوئی کوشش نہیں کی جاتی ہے کہ ان لڑکوں کی اخلاقی حالت کو ترقی دی جائے یا اسلام کے حقایق دوامی اُن کو بتلائے جائیں بالعموم اوّل تو نماز پڑھی کم جاتی ہے اور اگر پڑھی بھی جاتی ہے تو فی صدی ایک لڑکا بھی نہیں سمجھتا کہ اُس نے کیا پڑھا اور کیوں پڑھا۔

میں ایک مثال اور اس بات کی لیتا ہوں کہ ہم نے اپنے ہم مذہبوں کے ساتھ اپنے فرایض انجام نہیں دئے۔ جو قحط حال میں پڑا تھا اس میں من جانب قوم کے کوئی کوشش اس بات کی نہیں کی گئی کہ مسلمان بچوں کی حفاظت کی جائے یا اُن کو ابتدائی مدارس میں تعلیم دی جائے یا کوئی خاص پیشہ سکھایا جاوے۔ اگر ہماری قوم میں گھن لگا ہوا نہ ہوتا تو اس پبلک فرض کی طرف سے ہرگز غفلت نہیں کی جاسکتی تھی۔

مسلمان سوسیٹی میں بسا اوقات پولیٹکل قوت کے ہاتھ سے جاتے رہنے پر آہ و نالہ کیا جاتا ہے لیکن ہم کو یاد رکھنا چاہیئے کہ فی زمانہ نہ یہ ممکن ہے کہ کسی ایک قوم کے ہاتھ میں قطعاً عنان حکومت اس طرح دے دی جائے جس طرح کسی زمانہ میں مسلمانوں کے ہاتھ میں تھی۔ یہ وہ زمانہ ہے کہ سب کو عام آزادی ہے۔ ایسی حالت میں کسی قوم کا یہ خواہش کرنا کہ کل پولیٹکل پاور اس کے ہاتھ میں آجائے۔ محض بے سود بلکہ امحال ہے۔ کسی منصف مزاج آدمی کو یہ خواہش بھی نہیں ہوتی کہ دیگر اقوام سے نکل کر پولیٹکل قوت اُس کے ہاتھ میں چلی جائے۔ برخلاف پولیٹکل قوت کے اس بات کی خواہش بالکل واجبی ہے کہ صنعت اور فنانس کے میدان میں سب سے آگے بڑھ جائیں۔ کیونکہ یہ نتیجہ صرف اسی حالت میں حاصل ہوسکتا ہے جب دماغی قوت کا استعمال بھی سب سے بہتر کیا جائے۔ مگر اس معاملہ میں بھی ہماری قوم نے

اُس امن وامان، انصاف اور آزادی سے فائدہ نہیں اُٹھایا جو ہم کو برٹش حکومت کے تحت میں حاصل ہے ہم نے صنعت اور تجارت کی طرف سے بھی اسی طرح پہلو تہی کی جس طرح دیگر مواقع کی طرف سے۔

یہ عام غفلت جو تمام کاروبار زندگی کی طرف سے ظاہر کی جاتی ہے ایک اخلاقی بیماری کی دلیل ہے اور میں آج آپ سے یہ درخواست کرتا ہوں کہ اس بیماری کے اسباب پر میرے ساتھ غور فرمایئے میں آپ کا خیال بالخصوص اس بحث کی طرف مبذول کرتا ہوں کہ کیا اس بیماری کے اسباب لازمی قسم کے ہیں جن سے مفر نہیں ہوسکتا یعنی کیا اُن کا تعلق خود ہمارے مذہب سے ہے یا وہ محض اتفاقی اور اکتسابی ہیں اس بیماری کا محض اتفاقی ہونا اور اس کا جزو اسلام نہ ہونا اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام نے نہ صرف ابتدائی پچیس سال میں مابعد ہجرت ترقی کی بلکہ عہد ابو بکرؓ و عثمانؓ عرب سوسائٹی کا اعلیٰ طبقہ پر ہونا بھی یہی بات ثابت کرتا ہے۔ ہم کو یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ جس سوسائٹی کو اسلام نے اعلیٰ طبقہ پر پہونچا دیا اس کی حالت قبل اسلام کیا تھی۔ یہ وہ لوگ تھے جن کی جوانی یا تو مثل قریش امراکے کاہلی اور تعیش میں گذری تھی، یا مثل عوام الناس کے قتل اور غارت گری اور رہزنی میں صرف ہوئی تھی۔ یہ اسلام ہی کا کام تھا کہ یہ لوگ ہیرو ہوگئے اور نہ صرف میدان جنگ میں نامور ہوئے بلکہ کسی صحیح و تندرست قوم کو جو مشکلات معمولی فرائض کے ادا کرنے میں روزمرہ پیش آتی ہیں اُن کے انجام دینے میں بھی سربرآوردہ ہوگئے۔ بحیثیت مجموعی یہ لوگ پابند قوانین و آئین منصف اور کریم النفس تھے اور اپنے قول و قرار کے سچے تھے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مفتوح ایرانی کاشتکاروں نے مفتوح قوم کو نعمت خداداد متصور کیا۔ مابین ۱۷۵۵ء و ۱۸۶۰ء کہ جب کبھی کسی غیر منتظم ہندوستانی ریاست کو زیر کرکے انگریز اپنا قبضہ کرتے تھے تو ہندوستان کے کاشتکاران کو بھی اُسی نظر سے دیکھتے تھے جس نظر سے مسلمان ایران میں دیکھے جاتے تھے ان باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام ایسا مذہب ہے کہ جس زمانہ میں اس کو لوگ بخوبی سمجھتے تھے اور اس پر عمل کرتے تھے اُس وقت اس کا نتیجہ کاہلی نہیں تھا، بلکہ غیر معمولی جوش اور قوم پر جان و مال قربان کرنے کا خیال پیدا ہوتا تھا، اور اُس فرقہ میں جو زمانہ جاہلیت میں محض عیاش امرا شہر مکہ تھے اور یہی لوگ تھے جن کو اسلام کے مصلح اثر نے اپنے ہم قوم اہل عرب کو دوبارہ لالٹی اور جاں نثاری میں ممیز و ممتاز بنا دیا تھا۔ مثلاً دیکھو کہ خالدؓ اور عمرؓ و فاتحان دمشق و مصر کو جب عمرؓ و عثمانؓ نے برطرف کیا تو کیسے صبر و تحمل کے ساتھ ان فاتحوں نے خلفاء کے حکم کی تعمیل کی۔ باوجودیکہ جن ممالک کے وہ گورنر تھے وہ خود اس فوج نے فتح کئے تھے جس کے

وہ جنرل اور رہنما تھے - ان دونوں افسروں کے دلوں میں حکام بالا دست کے احکام کی پابندی کا خیال پختہ طور سے تھا اور یہ لوگ جواب ایسے پابند اصول اور مطیع تھے اپنی جوانی میں مثل دیگر امرائے مکہ محض مکھّے تھے -

ان کل باتوں سے واضح ہوتا ہے کہ کاہلی اور فرض منصبی کی طرف سے غفلت ایسے عیوب نہیں ہیں جو اسلام سے خواہ مخواہ پیدا ہوتے ہوں - پس ہم کو غور کرنا چاہیئے کہ اس کاہلی اور لاپروائی کے اسباب کیا ہیں جو تمام ممالک اسلامی میں محیط ہیں - یہ تغافل اس خیال سے اور بھی تعجب خیز ہے کہ وہ انگلستان کے زیر حکومت بھی نظر آتا ہے' حالاں کہ یہ ایسی سلطنت ہے کہ اس کی رعایا کو تھوڑی محنت سے بہت کچھ عروج حاصل ہو سکتا ہے -کیوں کہ فی زمانہ حقیقی عروج علم و دولت اور دانش میں ترقی کرنے سے حاصل ہوتا ہے اور یہ ایسا عروج ہے جو استقلال کے ساتھ کوشش کرنے سے ہم کو حاصل ہو سکتا ہے -

میرا یہ خیال ہے کہ جو بیماری مسلمانوں کو لاحق ہے وہ کسی ایک سبب سے نہیں ہے بلکہ میں آپ کی اجازت سے چار مختلف اسباب ایسے بیان کروں گا کہ جن کی وجہ سے یہ اخلاقی تغافل مسلمانوں میں پیدا ہوا ہے اور آپ دیکھیں گے کہ جملہ اسباب جن کا میں ذکر کروں گا زمانہ دراز سے اپنا فعل کر رہے ہیں -

سبب اول کا سُراغ لگانے کے واسطے یہ ضروری ہے کہ اسلام کے ابتدائی زمانہ پر نظر ڈالی جائے -حضرت عمرؓ کا قابل افسوس قتل ایسا واقعہ تھا کہ جس سے ایسا صدمہ پہونچا کہ اُس کا اثر اب تک زائل نہیں ہوا -حضرت عمرؓ نہایت نازک وقت پر قتل کئے گئے -جب کہ نہ صرف سلطنت میں وسعت ہوئی تھی بلکہ ہر مسلمان کی ثروت میں ترقی تھی - اور واضح ہو کہ حضرت عمرؓ ہی ایسے شخص تھے جن کا خلوص اور پرہیز گاری اور انصاف اس درجہ کا تھا کہ سب لوگ نہ صرف اُن کی اطاعت کرتے تھے بلکہ دراصل وہ اپنی ذات سے اعلیٰ اور مکمل نمونہ مسلمانی جوانمردی کا تھے - وہ ایسا زمانہ تھا جب کہ ہر نوجوان مسلمان نہ صرف ایک وسیع سلطنت کا دفعتاً مالک ہو گیا تھا' بلکہ اس کی دولتمندی بھی اس کے وہم و گمان سے زیادہ ہو گئی تھی -ایسے نازک وقت میں حضرت عمرؓ کے انتقال سے ایسی چیز مسلمانوں کے ہاتھ سے جاتی رہی جو ہر قوم اور ہر زمانہ میں سوسائٹی کا خواہ قدیم زمانہ کی ہو یا جدید نہایت بیش بہا ورثہ ہوتا ہے یعنی حاکم وقت کی ذات میں اُن صفات کا ہونا جو اعلیٰ درجے کے درویشوں اور مشایخ میں ہوتی ہیں - اس وقت حضرت عمرؓ کی محض عدم موجودگی سے ایسا صدمہ پہونچا کہ اس کی عظمت میں کسی منصف مورخ کو

شبہ نہیں ہوسکتا' خواہ اس کا یہ خیال کتنا ہی پختہ ہو کہ زمانہ پر عام اسباب کا اثر پڑتا ہے نہ کہ ذاتیات کا جب حضرت عمرؓ کے جانشین قتل ہوگئے اور جو خلیفہ اُن کے بعد صدر نشین ہوئے اُن کو مخالفین کے ساتھ مقابلہ کرنا پڑا تو ایک جدید پیچیدگی اسلامی سوسائٹی میں پیدا ہوئی۔ تعجب کا مقام ہے کہ اس پیچیدگی کی طرف اعلیٰ درجہ کے مورخین کا خیال بھی نہیں گیا۔ حالاں کہ جو تغافل اس وقت زیر بحث ہے یہ اسی جدید ایلیمنٹ (element) کا نتیجہ ہے۔ منجملہ صحابیوں اور اعلیٰ درجہ کے پرہیزگار مسلمانوں کے بکثرت ایسے تھے جن کو اس معاملہ میں تذبذب تھا کہ ان کو اس خانہ جنگی میں کس کا ساتھ دینا چاہئیے اور کیا کرنا چاہئیے تاکہ جو نقصان پہونچ رہا ہے وہ اس سے بری الذمہ رہیں۔ اس طرز عمل کی وجہ سے ایک نہایت مخدوش اصول سوسائٹی میں داخل ہوگیا۔ ان میں سے ہر ایک بزرگ نے بجائے اپنا اثر ڈالنے کے خانہ نشینی اختیار کر لی اور اپنی بقیہ زندگی عبادت اور زیارت میں صرف کر دی۔ یہ ایک ایسی مثال ہے جس کو ہر مسلمان سوسائٹی میں اسی وقت سے بعض اعلیٰ درجہ کے مسلمانوں نے پیش نظر رکھنا اختیار کر لیا ہے۔ نہایت صداقت مند اور اعلیٰ اخلاق کے مسلمانوں سے بسا اوقات تم سنو گے جیسا کہ میں نے ہزاروں مرتبہ قسطنطنیہ' قاہرہ' یا زنجبار میں اُن کو کہتے سنا ہے کہ جس وقت تک وہ لوگ اپنی قوت عبادت اور زیارت میں صرف کریں گے اس وقت تک گو اُن سے فائدہ نہ پہونچے' تاہم نقصان بھی نہیں پہونچ سکتا' اور اس طرح پر جو وقت کہ قوم کی خدمت میں صرف ہونا چاہئیے وہ محض عبادت اور زیارت میں صرف کیا جاتا ہے۔

وہ اسی قماش اور خیالات کے لوگ ہیں جن سے میں بالخصوص خطاب کرتا ہوں اور اپیل کرتا ہوں اور نہایت پختہ طور پر میں اُن کے ذہن نشین کرنا چاہتا ہوں کہ مجھ کو اس بات کا یقین کامل ہے کہ اگر وہ اسی طرح الگ الگ رہیں گے تو اسلام کا خاتمہ ہو جائے گا' بہر کیف وہ عالمگیر مذہب نہ رہے گا یعنی ایسا کہ جو تمام دنیا میں پھیلا ہوا ہو۔ ہم لوگ جو اس کانفرنس میں شریک ہیں پرہیزگاروں سے اعانت چاہتے ہیں اور درخواست کرتے ہیں کہ وہ ہمارے ساتھ ہو کر کام کریں اور ہم اُن کو دلی جوش کے ساتھ متنبہ کرتے رہیں کہ اگر وہ اسی طرح اپنا تمام وقت عبادت میں اور اپنا تمام روپیہ زیارات میں صرف کرتے رہیں گے' تو ایک وقت ایسا آئے گا کہ وہ پرہیزگاری جس کی اُن کو آج اتنی قدر و منزلت ہے اُن کی سوسائٹی سے مفقود ہو جائے گی اور اس نازک وقت میں امداد نہ ملنے کی وجہ سے ہماری آیندہ نسلوں میں ایک متنفس بھی ایسا نہ نکلے گا جو یہ جانتا ہو کہ نماز کیوں کر پڑھتے اور زیارت میں (حج) میں کیا خوبیاں ہیں اس موقع پر ہم انھیں اصلی اور سچے پرہیزگاروں سے خطاب اور اپیل کرتے ہیں

اُن کو چاہیئے کہ وہ قدم بڑھا کر آگے آئیں اور اپنے ہم مذہبوں کی ترقی میں وہ حصّہ لیں جو واجب ہے اور اُن کا خاص حصّہ ہے اور یہ کہ وہ اپنے بھائی بندوں اور بچوں کی اخلاقی اور مذہبی تعلیم پر متوجہ ہوں۔ یہ بہت کشاکشی کا زمانہ ہے اور جس قوم کو اپنے گروہ کے اُن اشخاص سے مدد نہ ملے جو نہایت پرہیزگار ہیں اور جن کی اخلاقی حالت اعلیٰ درجہ کی ہے، اُس قوم کو کامیابی کا موقع اتنا ہی کم ہے جتنا اُس شخص کو ہے جو اپنے ہاتھ پیچھے باندھ کر تیرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اسلام پر ایک نازک وقت آگیا ہے، اور اگر اس گروہ کے حضرات ضروریات زمانہ کو نہ سمجھے اور نوجوانوں کی تعلیم و نگرانی پر متوجہ نہ ہوئے تو اسلام کی بقا بھی معرض خطر میں آئے گی۔ اس گروہ کے پرہیزگار مسلمانوں کو سمجھ لینا چاہیئے کہ اب اسلام جس چیز کا متقاضی ہے وہ یہ ہے کہ جو وقت کہ عبادت میں اور جو روپیہ زیارات میں صرف کیا جاتا ہے اس کا ایک حصّہ نوجوانوں کی تربیت میں صرف کیا جائے۔

جن زیارات یا شہادتوں کے سلسلہ میں روپیہ اور وقت صرف کیا جاتا ہے وہ ایسی ہیں کہ جن کا تعلق بعید زمانہ گزشتہ سے ہے، اور اب وہ اس مذہبی نفاق کو تازہ کرتے رہتے ہیں جو فی زمانا اسلام کے مصائب میں سے ہے آنحضرت صلعم اور ابوبکرؓ، عمرؓ اور علیؓ کے کارناموں اور مثالوں سے ان لوگوں کو اس بات کا یقین ہونا چاہیئے کہ ہر مسلمان کا پہلا فرض یہ ہے کہ اپنا وقت قوم کی خدمت میں صرف کرے نہ یہ کہ ایک گوشہ میں بیٹھ کر عبادت کیا کرے۔

ایک دوسرا سبب اختلال کا یہ ہے کہ پردہ سسٹم کی وجہ سے ہماری مستورات کی پوزیشن افسوسناک ہے۔ یہ جو ایک ناسور تقریباً ایک ہزار برس سے اسلامی سوسائٹی کا اندر ہی اندر کام تمام کر رہا ہے اس کی سند اسلام سے یا قرآن شریف سے نہیں ملتی، نہ اس کی مثال ابتدائی دو صدیوں میں ملتی ہے، زمانہ جاہلیت میں اہل عرب اور بالخصوص نوجوان امرائے مکہ نہایت عیش و عشرت کی زندگی بسر کرتے تھے اور قبل فتح کے مکہ کی حالت یہ تھی کہ شوقین طبع فیشن پسند قریشی نوجوان اپنا وقت زیادہ تر نابکار عورتوں کی صحبت میں صرف کرتے تھے، اور اُن کے ساتھ اکثر شادی کرتے تھے۔ غرض کہ قبل فتح مکہ کی حالت بدرجہ غایت شرمناک تھی۔ پیغمبر خدا نے جو احکام صادر فرمائے ان کا نتیجہ نہ صرف یہ ہوا کہ دن دہاڑے جو قبیح افعال بے شرمی کے ساتھ سرزد ہوتے تھے اُن کا انسداد ہو گیا بلکہ بعض حکیمانہ قیود کی وجہ سے غیر مردوں اور عورتوں کا پہلا سا خلا ملا ناممکن ہو گیا۔ یہ قیود ایسی تھیں کہ بلا اُن پر عمل کیئے کوئی سوسائٹی قائم رہنے کی توقع نہیں کر سکتی۔

یہ قواعد بذات خود ضروری اور مفید تھے، مگر اُن کو بڑھاتے بڑھاتے ساسانی بادشاہوں کی دیکھا دیکھی عباسیوں نے موجودہ پردہ سسٹم کی بنیاد ڈال دی، حالاں کہ اس پردہ کے معنی یہ ہیں کہ گویا قوم کا نصف حصہ مستقل طور پر مقید اور غلامی کی حالت میں رہتا ہے۔ تم ایسی ماؤں کے بچوں سے ترقی کی امید کیوں کر کر سکتے ہو جنھوں نے شرکت تو درکنار موجودہ زمانہ کے آزاد مراسم ملاقات کو دیکھا ہی نہیں۔ اب صرف دو صورتیں ہیں یعنی یا تو یہ خوفناک ناسور جو تیسری اور چوتھی صدی ہجری میں بڑھا ہے کاٹ کر علیحدہ کر دیا جائے، ورنہ قوم کی عورتوں کے باستقلال زیاں کی وجہ سے تمام سوسائٹی میں زہر سرایت کر جائے گا اور باعثِ ہلاکت ہوگا۔ جس طرح پر پردہ اب کیا جاتا ہے اس کا وجود پیغمبر خدا کی وفات کے بعد عرصہ تک نہیں تھا اور وہ داخل اسلام نہیں ہے بعد جنگ بدر اور حنین کے جو دو بڑی لڑائیاں ہوئیں وہ جنگ قادسیہ اور یرموک ہیں، اور جس خوبی کے ساتھ ان لڑائیوں میں مسلمان عورتوں نے مجروحین کی خدمت کی اس سے ہر منصف مزاج آدمی کو ثابت ہوگا کہ اس طرح کا پردہ اصحاب کے وہم وگمان میں بھی نہ تھا۔ ہم لوگوں نے جو ایک ایسی رسم قبیح کو اختیار کر رکھا ہے جو اول عباسیوں نے ایرانیوں سے لی تھی وہ اس وجہ سے ہے کہ ہم لوگ ابتدائی زمانہ کے اسلام سے ناواقف ہیں، اور یہ ناواقفیت موجودہ زمانہ کے حیرت انگیز واقعات میں سے ہے۔

جن دو اسباب کا قبل ازیں ذکر کیا گیا ہے وہ اسلامی سوسائٹی کا گلا گھونٹنے کے واسطے کافی تھے، مگر مزید براں خاندان عباسیہ نے نفسانیت کی ایک ایسی مثال قایم کی جس کا تواریخ اسلام پر بہت بڑا اثر پڑا ہے۔ پیغمبر خدا کے یہ ناقابل رشتہ دار خاندان بنی امیہ سے جن کی اطاعت وہ قبول کر چکے تھے اور جن سے بارہا انھوں نے لڑائی میں زک اٹھائی تھی بوجہ بنی امیہ کے اعلیٰ قابلیتوں کے حسد رکھتے تھے اور اسی وجہ سے انھوں نے خراسانیوں سے جو اسلام کی فتوحات کے دائرہ میں تازہ داخل ہوئے تھے میل کر لیا، اور اپنے خاندان کی تعریف میں ہزارہا روایات اور احادیث اختراع کر کے اُن لوگوں کو جو اسلام کی آزاد اور ڈماکریٹک اسپرٹ سے ناواقف تھے بہکا دیا اور ان ساتھیوں کی مدد سے خاندان بنی امیہ کو زیر کیا۔ یہ دغا بازی ذاتی افزائش کی غرض سے کی گئی، اور چونکہ اس کا اظہار ایک ایسے خاندان سے ہوا جس کو پیغمبر خدا سے قرابت تھی، لہٰذا اس سے پایا جاتا ہے کہ اپنے ذاتی یا خاندانی مقاصد کے حصول کے لئے مسلمانوں نے اکثر اوقات اپنی سلطنت، قوم یا بادشاہ کو قربان کر دیا ہے۔ کیوں کہ جو لوگ بالطبع پرہیزگار نہیں ہوتے اُن کے واسطے یہ آسان بات ہے کہ اپنے نفع کے مقابلہ میں قوم کے نفع کو بھول بیٹھیں۔

چوتھا سبب اس لاپروائی اور کاہلی کا جو زیر بحث ہے بلاشبہ مسئلہ جبر و تقدیر ہے۔ کوئی منصف مزاج آدمی جس نے کلام مجید پڑھا ہے اس بات میں شبہ نہیں کر سکتا کہ اس کے بموجب انسان آزاد اور بااختیار ہے۔ لیکن ابوالحسن اشعری جس کے عالم، پرہیزگار اور قابل ہونے میں مطلق شبہ نہیں کیا جا سکتا۔ بدقسمتی سے غلط راستہ پر پڑ گیا، اور اپنی قابلیت کا غلط استعمال کر کے اسلام پر وہ اثر ڈال دیا جس کی وجہ سے سعی کرنے کی تحریص نہیں ہوتی اور یہ سبب منجملہ اُن خاص اسباب کے ہے جن کی وجہ سے موجودہ زمانہ کے اسلام میں ترقی کی اسپرٹ مفقود ہے جبر و اختیار کے مسئلہ پر دوسری صدی ہجری کے آخر تک مباحثے شروع نہیں ہوئے۔ اگر یہ معاملہ اسلامی دنیا کے روبرو کسی ایسے خلیفہ کے عہد میں آیا ہوتا کہ جو خوش خصلت ہوتا اور جس کی تمام بلاد اسلام میں وقعت ہوتی اور جس کی پرہیزگاری اور ایمان میں شبہ نہ ہوتا (مثلاً جس طرح کہ نیک اور قابل پیروی عمرؓ بن عبدالعزیز تھے) تو حکمیہ طور پر یہ فیصلہ کر دیا جاتا کہ انسان بااختیار ہے اور یہ بات ہمیشہ کے لئے طے ہو جاتی۔ لیکن بدقسمتی سے اس کلام کے سچے مسئلہ کا حامی مامون الرشید کا ایسا آدمی ہوا۔ کیفیت یہ ہے کہ مامون کے عجیب خیالات اور اس کا جو انوکھا انداز بعض اصول شریعت کے معاملہ میں تھا اُن کی وجہ سے پرہیزگار مسلمان اس کو شبہ کی نظر سے دیکھتے تھے، اور صرف ایسے شخص کا حامی ہونا اس بات کے واسطے کافی تھا کہ نیک اور پرہیزگار مسلمان ان لوگوں کی طرف سے بدظن ہو جائیں جو سمجھتے تھے کہ انسان کا بااختیار ہونا اسلام کے اصل اصول میں سے ہے اور کسی ایسی سوسائٹی کو کبھی کامیابی نہیں ہو سکتی جو تقدیر کی اس درجہ پابند ہو اور اس بے اختیاری سے جو نتائج نکلتے ہیں اُن کو قبول کرے۔

یہ رواج ہو گیا ہے کہ اسلام کی تباہی کو چنگیز اور جملہ تاتاریوں سے منسوب کیا جائے۔ مگر میری عاجزانہ رائے میں پہلا سبب عباسیوں کی خراب مثال خود غرضی کی ہے۔ دوئم موجودہ پردہ سسٹم جو مہلک ہے اور مستورات کی دماغی ترقی کا مانع ہے۔ تیسرا سبب یہ ہے کہ اعلیٰ درجہ کے پرہیزگار اور نیک سیرت مسلمان برابر خاموشی کے ساتھ گوشہ نشینی اختیار کر کے عبادت میں مصروف رہے آخری سبب مسئلہ تقدیر ہے، جس کے باعث تباہی نازل ہوئی، جو رائے میں نے ظاہر کی ہے یہی رائے بہت سے ذی علم اشخاص کی ہے کہ جنھوں نے ان معاملات پر غور و خوض کیا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ میری رائے میں یہ چار اسباب ہیں جن کی وجہ سے مسلمان سوسائٹی دماغی اور اخلاقی لحاظ سے موجودہ پستی کی حالت پر پہنچ گئی ہے۔ اگر اس بات کا اندازہ کرنا ہو کہ ہماری پستی کس درجہ کی ہے تو یہ اس طریقہ سے ہو سکتا ہے کہ عام مسلمانوں کی سمجھ بوجھ کا مقابلہ ایسے ممالک یورپ

سے کیا جائے جو سب سے پست ہیں یعنی جس میں اسلاف اقوام رہتی ہیں۔ جو میلان تنزل کی طرف ہے اگر اس کو روکا نہ گیا تو اندیشہ ہے کہ موجودہ زمانہ میں جو ہماری قوم کے لایق ترین اور ذکی الطبع اشخاص ہیں ان کی تربیت اس طور کی ہو گی کہ وہ اسلام کی خوبیوں سے محض بے خبر رہیں گے، اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہماری قوم میں جو لایق ترین اشخاص ہوں گے وہ ہم سے جدا ہو جائیں گے، جس کی وجہ سے اُن میں اسلامی خوبیاں مثل پختہ مزاجی، دیانت اور ایثار نفسی کے نہ ہوں گی، جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ سوشیل اور دماغی ترقی کے رہنما اشخاص ان اوصاف سے مبرا ہوں گے جو مستقل ترقی کے واسطے لازمی ہیں۔ پس جو گریہ وزاری ہم قوم کی تباہی پر کرتے ہیں، اگر وہ صدق دل سے ہے تو ہم کو چاہیے کہ اُن کو اس حالت سے نکالنے کے واسطے متفق ہو کر کوشش کریں اور اس کوشش میں سب سے پہلا اور سب سے مقدم کام یہ ہے کہ اب ایک یونیورسٹی قایم کرنے کی کوشش کی جائے۔ یہ یونیورسٹی ایسی ہو کہ جہاں علاوہ علوم جدیدہ کے نوجوانوں کو یہ بھی بتلایا جائے کہ ان کا زمانہ گزشتہ کیسا باعظمت تھا اور اُن کا مذہب کیسا ہے، اور وہ یونیورسٹی ایسی جگہہ ہو کہ جہاں طلبا رہیں اور جہاں مثل اکسفورڈ کے کیرکٹر پر بہ نسبت امتحانات کے زیادہ توجہ کی جائے۔ علاوہ ازیں یہ بھی خیال رکھنا چاہیے کہ مسلمانانِ ہند کو اس بات کا جوازاً حق حاصل ہے کہ اُن کے ہم مذہب جو ٹرکی، پرشیا، افغانستان اور دیگر ممالک میں ہیں، ان کی دماغی ترقی کی طرف متوجہ ہوں اور اُن کو مدد دینے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ علی گڑھ یونیورسٹی گویا مسلمانوں کا اکسفورڈ بنا دیا جاوے کہ جہاں لائق ترین مسلمان طلبا بھیجے جائیں، اور نہ صرف اس غرض سے کہ علوم جدیدہ حاصل کریں، بلکہ دیانت اور ایثار نفسی بھی سیکھیں جو پہلی صدی کے مسلمانوں میں پائی جاتی تھی۔ صاحبو یہ صرف میری رائے نہیں ہے بلکہ مسلمانانِ ہند کے خیالات کے جو اعلیٰ درجہ کے رہنما ہیں اُن سب کی یہی رائے ہے کہ ایسی یونیورسٹی ہماری گئی ہوئی عظمت کو تازہ کر دے گی۔ اس میں تو کوئی شبہ ہو ہی نہیں سکتا کہ یہ نسخہ کارگر ہوگا البتہ اس کی تیاری میں شک ہے۔ سوال یہ ہے کہ موجودہ زمانہ کے مسلمان اس قدر کوشش گوارا بھی کریں گے جتنی ایسی یونیورسٹی قایم کرنے کے واسطے ضروری ہے۔ کیا نفس کشی اور اسلام کے فائدہ پر ہمہ تن متوجہ ہو جانے کا مادہ جو اوایل زمانہ کے مسلمانوں میں پایا جاتا تھا ہم میں سے اس قدر مفقود ہو گیا ہے کہ اپنی دولت کا ایک حصہ اس بڑے کام کے واسطے علیحدہ نہیں کر سکتے؟ ہم کو یقین ہے کہ اس یونیورسٹی کے قایم کرنے سے ہم اسلام کے زوال کو روک سکتے ہیں، اور اگر ہم ایسے مقصد کے حصول کے واسطے بھی بلا خیال ذاتی نفع کے کوشش نہیں کر سکتے، تو کیا مجھ کو یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ ہم کو در اصل اس بات

کی پرواہ ہی نہیں ہے کہ مذہب اسلام زندہ ہے یا مردہ۔

حضرات! آپ سب صاحبوں سے جو اس وقت میری تقریر سن رہے ہیں، میں استدعا کرتا ہوں کہ نہ صرف اپنا روپیہ بلکہ اپنا وقت اور محنت اس بڑے کام کے انجام میں صرف کریں اور اُن لوگوں سے جو بہ پابندی احکام دینی بڑی بڑی رقمیں راہ خدا میں صرف کرتے ہیں، میں بالخصوص نہایت زور کے ساتھ عرض کرتا ہوں کہ اس بات پر غور فرمائیں کہ آیا احکام اور سنت رسول کا اتباع کس طریقہ سے زیادہ ہوگا، اپنے مسلمان بھائیوں کی مدد کرنے سے یا زیارات اور ایسے عرسوں کے کرنے سے جن میں زر کثیر صرف ہوتا ہے۔

جس رقم کی ہم استدعا کرتے ہیں وہ ایک کروڑ ہے۔ کیونکہ ہم ایک ایسا انسٹی ٹیوشن قایم کرنا چاہتے ہیں کہ جس سے اتنے اہم کام کا ہر انجام ممکن ہو۔ ہم چاہتے ہیں کہ ایسا انتظام کریں کہ مسلمان نوجوانوں کو نہ صرف بہترین تعلیم دی جاسکے بلکہ تربیت بھی اتنی عمدہ ہو کہ جتنی دنیا کے کسی ملک میں ممکن ہے۔ ہم نہیں چاہتے کہ اگر کوئی مسلمان طالب علم علم کے یا صنعت وحرفت کے کسی صیغہ میں اعلیٰ درجہ حاصل کرنا چاہتا ہو تو وہ آیندہ بھی انگلستان یا جرمنی جانے پر مجبور رہو۔ نہیں ہم چاہتے ہیں کہ علی گڑھ ایسا دار العلوم ہو کہ اس کی اتنی ہی قدر ومنزلت کی جائے جتنی برلن، اکسفورڈ، لیپزک یا پیرس کی کی جاتی ہے اور ہم یہ چاہتے ہیں کہ اسلامی علوم کی جو شاخیں مرجھاتی جارہی ہیں اُن کو تر وتازہ کرکے علوم موجودہ کے دائرہ میں بذریعہ مسلمان علماء کے داخل کیا جاوے۔ سب سے زیادہ ہم کو جس بات کی خواہش ہے وہ یہ ہے کہ اپنی قوم کے واسطے اخلاقی اور دماغی ترقی کا مرکز قرار دیں، اور وہ ایسا مرکز ہو کہ جہاں سے روشنی اور ہدایت کی شعاعیں تمام مسلمانان ہند میں پھیلیں بلکہ ہندوستان کی باہر تک جائیں، اور جو ہمارے پیارے مذہب کی خوبی اور صفائی اور انصاف کا اعلیٰ نمونہ دنیا کو دکھلا سکتے ہیں۔

حضرات! کیا آپ خیال کرتے ہیں کہ اسلام کی عظمت کو تازہ کرنے کے واسطے ایک کروڑ روپیہ زیادہ ہے؟ اگر آپ کو واقعی اس برتر مذہب کی پروا اور چاہ ہے جس کا آپ کلمہ پڑھتے ہیں، تو بے شک آپ اس قدر صرف بھی گوارا کرسکتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر اس زمانہ کے مسلمان اپنا فرض اس طرح ادا کریں جس طرح اول صدی کے مسلمانوں نے کیا تھا، تو ایک سہ ماہی کے اندر آپ اس قدر روپیہ اسلام کو معرض زوال سے نکالنے کے لئے جمع کرسکتے ہیں آپ یہ خیال کریں کہ ہندوستان میں ساٹھ ملین مسلمان ہیں اور منجملہ اُن کے کم ازکم دس ملین یعنی ایک کروڑ ایسے ہیں کہ ایک روپیہ فی اسم دے سکتے ہیں۔ ہر مسلمان خاندان کے مورث اور

سرغنہ سے ہم ایک روپیہ طلب کرتے ہیں حالاں کہ ہم کو معلوم ہے کہ ان میں ایسے بھی ہیں جو ایک ہزار بلکہ دس ہزار بآسانی سے دے سکتے ہیں۔

حضرات! یہ واقعات قابل لحاظ ہیں۔ اگر ہمارا مقصد پورا نہ ہوا تو اس کی یہ وجہ سمجھنا چاہئے کہ تقلید کی وجہ سے اصل پرہیزگاری مفقود ہوگئی اور سمجھنا چاہئے کہ گو ہم دین اور پیغمبر کی ظاہرا توقیر کرتے ہیں مگر یہ سب زبانی باتیں ہیں اور اتنی تھوڑی زحمت بھی عظمت دین اسلام کی تجدید کے واسطے گوارا نہیں ہے۔





آنریبل مسٹر جسٹس بدر الدین طیب جی

صدر اجلاس ہفدہم کانفرنس (بمبئی سنہ ۱۹۰۳ ع)

اجلاس ہفدہم

(منعقدہ بمبئی ۱۹۰۳ء)

صدر آنریبل جسٹس بدرالدین طیب جی مرحوم بیرسٹرایٹ لاء ریئس بمبئی

حالاتِ صدر

بدرالدین طیب جی کے بزرگ عربی نژاد تھے آپ کے اسلاف نے ہندوستان پہونچ کر پہلے کھمبائت اس کے بعد بمبئی میں سکونت اختیار کی۔ اس خاندان کا آبائی پیشہ تجارت تھا۔ چنانچہ آپ کے والد طیب جی بھائی میاں بھی اپنے زمانہ کے بڑے تاجروں میں شمار ہوتے تھے جن کا رشتہ تجارت انگلستان اور فرانس سے وابستہ تھا۔

بدرالدین طیب جی ۱۸۴۴ء میں پیدا ہوئے۔ کھاتا پیتا فارغ البال گھر تھا۔ اوائل عمر سے ان کو عمدہ تعلیم و تربیت دینے کی کوشش کی گئی۔ ابتدائی اور ثانوی تعلیم سولہ برس کی عمر تک بمبئی میں ہوتی رہی جس کے بعد آپ انگلستان روانہ ہو گئے۔ ۱۸۶۷ء میں انھوں نے بیرسٹری کی ڈگری لی مسلمانان ہندوستان میں طیب جی پہلے طالب علم تھے جو حصول تعلیم قانون کے لئے انگلستان بھیجے گئے تھے جب وہ بیرسٹر بن کر ہندوستان واپس ہوئے تو انھوں نے ہائی کورٹ بمبئی میں پریکٹس شروع کی اور تھوڑے ہی دنوں میں وہ اپنی غیر معمولی ذہانت قانونی قابلیت سنجیدہ اور پرزور قوت گویائی کی بدولت کامیاب پیشہ وکالت کے متدرر رکن تسلیم کئے جانے لگے۔ ان کی اس شہرت نے ۱۸۹۵ء میں عدالت العالیہ ہائی کورٹ بمبئی کی معزز پنج پیران کو جگہ دی جو فاضل اور ماہر قانون جج کے علاوہ نکتہ سنج و نکتہ شناس واضع بھی ثابت ہوئے جنھوں نے بڑی عزت اور اعلیٰ درجہ کی قابلیت کے ساتھ اس بڑے عہدے کے فرائض انجام دیئے۔

ان کے دل میں بدو شعور سے اپنے خاندان اور کنبے کی تعلیمی ترقی اور تمدنی اصلاح کے علاوہ قومی اور ملکی خدمت کا بھی ولولہ تھا چنانچہ طیب جی فیملی کی موجودہ تہذیب و شائستگی اور علمی ترقی کی شہرت جس طرح مرحوم کی کوششوں کا ثمر ہے۔ اسی طرح مغربی ہندوستان کے مسلمانوں کو خصوصاً بمبئی کے شریف گھرانوں کو ان کی تعلیمی اور معاشری اصلاح کی متواتر ترغیبات سے بہت کچھ فائدہ پہونچا ہے۔

۱۸۸۲ء میں مرحوم نے ملکی پالٹیکس میں حصہ لینا شروع کیا۔ اسی زمانہ میں آپ بمبئی کی مجلس واضعان آئین وقوانین کے ممبر ہوئے۔ اس وقت کے گورنر سر جیمس فرگسن نے بارہا مسٹر طیب جی کی قابلیت اور ان کی عمدہ تقریروں کی تعریف کی ۱۸۸۷ء میں ہندوستان کی سب سے بڑی ملکی مجلس کی صدارت ان کو پیش کی گئی اور نیشنل کانگریس کے صدر منتخب کئے گئے مسلمانوں میں سب سے پہلے طیب جی نے کانگریس کی صدارت کا عہدہ قبول کیا تھا۔

مسلمانان بمبئی کی سوشل پولٹیکل اور تعلیمی مشکلات کی رہبری اور رہنمائی کے لئے انھوں نے انجمن اسلامیہ بمبئی کی بنیاد رکھی جس کے وہ خود زمانہ دراز تک پریسیڈنٹ رہے۔ اس انجمن نے مسلمانان صوبہ بمبئی کی رہنمائی کے اہم فرائض انجام دیئے اور انجمن نے اپنی نامور اور باعزت اراکین کی شمولیت اور اثر سے ہندوستان میں نمایاں شہرت حاصل کی بمبئی کے مشہور ریلوے اسٹیشن وکٹوریہ ٹرمنس کے متصل انجمن اسلام کی خوش نما اور خوبصورت عمارت طیب جی کی توجہ اور کوشش کی یادگار رہی جو اپنے دل کش طرز تعمیر کے لحاظ سے بمبئی کی ان رفیع الشان عمارتوں کی فہرست میں شامل ہے جنھوں نے بمبئی کی شہرت اور دل کشی میں چار چاند لگا دیئے ہیں۔ انجمن سے متعلق ایک کتاب خانہ اردو فارسی انگریزی میں ہے۔ ایک ہائی اسکول چند مڈل اسکول اور مکاتب ہیں۔

افسوس کہ ان کے بعد بمبئی میں دوسرا طیب جی نہ پیدا ہوا اور انجمن کا اسکول جس حد تک انھوں نے چھوڑا تھا اس سے آگے ترقی نہ کر سکا۔

ہندوستان کے دوسرے حصوں میں جہاں قومی تعلیم اور قومی تحریکات کے نشو و نما کے لئے قدم قدم پر عدم حصول سرمایہ کی مشکلات حائل ہیں بمبئی کے مسلمانوں کی دولت مندی اور فارغ البالی ضرب زدن ہیں قومی بہبودی اور جمعیت خاطر کے بہت سے انسٹی ٹیوشن موجود کر سکتی تھی لیکن اوقات عیش و طرب اور قلوب پر نشاط اس درد کی دوا نہیں ہیں۔

جب تک بے خبری میں باخبری کا عالم، سوز کے ساتھ ساز، جب قومی کا جذبہ اور اس جذبہ کی کسک دل میں نہ ہو آشفتگی خاطر کے سامانوں میں اسلوب اطمینان کا فراہم ہونا معلوم۔

اس سے انکار نہیں کہ بمبئی کے حامیان تعلیم اور مخیر ارباب ملت نے قومی تعلیم اور قومی بہبودی کے مسائل میں ہمیشہ فیاضی اور خیالات عالی کے اظہار میں پس و پیش نہیں کیا بلکہ کئی ایک موقعوں پر مسلمانوں کی تعلیم کے واسطے لاکھوں روپیہ کی دولت گورنمنٹ کو سونپ دینے میں فیاضی اور علو ہمت کا ثبوت دیا ہے لیکن اس سے وہ فوائد قوم کو نہیں پہنچے جن کے پہنچنے کی توقع ہے جو خود اپنے نظام عمل کے ماتحت ہونے کی صورت میں وقوع پذیر ہو سکتی تھی۔

علی گڑھ کی تو خیر ایک مرکزی حیثیت ہے جس کی مثال شاید غیر موزوں ہو لیکن پنجاب میں انجمن حمایت اسلام کو دیکھو جس میں آج پنجاب کی بڑی سے بڑی شخصیت جذب نظر آتی ہے لیکن اس کی بنیادی تاریخ پر نظر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آج جس کے کام کی وسعت ہمہ گیری اور پھیلاؤ نے پنجاب کے تمام مسلمانوں کو اپنی پناہ میں لے لیا ہے چالیس سال قبل چند شکستہ دلوں کی کوشش حب قومی اور ایثار نفس کا نتیجہ ہے۔

پنجاب کی پھر بڑی مثال ہے۔ اس سے اتر کر آگرہ اور اٹاوہ جاؤ جہاں غریب مولوی بشیر الدین اور مولوی سعید احمد کے کاموں کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ ان تہی دست اور بے مایہ لوگوں نے تعلیم کے جو قصر و ایوان بنا کر کھڑے کر دیئے قوم کی فراغت اور فارغ البالی کے زمانے میں بھی شاذ و نادر اس ہمت اور ہمدردی کی مثالیں ملتی ہیں۔ یہ سامان اور یہ اسباب درد دل پیدا کرتا ہے۔ محض روپیہ اور دولت سے جنس نہیں خریدی جا سکتی۔ جہاں دل میں سوز اور قلب میں حرکت نہ ہو سمجھ لو کہ مدت زندگی کی یہ آخری منزل ہے۔ قوم کی پستی اور پستی کے ساتھ روپیہ کا سوال نہیں ہے۔ سوال ہے ان قوتوں کے ضعیف ہو جانے کا۔ اور ان اسباب کے منتشر ہو جانے کا جن کی قومی تعمیر کے لئے ضرورت ہوتی ہے۔ وہ قوتیں کیا ہیں؟ اپنی قومی حالت کا احساس صحیح۔ و زمانہ شناسی کے ساتھ فرض شناسی۔ عملی پہلو کے لئے مجموعی خیالات کی قوت بغیر اس سامان کی فراہمی کے آخر جہاں سرمایہ اور دولت کی کٹ پتلیاں موجود ہیں وہاں کیا ہو رہا ہے۔ انھوں نے قومی ترقی کے بنیادی اصول میں جن پر قومی ایوان کی تعمیر ہو رہی ہے کتنی اینٹیں ایسی رکھی ہیں جو اس وزن کے سنبھالنے کی قوت رکھتی ہیں۔ بمبئی کے بازار میں قومی تعمیر کے لئے جہاں تک مادی امداد کا سوال ہے یہ مصالحہ اس افراط سے فراہم ہے کہ اگر وہاں قومی تعمیر کے لئے خاص طبعتیں اور حقیقت شناس قلب ہوتے تو بمبئی بڑا مرکز احیاء قومی کا بن سکتی تھی۔ مگر

عاشق کہ شد کہ یار بحالش نظر نہ کرد
اے خواجہ درد نیست وگرنہ طبیب ہست

زبان قلم نے ایک دوسری لے میں فریاد شروع کر دی۔ غرض جسٹس طیب جی کے سوانح

حیات میں طبقۂ ذکور کی اصلاح تعلیم و تربیت کی کوششوں کے علاوہ طبقۂ نسواں کی فلاح کے سامان کا بھی کافی حصہ نظر آتا ہے۔ انھوں نے صنفِ نازک کے مسئلہ تعلیم پر اس وقت توجہ کی جب کہ اس مسئلہ کا قوم میں وجود تک نہ تھا۔ انھوں نے اپنی قوم کے طبقۂ نسواں کی عام جہالت اور اس کی زندگی کی کس مپرسی پر سب سے پہلے آواز بلند کر کے اپنے خاندان کی تعلیم پر توجہ کی اور قوم کو ان کے عواقب اندیشانہ فرض کی لاعلمی سے آگاہ کر کے اس کے نتائج بد سے خبردار کرنے میں قوم کے خیالات کی مطلق پروا نہ کر کے لوم ولائم سے مطلق نہ ڈرے۔ انھوں نے ایک اور مفید کوشش اس صورت میں شروع کی کہ جن صوبوں کی مادری زبان اردو نہیں ہے اس کے مسلمان باشندوں میں اردو کی تعلیم دی جائے۔ چنانچہ وہ خود جس صوبہ سے تعلق رکھتے تھے۔ وہاں اردو زبان نہ اچھی طرح بولی جاتی تھی نہ سمجھی جاتی تھی زبان کی اہمیت اور اس زبان کو اپنی قومی تاریخ قومی لٹریچر کی مناسبت کے خیال سے اور یہ خیال کر کے کہ آگے چل کر یہی زبان ہندوستان کی لینگوا فرینکا کی حیثیت اختیار کرنے والی ہے اپنے گھر اور خاندان کی بیبیوں اور لڑکیوں کو اردو زبان دانی کے لئے آمادہ تیار کیا جس کا نتیجہ یہ ہے کہ طیب جی فیملی کی عورتیں آج جیسی اچھی اردو سمجھتی ہیں لکھتی ہیں، بولتی ہیں، تقریر کرتی ہیں شاید ہی کسی خاندان میں اس قابلیت کی اردو جاننے والی عورتیں موجود ہوں۔ ان کی رائے تھی کہ مسلمانوں کے جن خاندانوں کی زبان اُردو نہیں ہے ان کو بھی اپنی مادری زبان اُردو بنانی چاہیئے۔

طیب جی نے اور ان کی وجہ سے ان کے بڑے خاندان نے مغربی تمدن اور معاشرت کی ہر اُس چیز کو لے لیا تھا جس کی زمانۂ حال کے لحاظ سے ضرورت تھی لیکن اس کے ساتھ اُنھوں نے اپنے آبائی اور قومی لباس کو کبھی اور کسی حالت میں نہیں چھوڑا۔ وہ عربی خون کی پیداوار تھے لہذا وہ اور اُن کا تمام خاندان اب تک عربی لباس اختیار کئے ہوئے ہے۔ وہ جس وقت ہائی کورٹ کی کرسی پر نشست کرتے ہوتے تھے تو اس وقت بھی اپنے پورے لباس عربی میں ہوتے تھے۔

سنہ ۱۹۰۳ء میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس بمبئی میں انھیں کی توجہ اور انھیں کی صدارت میں قایم ہوا۔ سرسید کی تمنا تھی کہ ان کی زندگی میں کانفرنس کا اجلاس ہو لیکن ان کی زندگی میں یہ توقع پوری نہ ہوئی۔ کانفرنس کی زندگی میں اجلاس بمبئی کا دل کش نظارہ نواب محسن الملک کی کوشش عمل کا پہلا نتیجہ تھا کانفرنس کی گزشتہ اکتالیس سالہ تاریخ میں اس کی چند مجلسیں اور اجلاس اپنے مختلف النوع جذبات اور خیالات کے اعتبار سے ایسے کامیاب اور پراثر ہوئے ہیں کہ قومی حرکت کی جو کیفیات جہاں کہیں نظر آ رہی ہیں وہ سب اسی جد و جہد اور کوشش کا نتیجہ ہیں۔

بمبئی پلیٹ فارم کے گروپ کا اور ان پرجمال اور پُرجلال صورتوں اور سیرتوں کا عکس اب کیسے دکھاؤں اور کیوں کر اُن کی خاکی صورتوں کے خاکے میں نقش بندی کر کے رنگ آمیزی کروں جو تہائی صدی کا زمانہ ختم ہوتے آیا آج بھی جب اس عالم تصور میں کبھی جاتا ہوں تو الفاظ میں وہ تاثیر اور قوت نہیں ملتی جو دیدنی کیفیت کی ترجمان ہو سکے۔

زمانہ اجلاس کانفرنس میں طیب جی نے اپنے خوشنما بنگلہ واقع مالا بار ہل پر تمام مہمانان کانفرنس کو دعوت دی تھی جس میں تقریباً ایک ہزار مہمان شامل تھے۔ لب ساحل پہاڑی پر بنگلہ کا جائے وقوع چاندنی رات کا سماں سمندر میں ہلکی ہلکی لہروں کا آپس میں کھیلنا، مکان کی نفاست، اشیاء کا رکھ رکھاؤ، نشست گاہوں کی ترتیب۔ سبزے کا پُرکیف نظارہ، کیاریوں کی ترتیب، انواع واقسام کے فواکہات، مشروبات اور کھانوں کی تواضع، باوقار اور اہل کمال کا مجمع، معزز میزبان کا اور اُن کے خاندان کے افراد کا ہر کہہ ومہ سے نہایت اخلاق وتواضع سے پیش آنا، دوستوں کے جھمگٹے بے تکلفی ملاقاتیں ایک سماں تھا جو گزر گیا جن کا تصور آج بھی میری آنکھوں میں محفوظ ہے۔

نوٹ - جسٹس مرحوم کے حالات میں نیٹسن سیریز سے مدد لی گئی بعض واقعات چشم دید بعض معتبر راویوں کی روایات سے لئے گئے۔

خطبۂ صدارت

یور اکسلنسی، یور ہائی نسز، لیڈیز اور جنٹلمین!

میں اس کو اپنا پہلا فرض سمجھتا ہوں کہ آپ صاحبوں نے مجھ کو محمدن ایجوکیشنل کانفرنس کا پریسیڈنٹ منتخب کر کے جو عزت بخشی ہے اُس کا تہ دل سے شکریہ ادا کروں۔ یہ انسٹی ٹیوشن ایسا عظیم الشان ہے اور اُس کا اثر تمام ہندوستان میں اتنا پڑا ہے کہ میں سمجھتا ہوں کہ میرا پریسیڈنٹ منتخب ہونا سب سے بڑی عزت ہے جو مجھ کو اس سلطنت کے مسلمانوں کی طرف سے مل سکتی ہے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ گو کہ مجھ کو اپنے فرائض منصبی کو پوری طرح انجام دینے کی قابلیت کے متعلق شبہ ہے۔ میں اس کانفرنس کے پریسیڈنٹ ہونے کو اپنی زندگی کا ایک قابل فخر موقع سمجھ کر ہمیشہ یاد رکھوں گا۔

حضرات! اس کے بعد مجھے آپ کے بطور ڈیلیگیٹس تشریف لانے پر آپ کے خیر مقدم کرنے کا فرض ادا کرنا چاہئے۔ اس مقام پر آپ کی موجودگی سے نہ صرف وہ بڑی دلچسپی ظاہر ہوتی ہے جو مسلمانان

ہندوستان کے مختلف فرقے اُس اہم معاملہ کی نسبت لیتے ہیں جس کا ہم نے بیڑا اُٹھایا ہے۔ بلکہ اُس سے مسلمانوں کی تعلیم کے معاملہ میں آپ کی ذاتی دلچسپی بھی ظاہر ہوتی ہے۔ میں واقف ہوں کہ آپ میں سے اکثر حضرات اپنا قیمتی وقت صرف کر کے اور سفر کی صعوبتیں اٹھا کر اس سلطنت کے دور دور مقامات سے یہاں تشریف لائے ہیں۔ اور مجھے یقین ہے کہ آپ نے طویل مسافت اس لئے طے کی ہے کہ آپ اُن اعلیٰ مقاصد اور اغراض سے بخوبی اثر پذیر ہیں جن پر امید ہے کہ آج ہم غور کریں گے اور جن سے مجھے بھروسہ ہے کہ ہندوستان کے ہمارے تمام ہم مذہب بھائیوں کے لئے مفید اور کارآمد نتائج مرتب ہوں گے۔

حضرات! جو ذمہ داریاں اس مقام پر جمع ہونے سے ہمارے ذمہ عائد ہوتی ہیں ان کا بیان کرنا مبالغہ نہ ہو گا۔ جنہوں نے مسلمان فرقوں کے لیڈر ہندوستان کے ہر صدر مقام میں اور ہمارے تعلیم یافتہ اور روشن خیال ہم مذہب بھائی سلطنت کے ہر صوبہ میں اور وہ تمام حضرات جنھوں نے مسلمانوں کی تعلیم کے معاملہ میں دلچسپی لی ہے۔ بڑے شوق و انتظار کے ساتھ اس امید پر کانفرنس کے جلسہ کی طرف آنکھیں لگائے رہتے ہیں کہ شاید ہم ایسی تدابیر نکال سکیں گے جو مفید ثابت ہوں اور جو ہمارے طریقہ تعلیم اور تمام ہندوستان میں ہمارے مختلف انتظامات تعلیم کو زیادہ تر معقول اور زیادہ تر مستحکم بنیاد پر قائم کر سکیں۔ صاحبو میں یہ خیال کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ تمام ہندوستان میں مسلمان جماعتوں کی آنکھیں اس وقت اس جلسہ کی طرف لگی ہوئی ہیں اور اس بات کا انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جس قدر عظیم الشان امیدیں ہم نے دلائی ہیں اسی قدر ہماری ذمہ داریاں فرائض کے انجام دینے میں زیادہ ہونی چاہئیں۔ محمڈن کانفرنس اب ایک ایسا انسٹی ٹیوشن سمجھا جانے لگا ہے جس کی طرف ہندوستان کے مسلمان امداد اور مشورہ اور ہدایت حاصل کرنے کے لئے رجوع کرتے ہیں۔ ہماری ذمہ داری اس لئے بڑی ہے۔ ہم میں سے ہر ایک کو اور سب کو یہ بات سمجھ لینی چاہئے اور ہم کو خیال رکھنا چاہئے کہ جو رزولیوشن ہم پاس کریں وہ فکر صحیح اور عقل سلیم اور غور کامل کا نتیجہ ہوں۔

حضرات! اب میں ان تعلقات کی طرف رجوع کرتا ہوں جو کانفرنس کے بحیثیت جماعت صدر اور تمام سلطنت کے مختلف اسلامی تعلیمی انسٹی ٹیوشنوں کے درمیان ہونے چاہئیں اور اس انسٹی ٹیوشن کی نسبت جس کے پریسیڈنٹ ہونے کی عزت مجھے بہت سال سے حاصل ہے۔ یعنی انجمن اسلام بمبئی کی نسبت میں کہہ سکتا ہوں کہ یہ انسٹی ٹیوشن جیسا کہ آپ سب حضرات بے شک واقف ہیں بہت سال سے قائم ہے اور میں یقین کرتا ہوں کہ اُس نے مسلمانوں کی خصوصاً اس صوبہ کے مسلمانوں کی اخلاقی تمدنی اور تعلیمی حالت میں ترقی دی ہے۔ لہٰذا میں اس کانفرنس کے ڈیلیگیٹوں اور ممبروں کو یقین دلاتا ہوں کہ یہ انجمن کانفرنس

کی ان کوششوں میں نہایت خوشی کے ساتھ ہمیشہ شریک ہوگی جن سے مسلمانوں کی تعلیم کے معاملہ میں ترقی ہو اور ہمارے ہم مذہب بھائیوں کی حالت سدھرے۔ ان دونوں انسٹی ٹیوشنوں کے درمیان پورا اتحاد اور کامل ہمدردی ہونی چاہئے اور میں یقین کرتا ہوں کہ ہے اور رہے گی۔ اور شاید اس موقع پر میرے لئے چند الفاظ اپنی حالت کے متعلق کہنے۔ کہ ایک طرف میں انجمن کے پریسیڈنٹ اور دوسری طرف کانفرنس کے پریسیڈنٹ کی حیثیت میں ہوں نامناسب نہ ہوں گے۔

حضرات! آپ بے شک واقف ہیں کہ اگرچہ یہ کانفرنس کئی سال سے قائم ہے۔ مگر میں اب تک اُس کے غور و مشورہ کے معاملات میں مستعدی کے ساتھ کوئی حصہ نہ لے سکا۔ بلاشبہ اس کے بہت سے وجوہات رہے ہیں جن کا ذکر غیر ضروری ہے۔ لیکن ایک ایسی وجہ ہے جس کے متعلق مجھے چند کلمات کہنے ضرور ہیں۔ صاحبو! آپ بے شک واقف ہیں کہ میں ہمیشہ انڈین نیشنل کانگریس کا حامی رہا ہوں۔ اپنی نوعمری اور زیادہ آزادی کے زمانہ میں جب میں اپنی موجودہ خدمت کی ذمہ داریوں سے دبا ہوا نہیں تھا۔ اور اس لئے میں پبلک زندگی میں زیادہ مستعدی کے ساتھ حصہ لینے کے قابل تھا۔ میں نے اپنا فرض سمجھا کہ کانگریس کی اعانت کروں۔ اور جیسا کہ آپ شاید جانتے ہوں چند سال ہوئے مجھے کانگریس منعقدہ مدراس کے پریسیڈنٹ ہونے کی عزت حاصل ہوئی تھی۔ اُس موقع پر میں نے اپنے انتخاب کو سب سے بڑی عزت بیان کیا تھا جو کسی ہندوستانی شخص کو اس کے ہم وطنوں کی طرف سے دی جاسکتی ہے۔ چونکہ اُس وقت میری یہ رائے تھی اور اب بھی یہی رائے ہے۔ اس لئے آپ سمجھ سکتے ہیں کہ میرے لئے کسی ایسے انسٹی ٹیوشن میں حصہ لینا ممکن نہ تھا جس پر کانگریس کے دشمن ہونے کا ذرا سا بھی گمان ہوتا یا مخالف ہونے کا خیال ہوتا ہو۔ اب چونکہ کانفرنس کی حالت واضح ہے کہ وہ ایک تعلیمی اور سوشل انسٹی ٹیوشن ہے اور پولیٹکل انسٹی ٹیوشن نہیں ہے اور اس وجہ سے جب دونوں انسٹی ٹیوشنوں میں دشمنی یا مخالفت کا کوئی شبہ نہیں ہوسکتا میں کامل مسرت کے ساتھ آپ کے جلسہ مشورہ میں صدر ہونے کی اعلیٰ عزت قبول کرسکا۔

صاحبو! اس موقع پر میرا خیال قدرتاً اس سوال کی طرف راجع ہوتا ہے کہ ہماری کانفرنس کے کیا فرائض و خدمات ہیں اور کیا ہونے چاہئیں۔ مجھے یقین ہے بغیر کسی مقررہ نظام کے ہمارے فرائض ضرور کسی نہ کسی قدر مبہم اور مشکوک رہیں گے۔ لہٰذا میں آپ کی اجازت سے چند کلمات اس امر کے متعلق کہنا چاہتا ہوں کہ میری رائے میں ہمارے فرائض کی کیا حدود ہونی چاہئیں۔ حضرات یہ کانفرنس ہمیشہ اب تک تعلیمی کانفرنس کے نام سے نامزد رہی ہے۔ اس لئے اس کے بڑے فرائض کو صرف ان مسائل پر محدود رہنا چاہیے جو تعلیم سے تعلق رکھتے ہیں۔ مگر لفظ تعلیم فی نفسہٖ ایک ایسا کلمہ ہے جس کے معنی وسیع ہیں۔ لہٰذا اگر ہم ان مسائل پر

غور کریں جو تعلیم کے تمام شعبوں سے تعلق رکھتے ہیں جس میں اخلاقی، تمدنی، دماغی، جسمانی اور نیز ایک مناسب حد تک پولیٹیکل تعلیم شامل ہے۔ تو میں کہہ سکتا ہوں کہ ہم ان حدود سے متجاوز نہ ہوں گے جو ہمارے اعمال کے لئے قرار دی گئی ہیں۔

مگر میں سمجھتا ہوں کہ ہم کو ان مسائل پر خاص طور سے زیادہ توجہ کرنی چاہئے جو ہماری دائمی تعلیم سے تعلق رکھتے ہیں۔ لیکن بلاشبہ ہماری دماغی ترقی اخلاقی، تمدنی، پولیٹیکل اور جسمانی ترقیوں سے پیوستہ ہے اس لئے مجھے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ ہمارے لئے ناممکن ہوگا کہ ہم بالکل ان مختلف متعدد مسائل سے قطع نظر کریں جو مختلف صورتوں اور پیرایوں میں جن کا میں نے ذکر کیا ہے مسئلہ تعلیم سے متعلق ہیں۔ اگر ہم ان میں سے کسی ایک طرف ترقی کریں تو ہم لازمی طور پر دوسری طرف بھی ترقی کریں گے۔ اگر ہم ان میں سے کسی ایک میں پیچھے ہیں ہم لازمی طور پر دوسری باتوں میں بھی اپنی ترقی کو روک دیں گے۔ لہٰذا ہم کو خیال کرنا چاہئے کہ ہماری خدمات محض دماغی تربیت پر محدود نہیں ہیں۔ بلکہ اس غرض کے حصول کے لئے ہم کو ان تدابیر کی فکر کرنی چاہئے جو ہم کو اخلاقی، سوشل اور جسمانی دنیا میں زیادہ رفیع القدر بنا دیں۔ مگر جہاں میں نے پولیٹیکل تعلیم کو اپنے فرائض کی ایک شق مان کر شامل کیا ہے۔ وہاں ہمارے لئے یہ بات ملحوظ خاطر رکھنی ہوگی کہ جہاں تک پولیٹیکل معاملات ہماری دماغی ترقی سے علیحدہ ہو سکتے ہیں اور جہاں تک وہ ہماری دماغی ترقی سے کوئی ربط نہیں رکھتے۔ ہم کو ان میں دخل در معقولات دینا نہیں چاہئے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہم عقلمندی کے ساتھ کام کریں گے اگر ہم اپنے مباحثوں میں پولیٹیکل بحث طلب مسائل کے شامل کرنے سے احتراز کریں۔ بالعموم پولیٹیکل امور کا اثر تمام سلطنت پر ہوتا ہے اور قریباً مختلف قوموں پر جو اس سلطنت میں آباد ہیں مساوی اثر پڑتا ہے۔ یہ شاذونادر ہی ہوتا ہے کہ ایسے پولیٹیکل مسائل پیدا ہوں جو صرف ایک ہی قوم پر اثر کریں۔ اس لئے ہمیشہ میں اس اصول کا پابند رہا ہوں کہ جہاں تک عام پولیٹیکل معاملات یعنی ان معاملات کا تعلق ہے جن کا اثر نہ صرف مسلمانوں پر بلکہ تمام سلطنت اور تمام فرقوں پر یکساں اثر پڑتا ہے۔ مسلمانوں کو ہندوستان کی دوسری قوموں کے ساتھ مل کر کام کرنا چاہئے۔ ایک دوسرے سے علیحدہ ہو کر اور مخالفانہ طور پر نہیں۔ لیکن جب پولیٹیکل معاملات صرف مسلمانوں سے واسطہ رکھتے ہوں۔ یا بہ نسبت دیگر اقوام کے مسلمانوں کے ساتھ زیادہ تر واسطہ رکھتے ہوں تو اس صورت میں صرف جائز اور مناسب ہی نہ ہوگا بلکہ ہمارا عین فرض ہوگا کہ ہم اپنی آواز کو بحیثیت ایک علیحدہ جماعت کے گورنمنٹ کے گوش گزار کریں۔ اور ہر ایک قانونی تدبیر سے حتی الوسع اس چیز کی مخالفت کریں جو ہمارے اغراض کے خلاف اور ہمارے مقاصد کے لئے مضرت رساں متصور ہو۔ اسی طرح اگر کوئی تدابیر

ایسی ہوں جو ہماری جماعت کو خاص طور پر فائدہ پہونچا سکتی ہوں تو ان کی تائید اور اُن کے لئے سرگرمی سے کوشش کرنا میرے خیال میں ہمارا فرض ہوگا۔

مگر حضرات میری رائے میں ان پولٹیکل مسائل کی نسبت سب سے اچھی طرح علحدہ پولٹیکل انسٹی ٹیوشنوں میں بحث کی جا سکتی ہے۔ اور ایک ایسی انسٹی ٹیوشن میں یہ بحث نہ ہونا چاہئے جیسی کہ یہ تعلیمی کانفرنس ہے۔ میں خیال کرتا ہوں کہ ہم کو تمام پولٹیکل مسائل کی بحث سے بالکل احترا ز کرنا اور اپنے تئیں صرف تعلیمی مسائل پر جیسا کہ عام طور پر وہ کہلائے جاتے ہیں، محدود رکھنا چاہئے۔ مگر باوجود ان حدود کے کانفرنس کے لئے بے شمار کام نہایت مفید اور عملی قسم کا موجود ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ اس سے آگے بڑھنا دانائی نہ ہوگی اور میں بالکل کسی ایسے مسئلہ یا مضمون کے اختیار کرنے کو برا سمجھوں گا جس سے ہمارے دوسرے ہم وطنوں کے دلوں کو رنج یا اُن کے فیلنگس کو صدمہ پہونچے۔ حضرات جو کچھ میں نے کہا ہے میں سمجھتا ہوں وہ اس بات کے ظاہر کرنے کے لئے کافی ہے کہ میری رائے میں بجائے دشمنی یا مخالفت کی کوئی وجہ موجود ہونے کی، ہر طرح اس امر کی وجہ موجود ہے کہ دو بڑے انسٹی ٹیوشن، کانفرنس و کانگریس کو مل کر کام کرنا چاہئے۔ ایک کا مقصد بالخصوص ملک کی پولٹیکل ترقی ہو اور دوسرے کا مسلمانوں کی قوم کی تعلیمی ترقی۔ میں کوئی وجہ نہیں دیکھ سکتا کہ یہ دو انسٹی ٹیوشن کامل صلح و اتحاد کے ساتھ کام نہ کریں۔ اور کیوں مسلمان فرقہ کے تعلیم یافتہ اور روشن خیال اور تجربہ کار اور با اثر لوگ جہاں تک اُن کے حالات اور ضروریات اجازت دیں، دونوں انسٹی ٹیوشنوں کے مشورہ کے معاملات میں حصہ نہ لیں۔ ہم ہندوستان کی تمام دیگر اقوام کے ساتھ کامل اتحاد و مشارکت میں جب تک کہ ہمارے خاص اغراض کو نقصان نہ پہونچے کام کر سکتے ہیں پھر اگر ہمارے اغراض میں نقصان کا خوف ہو تو جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں ہمارا فرض ہوگا کہ ان تمام مضرت رساں معاملات کی حتی المقدور تمام قانونی ذرائع سے مخالفت کریں اگرچہ میری رائے میں ایسی مخالفت خود کانگریس یا علحدہ پولٹیکل انسٹی ٹیوشن میں ہو سکتی ہے۔ اور ایسے انسٹی ٹیوشن میں نہیں ہو سکتی جیسی کہ یہ کانفرنس ہے۔

حضرات! میں سمجھتا ہوں اب مجھے چند کلمات بلحاظ اُن تعلقات کے کہنے چاہئیں۔ جو اس کانفرنس میں اور دیگر مقامی اسلامی انسٹی ٹیوشنوں میں ہونے چاہئیں۔ بعض جگہ یہ بتایا گیا ہے کہ کانفرنس ان مقامی انسٹی ٹیوشنوں کی رقیب ہے۔ یا کانفرنس کا یہ منشا ہے کہ مسلمانوں کی تعلیم کے معاملہ میں مقامی کوششوں کو کمزور کرے۔

حضرات! اصلیت اس کے بالکل برعکس ہے۔ اور مجھے آپ کو یقین دلانے کی ضرورت

نہیں۔ اگر میں خیال کرتا کہ ان اعتراضات میں کوئی بات بھی سچی ہے تو کم سے کم میں خود تو اس کانفرنس کے
غور و مشورہ میں حصہ نہیں لے سکتا تھا۔ حضرات برخلاف اس کے آج میں یہاں موجود ہوں۔ اس کی وجہ
یہ ہے کہ مجھے یقین ہو گیا ہے کہ یہ صدر کانفرنس بجائے ہماری مقامی انسٹی ٹیوشنوں کو کمزور کرنے کے اُن
کو بہت کچھ مضبوط کرے گی۔ میں نے اس بات پر اپنا اطمینان کر لیا ہے کہ مقامی انسٹی ٹیوشنوں اور کانفرنس
کے درمیان ہمیشہ انتہا درجہ کا اتحاد ہونا چاہیئے۔ اور کانفرنس کو جہاں تک اُس کے موجودہ وسائل اجازت
دیں مقامی انسٹی ٹیوشنوں کی مدد کرنی۔ صلاح بتاتی اور رہ نمائی کرنی چاہیئے۔ اور دوسری طرف مقامی
انسٹی ٹیوشنوں کو کانفرنس کی بطور ایک مرکز کے جس کے گرد ہماری قوم کے نہایت روشن خیال اور
بااثر لوگ جمع ہوتے ہیں مدد کرنی چاہیئے۔

پھر کانفرنس کے اور خصوصاً ان اجلاسوں کے جو مختلف مقامات میں منعقد ہوتے ہیں کیا فوائد
ہیں؟ صاحبو! میں سمجھتا ہوں کہ اول تو اس کانفرنس کے اجلاس سلطنت کے مختلف حصّوں سے ذی عقل
مسلمانوں کو ایک جگہ لا کر جمع کرتے ہیں۔ کانفرنس ایک دوسرے سے بہتر واقفیت کو بڑھاتی ہے۔ اس سے
ہم کو تبادلہ آرا و خیالات کا فائدہ حاصل ہوتا ہے اور ہم کو اپنی مقامی انسٹی ٹیوشنوں اور اُن کے طریقہ
تعلیم کے ساتھ مقابلہ کرنے کا موقع ملتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ اس کانفرنس کے چند بڑے مقاصد اور فوائد
ہیں۔ اس وقت اس ہال میں مسلمانوں کی قوم کے نہایت سربرآوردہ لوگ جمع ہیں، جنھوں نے دماغی اور پولٹیکل
دنیا میں نام آوری اور شہرت حاصل کی ہے اور جنھوں نے حتی الامکان اپنی زندگیاں ہمارے اغراض کی
ترقی میں وقف کر دی ہیں۔ میں اپنے سامنے مصنفین، شعرا، پولیٹیشنوں، بیرسٹروں، سولیسٹروں، انجنیروں
غرض کہ پبلک زندگی کے ہر قسم کے آدمیوں کو دیکھتا ہوں جو سب ہمیں مدد دینے اور اپنے پختہ تجربے اور اعلیٰ
دماغی قابلیتوں سے ہم کو فائدہ پہونچانے کی غرض سے جمع ہوئے ہیں۔ کیا یہ ہم بمبئی والوں کو کچھ تھوڑا فائدہ ہے
کہ ہم میں (اگرچہ صرف چند روز کے لئے) ہندوستان کے تمام حصوں سے ہماری قوم کے سب سے اعلےٰ
اور نہایت روشن خیال حضرات موجود ہیں؟ کیا یہ سب کا اکٹھے ہو کر ملنا، مل کر باتیں کرنا، تمام مضامین پر
تبادلہ خیالات کرنا اُن کے ساتھ مل کر جہاں تک ممکن ہے اپنے تئیں فائدہ پہونچانا، تھوڑا نفع ہے۔ حضرات
میں یقین کرتا ہوں کہ اگر کانفرنس جو کچھ میں نے ابھی نقشہ کھینچا ہے اُس سے کچھ زیادہ نہیں کرتی تاہم ہماری
قوم کے تمام صاحب خیال حضرات کی طرف سے امداد اور حوصلہ افزائی کی مستحق ہوگی۔

لیکن مجھے اب اس معاملہ کی نسبت جس کو میں نے اپنے اجتماع کی بڑی غرض سمجھنے کی جرأت کی
ہے۔ یعنی ہماری دماغی تعلیم کی نسبت چند کلمات کہنے کی اجازت دیجئے۔ حضرات مجھے آپ کو یہ یاد دلانا

ضروری نہیں ہے کہ اور قوموں کے مقابلہ میں ہم کس قدر پیچھے ہیں۔ ہیں یہ سمجھنے کے لئے کہ ہم اُن سے کس قدر پیچھے کھڑے ہیں صرف اپنی آنکھیں اپنے اوپر سے اُٹھاکر اور قوموں کی طرف دیکھنا ہے خواہ وہ گورنمنٹ کے کسی پبلک محکمہ میں ہو یا کسی آزاد پیشہ میں۔ ہم اور قوموں سے بہت ہی پیچھے ہیں۔ ہمارے سول عہدہ دار بیرسٹر، سولیسٹر، ڈاکٹر اور انجنیر دوسری قوموں کے مقابلہ میں گنتی کے ہیں۔ ہم اس معاملہ میں واجبی طور پر گورنمنٹ کی شکایت نہیں کر سکتے۔ وہ ہمارے ساتھ منصف اور غیر طرفدار رہی ہے تو پھر ہماری موجودہ ناقابلِ اطمینان حالت کی کیا وجہ ہے۔؟ حضرات میں نے اکثر لوگوں کو یہ کہتے سُنا ہے کہ ہماری آپس کی نا اتفاقیاں اور ہمارا افلاس ہمارے پیچھے رہ جانے کا باعث ہے۔ بلاشبہ ہمارے راستہ میں بہت سی رکاوٹیں حائل رہی ہیں۔ مگر حضرات میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے تنزل اور انحطاط کے بڑے اسباب اولاً ہمارے مذہبی اور علمی تعصبات ہیں اور ثانیاً تعلیم نسواں کا نہ ہونا ہے۔ مذہبی تعصبات سے میری مراد صرف وہی اختلافات نہیں ہیں جو بدقسمتی سے اہلِ اسلام کے مختلف فرقوں میں مذہبی مسائل کی نسبت پائے جاتے ہیں۔ بلکہ ان میں وہ تعصبات بھی شامل ہیں جو ہماری قوم کا ایک گروہ کثیر مغربی علوم و فنون کے ساتھ رکھتا ہے۔ ہم فخر کرتے ہیں، اور شاید میں کہہ سکتا ہوں کہ ہم واجبی فخر کرتے ہیں اپنے علوم و فنون پر جو بے شمار مستند اور ضخیم کتابوں میں مدفون ہیں، ہم واجبی فخر کرتے ہیں۔ اسلامی علوم دینیات پر اپنے عربی اور فارسی علم ادب پر۔ اپنے شاعروں اور اپنی شاندار تاریخ پر، اپنے علوم و فنون اور علم ادب کے ہر شعبہ کی ہزاروں کتابوں پر۔ میں کہتا ہوں کہ ہم کو اپنے اسلاف کے کارناموں پر فخر کرنے کا کافی سامان موجود ہے۔ لیکن حضرات! کیا اپنے مذہب اور اپنے علم و ادب کے ساتھ محبت رکھنے کے لئے یہ بات بھی ضروری ہے کہ ہم اُس عظیم الشان لٹریچر اور جدید علوم و فنون کو بُرا کہیں، حقارت کی نظر سے دیکھیں اور نفرت کریں جنھوں نے مغرب میں نشو و نما پائی ہے، اور یورپ اور امریکہ کو یورپ اور امریکہ بنا دیا ہے، جو نہ صرف مغربی قوموں کے لئے لائٹ ہوس کا کام دے رہے ہیں، بلکہ وہ ہمارے لئے بھی مشعل ہدایت ہو سکتے ہیں۔ بشرطیکہ ہم میں ان سے فائدہ اُٹھانے کی ہمت اور طاقت ہو۔

حضرات میرا ہمیشہ یہ اعتقاد رہا ہے کہ جہاں ہمارا اپنا مشرقی علم فی نفسہ اچھا ہے۔ ہم کو اس کے ساتھ حتی المقدور علوم و فنون کی اُن شاخوں میں ملکہ حاصل کرنا چاہیے جو اس وقت یورپ کی قوموں کے لئے مابہ الامتیاز ہیں۔ ہم کو اپنے تبدیل شدہ حالات سے آنکھیں بند کرنی نہیں چاہئیں۔ ہمارے پاس اب ایک مضبوط طاقتور اور مستحکم طور پر قائم گورنمنٹ ہے۔ جو اپنے معاملات میں ان تمام اقوام کے ساتھ جو اس سلطنت میں آباد ہیں کسی کی طرفدار نہیں ہے۔ ہم کسی خاص حقوق یا مراعات کی توقع نہیں کر سکتے

ہمارے لئے صرف گورنمنٹ کی مرحمتوں پر تکیہ کرنا بے عقلی کی بات ہوگی۔ ہم کو اپنے اور ہم وطنوں کے ساتھ مساوی شرائط پر مقابلہ کرنا چاہیئے۔ ہم کو اتفاق کے ساتھ مل جانا چاہیئے۔ ہم کو یاد رکھنا چاہیئے کہ ہمارے مقدس پیغمبر (صلعم) نے علم کو جہاں کہیں وہ ملے حاصل کرنے کی ہم کو تاکید کی ہے۔ اس لئے ہم کو یورپ کے علوم و فنون کی طرف اپنی توجہ مبذول کرنی چاہیئے۔ صرف یہی موجودہ دماغی تعلیم کے بڑے سرچشمے ہیں۔

حضرات! جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں کہ ہم کو فارسی اور عربی زبان کی ان عظیم الشان تصانیف پر جو سائنس کے ہر ایک شعبہ میں لکھی گئی ہیں فخر کرنے کی کافی وجہ موجود ہے لیکن ہم کو یاد رکھنا چاہیئے کہ ان کتابوں کی تدوین کو صدیاں گزر چکی ہیں۔ ان تصانیف سے ہم کو علمی تحقیقات کے وہی نتائج حاصل ہوتے ہیں جو اُس وقت موجود تھے۔ جب کہ مصنفوں نے اپنی کتابوں کی تدوین کی تھی لیکن حضرات اس زمانہ کو صدیاں گزر چکی ہیں اور اب محض حماقت اور نادانی ہوگی، اگر ہم یورپ اور امریکہ کی اس حیرت انگیز اور عظیم الشان ترقی سے انکار کریں جو ان ممالک نے ہر ایک شعبہ علم میں اور بالخصوص طبیعی علوم میں کی ہے۔ کیا ہم کو اپنی توجہ کیمیا۔ ہیئت، جغرافیہ اور علوم طبیعات کی پرانی کتابوں کے مطالعہ پر محدود رکھنی چاہیئے؟ اور کیا ہم کو موجودہ ماہرین سائنس کی تحقیقات نے جو روشنی ڈالی ہے اس کے فوائد سے اپنے تئیں محروم رکھنا چاہیئے؟ کیا ہم کو بجلی کی روشنی، تار برقی، ریلوں اور دخانی جہازوں سے فائدہ اُٹھانے کے بجائے پرانی بیل گاڑیوں اور اونٹوں پر ڈاک لے جانے اور رکھو پرے کے تیل سے مٹی کے چراغ جلانے پر قناعت کرنی چاہیئے۔ حضرات! بیل گاڑیوں اور دخانی انجنوں میں اس سے زیادہ فرق نہیں ہے جس قدر کہ ہمارے گزشتہ زمانہ کے بہترین مصنفین کی طبیعات اور زمانہ موجودہ کے مصنفین کی طبیعات میں پایا جاتا ہے۔

حضرات! دوسری چیز جو ہماری ترقی میں سنگ راہ ہے وہ عورتوں کی تعلیم کا نہ ہونا ہے، اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ تعلیم اپنے حقیقی اور اصلی معنوں میں ہماری عورتوں میں نہیں ہے۔ یہ ایک ایسی بات ہے جو صرف ہماری قوم کے ساتھ مخصوص ہے۔ یہ ایک ایسی بلا ہے جس کی نظر صرف ہماری ہی طرف ہے۔ ہم جہاں کہیں اپنی نظر ڈالتے ہیں اس کا تکلیف دہ احساس ہم کو ہوتا ہے۔ عربی یا فارسی کی کسی قدر شدبود یا حساب اور تواریخ سے سرسری واقفیت اصلی تعلیم نہیں ہے اور نہ ہو سکتی ہے۔ اصلی تعلیم سے میری مراد وہ تعلیم ہے جو انسان کی تمام دماغی اور اخلاقی قوتوں کو ترقی دے۔ حضرات! اگر تعلیم نسواں ہماری قوم میں موجود نہیں ہے اور اگر اُس کو ہم اپنی قوم میں جاری کرنے کے لئے ضروری کوشش نہیں کرتے تو کیا ہم کبھی روشن خیال

اور ترقی یافتہ قوم بن جانے کی امید کر سکتے ہیں؟ کیا ہم ایک روشن خیال قوم ہونے کی مفقود حیثیت کو دوبارہ حاصل کر سکتے ہیں؟ اور کیا ہم ہندوستان کی زیادہ تر خوش نصیب قوموں کے ساتھ ترقی کی دوڑ میں برابر ہو سکتے ہیں۔

ہم کو تھوڑی دیر کے لئے خیال کرلینا چاہیئے کہ تعلیم نسواں کے نہ ہونے سے کیا مراد ہے۔ اس کے معنی اول تو یہ ہوتے ہیں کہ ہماری قوم کا کم از کم نصف حصہ غیر تعلیم یافتہ، جاہل، تنگ خیال اور پست ہے۔ اور ابد الآباد تک ایسا ہی رہے گا۔ کیا یہ بات ظاہر نہیں ہے کہ جب ہماری مائیں، ہماری بیویاں، ہماری لڑکیاں اور ہماری بہنیں، ناتعلیم یافتہ ہیں، تو خود ہماری تعلیم ضرور بہت ناقص قسم کی ہوگی، اور ہم ایک تاریک عالم اور مضر صحت آب و ہوا میں رہیں گے۔ ہم کیوں کر اپنے بچوں کی تربیت اور تعلیم پانے کی امید کر سکتے ہیں جب ان کی مائیں جاہل ہیں۔ ہم کیوں کر اعلیٰ اخلاقی اصول ان کے دلوں پر نقش کرا سکتے ہیں۔ جب بچے ایسی عورتوں میں زندگی بسر کرتے ہیں۔ جو کبھی اعلیٰ اخلاقی اور دماغی تربیت سے مستفید نہیں ہوئی ہیں؟ حضرات! اگر یہ بات ممکن ہے۔ تو یہ بھی ممکن ہے کہ ایک جھیل میں جس کا آدھا حصہ ناپاک سیاہ اور مضر صحت پانی سے بھرا ہوا ہے، پاک شفاف اور صاف پانی کی امید کی جائے۔ ایسی جھیل کا ایک حصہ دوسرے حصہ پر اثر کریگا، اور تاوقتیکہ آدھا ناپاک حصہ نہ نکال دیا جائے گا ساری جھیل ناپاک رہے گی۔ اچھا اگر تعلیم نسواں ہم میں موجود نہیں ہے، اور اگر یہ ضروری ہے کہ اس کا رواج دیا جائے تو کیا خاص روکیں ہیں جن کو ہمیں دور کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے؟ اب حضرات میں یہ سمجھ لیتا ہوں کہ اس ہال میں کوئی ایک شخص بھی ایسا نہیں ہے جو فی نفسہٖ تعلیم نسواں کے خلاف ہے مجھے یقین ہے کہ کوئی شخص استدلال نہیں کرے گا کہ عورتوں کو جاہل ان پڑھ اور ناتعلیم یافتہ چھوڑ دیا جائے۔ میں آگے یہ فرض کر لیتا ہوں کہ ہمارے مذہب میں کوئی بات ایسی نہیں ہے جو ہماری عورتوں کو اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم کی مانع یا ناموافق ہے۔ پھر ہماری عورتوں کی تعلیم کی موجودہ ناقابل اطمینان حالت کی کیا وجہ ہے؟ میں یقین کرتا ہوں کہ وہ تمام وجوہات جنھوں نے ہماری قوم کے مردوں کی پست حالت پیدا کی ہے تعلیم کے معاملہ میں ہماری عورتوں کی پست حالت کے معاون رہے ہیں۔ مگر علاوہ ان بڑی مشکلات اور روکوں کے جن سے کہ مسلمان مردوں نے نقصان اٹھایا ہے ایک بڑی روک رہی ہے جو عورتوں کی ترقی کے لئے خاص ہے۔

میں پردہ کی رسم کا ذکر کرتا ہوں جو ہندوستان کے مسلمان فرقوں میں رواج پا گیا ہے۔ حضرات میں بخوبی واقف ہوں کہ پردہ کا مسئلہ ہمارے فرقوں میں بڑا بحث طلب مسئلہ ہے۔ اور اس لئے صرف مجھے ہی نہیں بلکہ ہماری قوم کے تمام احباب کو مناسب ہے کہ اس مسئلہ کو اپنے ہم مذہب بھائیوں کے

خیالات اور محسوسات کا خیال اور مناسب لحاظ کر کے چھیڑنا چاہئے۔ حضرات میں یقین کرتا ہوں کہ میرے منھ سے کوئی لفظ ایسا نہیں نکلے گا جو کسی طرح کسی کے خیالات کو، خواہ وہ اُس ہال میں موجود ہو یا ہال کے باہر ہو، آزار پہنچائے۔ میں اس مسئلہ کی نسبت ایسے پیرایہ میں بحث کرنا تجویز کرتا ہوں جو مجھے یقین ہے کہ کسی کو جو میرے لفظ سُنے یا پڑھے ناگوار نہ معلوم ہو۔ یہ مسئلہ بے شک ایک نازک مسئلہ ہے مگر میں سمجھتا ہوں کہ اس پر چار مختلف صورتوں میں، یعنی مذہبی، تمدنی، خفظانِ صحت اور دماغی پہلو سے بحث کی جا سکتی ہے۔

مذہبی صورت کے متعلق میں زیادہ بیان کرنا نہیں چاہتا۔ میں مسلمانوں کے علم دینیات میں مستند شخص ہونے کا مدعی نہیں۔ نہ میں مولوی ہوں نہ مفتی، نہ مسلمانوں کے مذہبی مسائل میں مستند شخص ہونے کا دعوےٰ کرتا ہوں۔ اس ہال میں لوگ موجود ہیں جو زیادہ عالم ہیں۔ مذہبی اعتبار سے اس مسئلہ پر بحث کرنے اور رائے دینے کے زیادہ اہل ہیں۔ اس لئے میں اس سے زیادہ نہیں کہوں گا کہ میں نے ایک دنیاوی آدمی کی حیثیت میں اُس غور اور توجہ کے ساتھ جس کو اس مسئلہ کی اہمیت مقتضی ہے، چھان بین کی ہے اور میری رائے میں یہ مسئلہ حقیقتاً اس قدر مذہب سے تعلق نہیں رکھتا جس قدر رسم و رواج سے۔ بلاشبہ قرآن شریف اور احادیث نبوی میں بے شمار ایسے فقرے ہیں جو اخلاق اور حیا کے سب سے اعلیٰ اصول مقرر کرتے ہیں جو حیا اور تہذیب سکھاتے ہیں جو حسن اور زیبائش کے نمائشی دکھاوے کو منع کرتے ہیں، جو بدعلنی کو مذموم بتاتے ہیں۔ لیکن میں قرآن شریف میں کوئی ایسی آیت نہیں پا سکا جو ایسے پردہ کی جو آج کل ہمارے ہاں مروج ہے، ہدایت کرتی یا اجازت دیتی ہو۔ ہماری مذہبی کتابوں میں کوئی فقرہ ایسا نہیں ہے جو یہ کہتا ہو کہ ہماری عورتیں باہر نہ نکل سکیں یا عورتیں اپنے گھر کی چار دیواری میں محبوس رہیں یا یہ کہ وہ تازہ ہوا نہ کھائیں یا یہ کہ وہ ورزش نہ کریں۔ حضرات! یہ جدید ایجادیں ہیں اور جہاں تک میں معلوم کر سکا ہوں رسم سے زیادہ کسی بات پر ان کی بنیاد نہیں۔

حضرات! میں خوش ہوں کہ میری رائے کی تائید مصنف تاریخ اسلام کے ایسے بڑے شخص نے اپنی جدید تصنیف الاسلام میں کی ہے۔ علاوہ اس کے میری رائے کی تائید میرے دوست آغا خان نے بھی سال گزشتہ میں کانفرنس کے موقع پر کی ہے۔ یہ صاحب جیسا کہ آپ کو معلوم ہے مغربی ہندوستان کے ایک بہت بڑے اور مقتدر فرقے کے روشن خیال مذہبی پیشوا ہیں اور اگر میں نے ان کا مطلب صحیح سمجھا ہے تو وہ اس بارے میں میرے ہم خیال ہیں کہ موجودہ رسم پردہ کا ثبوت قرآن مجید کی کسی آیت سے نہیں مل سکتا۔

پھر حضرات اس مسئلہ کی تمدنی صورت کے متعلق یہ ہے، کہ ہم اپنے بچپن سے اس کے بہت

عادی ہو گئے ہیں، ہم نے اس کو کم و بیش دنیا کے تمام اسلامی ممالک میں رائج دیکھا ہے اور اس لئے ہم قدرتی طور پر تعصب کے ساتھ اس کے مؤید ہو گئے ہیں۔ اور اس کی سختی کی ہر قسم کی اصلاح کے سخت مخالف ہو گئے ہیں۔ چوں کہ ہم پردہ کے معاملہ میں بہت متعصب ہو گئے ہیں اس لئے اس کے فوائد کو بڑھا چڑھا کر مبالغہ کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ اور جو فائدے اس کے ترک کرنے سے متوقع ہیں ان کی طرف سے ہم اپنی آنکھوں پر پٹی باندھ لیتے ہیں۔ ہم اور سوسائٹیوں میں خصوصاً یوروپین سوسائٹیوں میں نقائص اور عیوب معلوم کرنے سے بہت ہی خوش ہوتے ہیں۔ ہم شوق کے ساتھ ہر ایسے معاملہ کو جو ہم اخباروں میں پڑھتے ہیں جس سے کامل آزادی کی وجہ سے عورتوں کی بے حیائی کا ثبوت ملتا ہے پکڑ لیتے ہیں مگر ہم اپنی آنکھوں کو لاکھوں پاک شریف دل باحیا روشن خیال عورتوں کی طرف سے بند کر لیتے ہیں جو مغربی قوموں میں مکانوں اور سوسائٹیوں کو زینت دیتی ہیں۔ بے شک حضرات یہ مسئلہ اتنا اہم ہے کہ چند فقروں میں اس کو ختم نہیں کر سکتے۔ لیکن میں یہ ظاہر کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ عورتوں کی آزادی کے نقصانات چند بے اطمینانی کی قسم کی مثالوں سے جن کا ذکر ہم اخباروں میں پڑھیں لازمی طور پر قائم نہیں ہو سکتے۔

اب میں اس مسئلہ پر حفظانِ صحت کے پہلو سے بحث کرتا ہوں اور اس معاملہ میں حضرات میرا اعتقاد ہے کہ خواہ کتنا ہی اختلاف آراء ہم میں اور باتوں کے متعلق ہو لیکن اس معاملہ میں کوئی اختلاف نہیں ہو سکتا۔ تمدن کے اعتبار سے پردہ اچھا ہے یا برا۔ یا جس طرح بعض لوگ مذہبی مسائل کا مفہوم لیتے ہیں ان کے اجتہاد کے بالکل مطابق ہے یا نہیں۔ ایک بحث طلب بات ہو سکتی ہے۔ مگر میں خیال کرتا ہوں کہ ہماری عورتوں کی صحت اور ان کے جسم پر پردہ کا برا اثر ہونے میں کوئی کلام نہیں سائنس میں کوئی بات دوسری بات سے زیادہ روشن ہے تو وہ یہ ہے کہ انسانی جسم کو پاک ہوا اور مفید ورزش کی ضرورت ہے۔ اگر پردہ کا موجودہ طریقہ قائم رکھا جائے تو یہ ضرورتیں کس طرح پوری ہو سکتی ہیں۔ ہماری عورتوں کو کیوں کر اور کہاں سے مفید ورزش میسر آسکتی ہے۔ اس سے ہماری عورتوں کے جسموں پر پاک ہوا اور ورزش کے نہ میسر آنے کا خیال کرو۔ ان کے جسم کو اور قوموں کی عورتوں کے جسم سے مقابلہ کرو جو پردہ کے دباؤ سے آزاد ہو کر کھلے میدانوں میں جاتی اور آزادی سے پھرتی ہیں، اور اپنے جسم کے مختلف حصوں کو ورزش کراتی ہیں۔ ہماری عورتوں کی صحت کا دوسری قوم کی عورتوں کی صحت سے مقابلہ کرو۔ اعداد کو دیکھو۔ اور ہماری عورتوں کی بڑی تعداد کو دیکھو۔ جو حبس، ناپاک ہوا، اور ورزش نہ ملنے کی وجہ سے دق کے مرض میں مر جاتی ہیں۔ حضرات ہم کبھی تندرست مضبوط اور توانا عورتوں

کی امید نہیں کر سکتے۔ جب تک ہم اُن کو اسی طرح قید میں بند رکھیں جس طرح ہم نے سالہا سال سے کر رکھا ہے اور مضبوط تندرست اور توانا بچوں کی امید نہیں کر سکتے جب تک ہماری عورتیں کم زور بیمار اور نحیف جسم کی رہیں گی۔

حضرات!! اب میں اس مسئلہ کے آخری پہلو کو لیتا ہوں جو سب سے زیادہ اہم ہے اور جس سے میری بحث کو زیادہ تر تعلق ہے۔ اس سے میری مراد تعلیمی پہلو ہے۔ دوسری صورتوں کی نسبت جو کچھ میں نے بیان کیا ہے وہ اس معاملہ پر بھی روشنی ڈالتا ہے۔ پردہ کے رواج کی حالت میں جیسا کہ میں نے دکھایا ہے ہماری عورتیں ضرور کم زور اور نحیف اور بیمار جسم کی ہوں گی لیکن اگر پردہ کی موجودہ سختی آئندہ کے لئے بھی قایم رکھی جاوے تو کیا اُن کو کافی طور سے تعلیم دی جا سکتی ہے؟ ہماری لڑکیاں زیادہ سے زیادہ جب سن بلوغ کو پہونچیں گی یعنی بارہ تیرہ برس کی ہوں گی ضرور ان کی تعلیم ختم ہو جائے گی۔ کیا ہم حقیقتاً اس قدر تھوڑی مدت میں اپنی عورتوں کو صحیح اور لبرل تعلیم دینے کی امید کر سکتے ہیں؟ یہ ناممکن ہے۔ لہذا جس اعتبار سے آپ اس مسئلہ کو دیکھیں۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ تا وقتیکہ ہم کسی حد تک پردہ کی موجودہ سختیوں کو ہلکا کرنے کا تہیہ نہ کریں گے۔ ہم ہمیشہ ایک پیچھے رہ جانے والے، نیم تعلیم یافتہ، ایک کم زور او رنحیف قوم رہیں گی۔ یہ معاملہ ہے جس پر میں اپنے روشن خیال دوستوں کی توجہ کو مبذول کراؤں گا، یہ امید کہ ان برائیوں کو رفع کرنے کے لئے جن سے ہم تکلیف اُٹھا رہے ہیں جو کچھ بن پڑے کیا جاوے۔

اب میں محمدن یونیورسٹی کے مضمون پر آتا ہوں جس نے تمام ہندوستان کے مسلمانوں میں اس قدر دلچسپی پیدا کر رکھی ہے۔ میری حقیر رائے یہ ہے کہ ایک محمدن یونیورسٹی اگر مناسب طور سے چلائی جائے اور کافی طور سے اُس کی امداد کی جائے تو ہماری قوم کے لئے بڑے فائدے کی چیز ہو گی مجھے یقین ہوتا ہے کہ ایک اچھی یونیورسٹی جو ایک صحیح و مستحکم بنیاد پر چلائی جائے ہم میں ضرور ایک جوش قایم رکھے گی۔ اخلاقی اصول دل نشین کرائے گی۔ عمدہ اطوار کی تربیت دے گی۔ اور سب سے زیادہ یہ کہ صحیح مذہبی تعلیم دے گی جس کے بغیر ہم علحدہ علحدہ ٹکڑوں میں منتشر ہو جائیں گے اور کبھی ایک اور متحدہ قوم بن جانے کی امید نہ کر سکیں گے۔ مگر حضرات دقتیں ہمارے راستہ میں بہت بڑی ہیں ایسی مذہبی تعلیم دینا جو وسیع اور روشن اور عام ہو، اور جو تنگ اور فریقانہ تعصبات کی اکسانے والی نہ ہو کوئی آسان کام نہیں ہم بدقسمتی سے اتنی جماعتوں اور فرقوں میں منقسم ہو گئے ہیں کہ مجھے کسی ایسی تعلیم سے مایوسی ہے جو ایک حد تک اُن ہی مباحثوں اور اختلافات کو تازہ نہ کر دے، جن کو رفع کرنے اور جن کی بیخ کنی کرنے کی ہم سب کو خواہش ہے۔ علاوہ ازیں ایک محمدن یونیورسٹی کے قایم ہونے میں مسلمانوں کے لئے تمام

ہندوستان میں بہت سے مفید کالجوں اور تعلیمی انسٹی ٹیوشنوں کا موجود ہونا فرض کرلیا جاتا ہے۔ ہم بغیر یونیورسٹی کے کام چلا سکتے ہیں۔ مگر ان مقامی تعلیمی انسٹی ٹیوشنوں کے بغیر کام نہیں چلا سکتے۔ بنیاد پہلے رکھی جائے اور وہ مضبوط اور ٹھوس ہو۔ یونیورسٹی کی بالائی عمارت کا ایک کمزور بنیاد پر، جیسی کہ آج کل ہے، قائم کرنا عبث اور فضول ہے۔ بمبئی ہی کو دیکھو۔ جس سے شاید میں بہ نسبت اور بہت سے حضرات کے جو یہاں میری تقریر سن رہے ہیں زیادہ واقف ہوں۔ اس بڑے شہر میں ہم کو تعلیم کے لئے کیا آسانیاں ہیں۔ ہمارے ہاں اول تمام بمبئی میں پھیلے ہوئے چند چھوٹے مکتب ہیں جو بہت اطمینان کے لائق حالت میں نہیں ہیں۔ پھر ہمارے ہاں انجمن اسلام کے اسکول ہیں جو بے شک انٹرنس تک کی تعلیم دیتے ہیں۔ مگر ان مدارس کو کافی طور سے امداد میسر نہیں ہے۔ اعلیٰ جماعتیں آدھی خالی ہیں۔ رہے کالج۔ تو ہمارے پاس محمدن کالج تو بالکل نہیں ہیں اور ہمارے مذہب کے بہت تھوڑے طلباء ایسے کالجوں میں جو موجود ہیں داخل ہوئے ہیں۔ میرے نزدیک یہ سب باتیں نہایت بے اطمینانی کی ہیں۔ احاطہ بمبئی کے مسلمانوں کی آبادی کا لحاظ کرکے ہائی اسکولوں اور کالجوں میں طلباء بہت تھوڑے ہیں۔ حضرات میں پہلے ان برائیوں کو رفع کرنا پسند کروں گا۔ میں پہلے اپنے سکنڈری اور ہائی اسکولوں کو اور کالجوں کو اس احاطے کے مسلمان لڑکوں سے بھرنا پسند کروں گا۔ پیشتر اس کے کہ میں اس کا یقین کرلوں کہ اس احاطہ مسلمان لڑکوں کے فائدے کے لئے ایک محمدن یونیورسٹی ضروری ہے۔ فرض کیا کہ ہمارے پاس ایک محمدن یونیورسٹی ہو۔ احاطہ بمبئی سے کتنے طلباء اس میں داخل ہوں گے؟ مجھے خوف ہے کہ داخل ہوئے تو بہت ہی تھوڑے ہوں گے۔ اس لئے جہاں تک اس پریسیڈنسی سے تعلق ہے۔ ابھی ہمیں کسی محمدن یونیورسٹی کی ضرورت نہیں ہے۔ میں اور صوبوں کی ضرورتوں کے متعلق وثوق کے ساتھ کہنے کا دعوے نہیں کرتا۔ حضرات یہی وہ سب باتیں ہیں جن پر میں آپ کو صلاح دینی ضروری سمجھتا ہوں۔

مجھے خوف ہے کہ میں نے آپ کا وقت بہت زیادہ صرف کیا اور مجھے آپ کی معافی کا مستدعی ہونا چاہئے۔ آخر میں میں شوق سے امید کرتا ہوں کہ جو کام اس کانفرنس میں کیا جاوے وہ عملی قسم کا ہوگا جس سے عمل وفعل پیدا ہوں گے نہ محض الفاظ اور تقریریں ہمیں جس چیز کی ضرورت ہے وہ ایمان داری اور دل سے کام کرنا ہے اور اُس کام کے لئے روپیہ ملنا ہے۔ نرے رزولیوشن کافی نہیں۔ اور اگر ہم صرف تقریروں سے شروع کریں اور تقریروں پر ختم کریں تو ہمارا آج کا یہاں اجتماع بہت تھوڑی عملی قیمت کا ہوگا۔ پیشتر اس کے کہ میں بیٹھ جاؤں میں ایک دفعہ اور اس عزت کا جو مجھے دی گئی ہے اور ڈیلیگیٹس کا اس بڑی تکلیف کی بابت جو انھوں نے ہمارے اجلاسوں میں شریک ہونے کے لئے کی ہے

شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں۔ اور مجھے کانفرنس کے عہدہ داروں اور سکرٹریوں کا بھی ان کی محنت کی بابت جس کے بغیر ہم مل کر جمع ہو نہیں سکتے تھے شکریہ ادا کرنا چاہیئے۔ مجھے ابھی اور روزیٹر صاحبان کا اُن کی امداد اور ہمت افزائی کی بابت بھی شکریہ ادا کرنا چاہیئے اور میں فرض کر کے پیشگی شکریہ چندہ دینے والوں کا ان کے فیاضانہ چندوں کی بابت ادا کرتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ ان کی ذاتی سرگرمی اور دلچسپی اور اوروں کی کوششوں کی جنھوں نے کانفرنس قایم کی ہے پسند فرمانے کی علامت ہے۔ میں بھروسہ کرکے کہ خدائے تعالے ہم کو طاقت اور عقل اپنے غور و مشورہ کے کام کو چلانے کے لئے عطا فرمائے اور ہمارے رزولیوشن ہماری قوم کی ترقی اور فائدے کے لئے عملی اور مفید نتائج پیدا کریں گے۔ اپنی جگہ پر بیٹھنے کے لئے آپ کی اجازت چاہتا ہوں۔

اجلاس ہیزدہم

منعقدہ لکھنؤ ۱۹۰۴ء

صدر سر تھیوڈور مارسین سابق پرنسپل ایم اے او کالج علی گڑھ

حالات صدر

سر تھیوڈور مارسین ایک علمی خاندان کے فرد ہیں۔ ان کے والد ماجد انگلستان کے طبقہ علما میں سے تھے اور صاحب تصنیف تھے۔ سر تھیوڈور کے ابتدائی عمر کے حالات ہم کو معلوم نہیں۔ صرف اس قدر جانتے ہیں کہ وہ "ٹرینٹی کالج کیمبرج" کے گریجوئٹ ہیں۔ یونیورسٹی چھوڑنے کے بعد وہ اول بطور اتالیق مہاراجہ چھتر پور ہندوستان میں تشریف لائے جو بندیلکھنڈ میں ایک راجپوت ریاست ہے۔ بعد ازاں ۱۸۸۹ء میں



سر تھیوڈور ماریسن

صدر اجلاس هیز دهم کانفرنس (لکھنؤ سنه ۱۹۰۴ ع)

مسٹر تھیوڈور بیک نے جو اس زمانہ میں محمدن اینگلو اورینٹل کالج علی گڑھ کے پرنسپل اور مسٹر مارسین کے دوست تھے۔ ان کو محمدن کالج میں انگریزی زبان کا پروفیسر مقرر کر کے بلا لیا اور وہ بہت جلد الٰہ آباد یونیورسٹی میں انگریزی زبان کے لایق پروفیسروں میں شمار ہونے لگے۔ سرسید علیہ الرحمۃ ان کو بہت عزیز رکھتے تھے مسٹر مارسین محض علم کے میدان ہی کے مرد نہ تھے بلکہ ورزشی کھیلوں کے میدان میں بھی ان کو امتیاز حاصل تھا۔ وہ فٹ بال بہت عمدہ کھیلتے تھے اور اس کھیل کو انھوں نے محمدن کالج میں رواج دیا۔ نوجوانی زمانہ میں وہ بڑے شہسوار تھے اور بھالے سے سؤر کا شکار تعطیل کے دن ان کا دل پسند مشغلہ تھا۔

علاوہ اپنے فرض منصبی کے کالج کی دیگر مفید تحریکات اور بالخصوص مسلمانوں کی تعلیمی تحریکات میں وہ حصہ لیتے تھے۔ چنانچہ علی گڑھ کالج کی امداد کے واسطے جب برادرہڈ (بھائی چارہ) قایم ہوا تو اس کے صدر مسٹر مارسین قرار پائے اور اس کے سالانہ اجلاس میں جو بہ حیثیت صدر انھوں نے خطبۂ صدارت پڑھا وہ اس قدر مقبول ہوا کہ سرسید نے اس کو اسٹریچی ہال کے برآمدہ کے ستون پر کندہ کرا دیا تاکہ مسلمانوں کی موجودہ اور آئندہ نسلیں اس سے مستفید ہوں۔ برادرہڈ کے ہر ممبر کو اپنی ماہوار آمدنی پر ایک فی صدی کالج کو دینا لازمی تھا۔ مسٹر مارسین کو اس زمانہ میں بہ حیثیت پروفیسر کالج سے مبلغ چار سو روپئے اور بہ حیثیت پرووسٹ بورڈنگ ہاؤس مبلغ ایک سو روپیہ یعنی کل پانچ سو روپیہ ماہوار ملتے تھے۔ مگر وہ اپنی نج کی آمدنی مبلغ نو سو روپیہ ماہوار کو جو ان کے والد سے ان کو ترکہ میں ملی تھی شامل کر کے اپنی کل آمدنی پر مبلغ چودہ روپیہ ماہوار چندہ ادا کیا کرتے تھے۔

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ اجلاس میں جس مقام پر بھی وہ منعقد ہوتا مسٹر مارسین شرکت کرتے تھے۔ مختلف مقامات میں مدارس اسلامیہ قایم ہونے کی جب کانفرنس کی طرف سے تحریک ہوئی تو مسٹر مارسین نے گرم جوشی سے اس میں حصہ لیا اور مختلف مشہور قصبات مثل مارہرہ ضلع ایٹہ تلہر ضلع شاہجہاں پور، جلالی ضلع علی گڑھ وغیرہ میں ایک بار سے زیادہ جا کر انھوں نے مدارس اسلامیہ کا افتتاح کیا۔ اور جب تک وہ یہاں رہے ان مدرسوں کے حالات سے دلچسپی لیتے رہے۔ چنانچہ مارہرہ کا اسلامیہ مڈل اسکول اُس وقت کی یادگار ہے اور "مارسین اسلامیہ اسکول مارہرہ" کے نام سے موسوم ہے۔ مسٹر مارسین نے علی گڑھ کالج کی ملازمت میں باوجود ایک غیر مذہب اور غیر قوم کا شخص ہونے کے کبھی روپیہ کا لالچ نہیں کیا اور باوجودے کہ سرسید مرحوم ان کو بہت عزیز رکھتے تھے اُنھوں نے اپنی ترقی تنخواہ کی کبھی خواہش نہیں کی۔ مبلغ چار سو روپیہ ماہوار جو ان کو ۱۸۸۹ء میں بہ حیثیت پروفیسر ملتے تھے جب کہ ان کا تقرر ہوا تھا وہی چار سو ماہوار ان کو دس برس کی ملازمت

کے بعد ۱۸۹۹ء میں بھی ملتے تھے جب کہ وہ واپس نہ آنے کے قصد سے ولایت گئے بحیثیت پروسٹ نگرانی بورڈنگ ہاؤس کا مبلغ ایک سو روپیہ ماہوار الاؤنس البتہ ان کی آمدنی میں اضافہ تھا مگر وہ ایک جداگانہ کام کا معاوضہ تھا۔

کالج سے علیحدگی کے خیال سے ولایت جانے کے بعد ستمبر ۱۸۹۹ء میں مسٹر بیک پرنسپل علیگڑھ کالج کا انتقال ہوگیا اور ٹرسٹیان کالج نے کالج کی پرنسپلی مسٹر ماریسن کو بذریعہ تار پیش کی۔ انھوں نے اس کو قبول کیا اور اکتوبر ۱۸۹۹ء میں بحیثیت پرنسپل علی گڑھ کالج ولایت سے تشریف لائے اور عرصہ پانچ سال تک عہدۂ پرنسپلی کے فرائض کو بہت کامیابی سے انجام دیا۔ ان کے زمانۂ پرنسپلی میں علی گڑھ کالج نے تعداد طلباء، نتائج امتحان اور عام وقعت اور شہرت میں بہت ترقی کی اور ممالک غیر مثل ایران اور جنوبی افریقہ سے طلبہ علی گڑھ کالج میں تعلیم پانے کی غرض سے آنے لگے۔

مسٹر ماریسن اور ان کی بیوی گو اپنے خرچ کے اخراجات میں بہت سیر چشم تھے مگر کالج کے ایک ایک پیسہ کی حفاظت کرتے تھے مسٹر ماریسن نے ایک بار سیکنڈ ایر کلاس کو اردو سے انگریزی ترجمہ کرانے کی غرض سے ایک اردو کی کتاب کالج بک ڈپو سے منگائی۔ مینیجر بک ڈپو نے کچھ عرصہ بعد کتاب مذکور کی قیمت کا بل دفتر پرنسپل کے سائر خرچ میں سے ادا ہونے کو پیش کیا۔ مسٹر ماریسن نے باوجودیکہ وہ آنریری مینیجر بک ڈپو پر پورا اعتماد رکھتے تھے مگر پھر بھی اس خیال سے کہ کہیں غلطی سے دوبارہ بل پیش ہوا ہو اس کے متعلق پوری جستجو کے بعد اس بل کو پاس کیا حالانکہ وہ بل ایک روپیہ سے زائد کا نہ تھا اور انھوں نے اس وقت کہا کہ اگر یہ بل میرا ذاتی ہوتا تو میں اس کے متعلق اس قدر تفتیش نہ کرتا۔ مگر چونکہ وہ کالج سے ادا ہوگا اس لئے اس کے اس قدر تجسس کی ضرورت ہوئی۔

ابتدائی زمانہ سے علی گڑھ کالج میں انگریزوں کا تقرر بحیثیت پروفیسر مبلغ چار سو روپیہ ماہوار پر ہوتا تھا مگر مسٹر ماریسن نے اس کو گھٹا کر مبلغ تین سو تیس روپیہ ماہوار کر دیا۔ مسٹر براؤن اور مسٹر ٹول کا تقرر اسی ابتدائی تنخواہ پر ہوا اور ہندوستانی اسسٹنٹ پروفیسروں کو جو ایم اے ہوتے تھے مسٹر ماریسن مبلغ ۹۰ روپیہ ماہوار اور اسکول میں ماسٹروں کو جو ایم اے ہوں چالیس روپیہ ماہوار اور بی اے کو تیس روپیہ ماہوار اور جو بی اے پاس نہ ہوں ان کو پچیس روپیہ ماہوار تنخواہ دیتے تھے۔ حالانکہ اس سے قبل سرسید کے زمانہ میں معمولی گریجویٹ کی تنخواہ اسکول میں ساٹھ روپیہ ماہوار تھی۔

مسٹر ماریسن کالج کی ایک کوٹھی میں جو ان دنوں میں پرنسپل کے واسطے مخصوص تھی رہتے تھے اور اس کا کرایہ ادا کرتے تھے۔ بعض وجوہ سے اس بات کی ضرورت پیش آئی کہ سید راس مسعود کو جو سرسید

کے پوتے اور اس زمانہ میں کم سن تھے مسٹر مارسین کے ہمراہ رکھا جائے۔ مسٹر مارسین اور ان کی بیوی نے بلا کسی معاوضہ کے کئی سال تک سید راس مسعود کو نہایت محبت سے اپنے پاس رکھا۔ سید راس مسعود کی وجہ سے اس کوٹھی میں ایک دو کمرہ بڑھانے کی ضرورت پیش آئی۔ اس توسیع عمارت کا خرچہ کئی سو روپیہ تھا مسٹر مارسین نے نہ کالج کے ذمہ ڈالا اور نہ سید راس مسعود کے حساب میں لکھا بلکہ اپنی جیب سے ادا کیا۔

مسٹر مارسین جب علی گڑھ کی پرنسپلی چھوڑنے والے تھے تو میں نے اس خیال سے کہ شاید ترقی کے خیال سے مسٹر مارسین کالج سے علیحدگی کا ارادہ چھوڑ دیں ان سے کہا کہ الہ آباد اور لکھنؤ کالجوں کے پرنسپلوں کو مبلغ پندرہ سو روپیہ ماہوار تنخواہ ملتی ہے اور وہاں کے پرنسپلوں کو اس قدر کام کرنا نہیں پڑتا جس قدر کہ آپ کو کرنا ہوتا ہے۔ لہذا آپ کی تنخواہ بھی ایک سو روپیہ سال کے اضافہ سے پانچ سال میں پندرہ سو روپیہ ماہوار ہو جانی چاہیئے۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ ٹرسٹیان کالج بخوشی منظور کریں گے۔ مسٹر مارسین نے کہا نہیں ترقی کی کوئی ضرورت نہیں جو کچھ مجھ کو ملتا تھا وہ بھی میری ضرورت سے بہت زیادہ تھا اور میں نے اس عرصہ میں اس قدر روپیہ جمع کر لیا ہے۔ میں کمی تنخواہ کی وجہ سے یہاں سے نہیں جاتا ہوں اور ابھی میری ایسی عمر ہے کہ ولایت میں بھی مجھ کو کام مل جائے گا۔ اور پنتالیس برس کی عمر کے بعد ولایت میں کوئی نیا کام ملنا مشکل ہوگا۔

ایک روز پھر میں نے مسٹر مارسین کی کوٹھی پر ان کو کالج سے نہ جانے کی ترغیب دی کہ اتنے میں مسز مارسین تشریف لائیں اور پوچھنے لگیں کہ کیا باتیں ہو رہی ہیں۔ مسٹر مارسین نے جواب دیا کہ یہ مجھ کو سمجھا رہے ہیں کہ میں علی گڑھ سے نہ جاؤں۔ مسز مارسین نے کہا اے جناب اب اس قسم کی گفتگو سے کوئی فائدہ نہیں جو فیصلہ کہ ہو چکا ہے وہ اب کسی صورت سے بدل نہیں سکتا اس کے بدلنے کی صرف ایک ہی صورت ہے جو آپ پسند نہ کریں گے اور وہ یہ ہے کہ اگر خدانخواستہ ہندوستان میں غدر ہو جائے تو اس وقت مسٹر مارسین ولایت جانے کا ارادہ چھوڑ دیں گے اور کالج کے طلبہ کی ایک پلٹن طیار کر کے غدر کو فرو کرنے کی کوشش کریں گے اور جب تک امن و امان قایم نہ ہوگا ہندوستان سے باہر قدم نہ رکھیں گے۔

مذکورہ بالا بیانات سے معلوم ہوگا کہ ایک انگریز اپنی اولاد کی تعلیم و تربیت کو کس قدر اہم سمجھتا ہے اور سب سے زیادہ اس کے نزدیک سلطنت انگریزی کا استحکام ہے جس کے واسطے وہ ہر چیز کو قربان کرنے کے واسطے تیار ہو جاتا ہے۔

مسٹر ماریسن کے آخر زمانہ پرنسپلی میں جب کہ یونیورسٹی بل امپیریل لیجسلیٹو کونسل میں پیش تھا تو مسٹر ماریسن بہ حیثیت ماہر فن تعلیم کے چند ماہ کے لئے وائسرائے کی کونسل کے ممبر مقرر ہوئے اور مسلمانوں نے ان کی خدمات کے اعتراف میں ان کو دسمبر ۱۹۰۴ء میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ اجلاس مقام لکھنؤ کا صدر بنایا۔ بعد ازاں وہ کالج کی ملازمت سے مستعفی ہو کر ولایت چلے گئے۔ وہاں کچھ عرصہ قیام کے بعد لارڈ مارلے نے جو اس زمانہ میں وزیر ہند تھے ان کو اپنی کونسل کا ممبر مقرر کر لیا۔ اس کام کو انھوں نے بہت خوبی سے انجام دیا اور اس حسن خدمت کے صلہ میں ان کو کے سی آئی ای کا خطاب ملا۔ اور جس وقت کہ پبلک سروس کمیشن ہندوستان کے واسطے مقرر ہوا تو مسٹر ماریسن اس کمیشن کے ممبر مقرر ہوئے اور اس حیثیت سے دو سال تک دیگر ممبران کمیشن کے ساتھ موسم سرما میں ہندوستان کا دورہ کرتے رہے۔

جنگ عظیم شروع ہونے پر سر تھیوڈور ماریسن بہ حیثیت کرنیل انگریزی فوج میں شامل ہوئے اور مشرقی افریقہ کے مقبوضات جرمنی میں جو انگریزوں کے قبضہ میں آئے گورنر مقرر ہوئے۔

بعد اختتام جنگ مسٹر ماریسن کو کے سی ایس آئی کا خطاب ملا اور انگلستان واپس آنے پر آرمسٹرونگ کالج نیوکیسل ان ٹائن کے پرنسپل مقرر ہوئے اور ابھی تک اس عہدہ کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ علاوہ انگریزی لٹریچر کے سر تھیوڈور ماریسن کو پولٹیکل اکانومی اور پولٹیکل سائنس میں خاص ملکہ ہے اور انھوں نے ہندوستان کے متعلق پولٹیکل اکانومی میں ایک مستند کتاب لکھی ہے جو بعض یونیورسٹیوں کے نصاب تعلیم میں داخل ہے۔

انھوں نے محمدن کالج علی گڑھ کی بھی ایک مختصر تاریخ لکھی ہے۔ محمدن کالج میں ایک عرصہ تک رہنے کی وجہ سے سر تھیوڈور ماریسن کو مسلمانوں کے ساتھ خصوصیت پیدا ہو گئی ہے۔ گو اب مدت دراز یعنی عرصہ بائیس سال سے وہ علی گڑھ کالج سے جدا ہیں اور اپنے وطن انگلستان میں رہتے ہیں۔ مگر جب کبھی ضرورت ہوتی ہے تو وہ سلطنت ٹرکی اور مسلمانوں کی حمایت میں برٹش گورنمنٹ کی توجہ کی غرض سے پرزور مضامین لکھتے رہتے ہیں۔ اور اپنے اثر سے مسلمانوں کو فائدہ پہونچاتے ہیں۔

نوٹ: حالات نوشتہ میر ولایت حسین خاں صاحب سپرنٹنڈنٹ دفتر کانفرنس۔

خطبۂ صدارت

صاحبو! میں آپ کا دل سے مشکور ہوں کہ آپ نے مجھ کو اس جلسہ کا پریسیڈنٹ بننے کی عزت دی۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس معزز عہدہ کے لئے مجھ کو منتخب کرنے سے آپ لوگوں کی خواہش ہے کہ ہندوستان سے رخصت ہونے سے قبل میں اُن تعلیمی مسئلوں پر اپنی رائے ظاہر کروں کہ جن کا تعلق مسلمانوں سے ہے۔ مجھ کو یقین ہے کہ آپ نے مجھ کو اس کرسی پر بیٹھنے کی عزت اس لئے نہیں دی ہے کہ میں دل خوش کُن اور چکنی چپڑی باتیں بیان کر کے تھوڑی دیر کے لئے واہ واہ سنوں۔ نہیں جو عزت آپ نے مجھ کو دی ہے میں اُس کا ہرگز مستحق نہ ہوں گا۔ اگر مجھ کو آپ کے سامنے اصل حقیقت صاف صاف بیان کر دینے میں کچھ بھی تامل ہو۔ اگر میں کوئی ایسی بات کہوں جس سے آپ کو تکلیف ہو تو میں امید کرتا ہوں کہ آپ یقین کریں گے کہ وہ اُس قومی ہمدردی کی وجہ سے کی گئی ہے جو مجھ کو مسلمانوں کی ترقی کے ساتھ ہے۔

صاحبو! میں سمجھتا ہوں کہ اس کانفرنس کے جمع ہونے کی اصلی غرض مسلمانوں کی بہتری کی تجاویز سوچنا ہے۔ ہمارا مجمع اس معنی میں تعلیمی کانفرنس نہیں ہے کہ اُس کا بڑا کام درسی کتابوں یا نصاب تعلیم پر غور کرنا ہو۔ بلکہ ہمارا مجمع اس بنا پر تعلیمی کانفرنس ہے کہ ہماری رائے میں ہمارے اصلی مقاصد کے حصول کا تعلیم ہی ذریعہ ہے۔ یعنی ہم سمجھتے ہیں کہ ہندوستان کے مسلمان اگر ترقی کر سکتے ہیں تو تعلیم ہی کے ذریعہ سے کر سکتے ہیں۔

جس مرض کا ہم کو علاج کرنا ہے وہ دو قسم کا ہے اوّل مالی افلاس۔ دوسرے دماغی و اخلاقی پستی سرسید جو آپ صاحبوں سے ایسے موقعوں پر محبت بھری درستی کے ساتھ خطاب کرتے تھے۔ عموماً اس زمانہ کے مسلمانوں کی پستی کو بیان کیا کرتے تھے۔ اگرچہ وہ طریقہ گفتگو میری حالت کے مناسب نہیں ہے۔ مگر آپ صاحب اگر بُرا نہ مانیں اور اجازت دیں تو میں یہی کہوں گا کہ آپ کی موجودہ حالت علمی افلاس کی حالت ہے۔ اور اسی وجہ سے وہ دو بڑے مرض جو مسلمانوں کے لاحق حال ہیں مالی و علمی افلاس کہے جا سکتے ہیں۔

ان دو امراض میں سے مالی افلاس کی طرف ہم کو سب سے اوّل توجہ کرنی چاہئے۔ کیونکہ وہ سب سے اہم ہے۔ اور اس کے اثر کو ہر شخص محسوس کرتا ہے۔ کئی سال سے یہ کانفرنس مسلمانوں کو تعلیم کی توجہ دلا رہی ہے۔ اور خیال یہ ہے کہ اس ذریعہ سے اُن کا افلاس دور ہو جائے گا۔ مگر حال میں ہندوستان میں ایسے خیالات ظاہر کئے گئے ہیں جو تعلیم کے اس مفہوم کے بالکل متناقض ہیں۔ اور

اس وجہ سے مجھ کو ان خیالات پر غور کرنے کے لئے تھوڑی دیر رُکنا چاہیئے۔ وہ خیال کہ جس کی طرف میرا اس وقت اشارہ ہے یہ ہے کہ ہم کو تعلیم محض علم کی غرض سے حاصل کرنی چاہیئے۔ یعنی طلباء کا کالج میں تعلیم پانے سے مقصد محض دماغی ترقی ہونا چاہیئے۔ آئندہ اس سے کوئی دنیاوی نفع حاصل ہو یا نہ ہو یہ بے شک تعلیم کے متعلق ایک عمدہ خیال ہے۔ اور بعض ایسی لطیف طبیعتیں بھی ہوتی ہیں جن کی نظروں میں دولت کے محسوس فائدوں کے مقابلہ میں علم کی خشک مسرتیں زیادہ قابل قدر ہوتی ہیں۔ مگر عموماً لوگوں کے ایسے خیالات نہیں ہوسکتے۔ اور اس وجہ سے ہم اس اصول پر کسی عام تعلیمی پالسی کو مبنی نہیں کر سکتے ہیں۔ اور نہ میں اس بنا پر عموماً مسلمانوں کو تعلیم کی طرف متوجہ کروں گا اور میرے نزدیک ہم ایمانداری سے نہیں کہہ سکتے ہیں کہ یورپ میں عام طور سے تعلیم کا یہی مفہوم ہے۔ اکثر متوسط الحال لوگ داور یہی جماعت سب سے زیادہ تعلیم یافتہ ہوتی ہے) اپنی اولاد کو بہتر سے بہتر تعلیم اس وجہ سے دلاتے ہیں کہ وہ سمجھتے ہیں کہ اس کی بدولت وہ عزت سے روٹی کما سکیں گے۔ یورپ کے دیگر ممالک کی نسبت جرمنی میں زیادہ علم کا شوق ہے۔ مگر وہاں بھی یونیورسٹی کی تعلیم متوسط درجہ کے ہر پیشہ کے لئے بجز تجارت کے لازمی ہے۔ اس لئے زیادہ تر طلباء یونیورسٹیوں میں اسی غرض سے داخل ہوتے ہیں کہ وہ کسی پیشہ کے قابل بنیں۔ اور ان کا مقصد دماغی ترقی ہی نہیں ہوتا۔ بجز ایک ضروری مستثنے اکے جس کا میں آئندہ ذکر کروں گا۔ ہندوستان کے متوسط الحال لوگوں کی نسبت میری یہ رائے ہے۔ اور اسی کی بنا پر میں مسلمانوں کو تعلیم کی طرف متوجہ کرتا ہوں۔ عام طور سے میں تعلیم کو ایک علمی ذریعہ ایک علمی مقصد کے حاصل کرنے کا سمجھتا ہوں اور وہ مقصد ہماری حالت کی مالی درستی ہے۔ اس لئے مجھ کو یقین ہے کہ آپ کے نزدیک بھی اس کانفرنس پر تعلیمی کانفرنس کا لقب عائد ہوسکیگا۔ اگر ہم اس میں ایسی تجاویز پر بحث کریں کہ جن سے متوسط درجہ کے مسلمانوں کا افلاس دور ہو۔

جب کہ میں متوسط درجہ کے مسلمانوں کے افلاس کا ذکر کرتا ہوں تو اُس سے میرا مطلب جمع شدہ یا آبائی دولت کی عدم موجودگی پر اظہار افسوس نہیں ہے۔ جو آدمی کو عمر بھر سستی میں گزارنے کا سہارا ہوتی ہے۔ بلکہ مجھ کو افسوس اس بات کا ہے کہ متوسط درجہ کے مسلمانوں کا بڑا حصہ معزز اور مفید پیشوں میں کامیابی کے ساتھ مشغول نہیں ہے۔ اور مجھ کو یہ بتانے کی چنداں ضرورت نہیں ہے کہ ایسا کیوں ہے۔ یورپین خیالات کے اثر سے مسلمانوں کے قدیم پیشوں کی شکلیں بدل گئی ہیں۔ سرکاری ملازمت کے شرائط، طبابت، وکالت ہر صیغہ میں بڑی تبدیلی ہوگئی ہے۔ مگر مسلمانوں نے اپنے تئیں اس تبدیلی کے موافق نہیں بنایا۔ ان میں اب پیشوں کے لئے کافی سلیقہ اور سمجھ نہیں ہے۔ اس لئے

وہ کافی روپیہ نہیں کما سکتے۔ یہی افلاس ہے جس پر میں افسوس کرتا ہوں اور جو قوم کے لئے بڑے بڑے تعلقہ اور موروثی دولت کے نہ ہونے سے زیادہ مضر ہے۔ آپ ہم غور کریں گے کہ یہ افلاس کیوں کر دور ہو سکتا ہے۔ تقریباً ہر ملک کے اوسط درجہ کے لوگوں کے لئے دولت کمانے کے لئے دو بڑے ذریعے ہیں۔ ان میں سے اول اس قسم کے پیشے ہیں جیسے کہ ڈاکٹری، وکالت، انجنیری اور ملازمت سرکاری۔ دوسرا ذریعہ دولت کمانے کا تجارت اور حرفت ہے۔ اب اول قسم کے پیشوں کی نسبت مجھ کو زیادہ بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے کیوں کہ ہندوستان کے کل لوگ جو ان پیشوں کو کرتے ہیں (یہاں تک کہ مسلمان بھی) انگریزی تعلیم کا اُن کے لئے کارآمد اور مفید ہونا تسلیم کرتے ہیں۔ اس کے متعلق میں صرف اتنا کہوں گا کہ یہ تعلیم کم از کم موجودہ بی اے درجہ تک کی ہونی چاہئے۔ کیونکہ اس سے کم درجہ میں طالب علم کو کافی مزاولت انگریزی کی نہیں ہوتی اور وہ اس قابل نہیں ہوتا کہ وہ بطور خود مطالعہ کو جاری رکھ سکے۔ میرے نزدیک یہ ایک اچھی تعلیم عامہ کا درجہ ہے جس کو غلطی سے تعلیم یونیورسٹی کا لقب دیدیا گیا ہے۔ دراصل امتحان بی اے صرف وسطی تعلیم کے خاتمہ کا نام ہے مگر محض نام کوئی اہم چیز نہیں ہے۔ بڑی بات قابل لحاظ یہ ہے کہ ایک پیشہ ور شخص کی تعلیم عامہ اس سے کم درجہ کی نہ ہونی چاہئے۔

جن ذرائع سے کہ مسلمانوں کو تعلیم عامہ حاصل ہو اُن کے باب میں مختلف رائیں ہیں۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ اس وقت تک ہندوستان کے مسلمان گریجوائٹوں کا بہت بڑا حصہ علی گڑھ کا تعلیم یافتہ ہے۔ اور میرے بعض دوست سمجھتے ہیں کہ ایک مسلمان کو علی گڑھ کے سوا کسی دوسری جگہ سے بی اے پاس کرنا خلاف حمیت قومی ہے۔ ان صاحبوں کے نزدیک مسلمانوں کے لئے تعلیم بی اے کا مرکز علی گڑھ ہونا چاہئے۔ اور وہ سمجھتے ہیں کہ مسلمانوں کے لئے تعلیم بی اے کا کسی دوسری جگہ پر انتظام کرنا غلطی ہے۔ مجھ کو یاد ہے۔ ایک وہ بھی زمانہ تھا جب کہ لوگ سمجھتے تھے کہ کوئی اسلامی ہائی اسکول علی گڑھ سے باہر نہیں ہونا چاہئے۔ مگر اب ہائی اسکولوں کے متعلق وہ خیال جاتا رہا ہے۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ بی اے کے درجہ کے کالجوں کے متعلق بھی یہ خیال بہت عرصہ تک نہ رہیگا قوم کی مالی فلاح کو ترقی دینے کے لئے ہم چاہتے ہیں کہ جہاں تک ہو سکے ایسے مسلمانوں کی تعداد کو بڑھائیں جو شریف پیشوں کے لئے تیار ہوں اور تعلیمی مرکز کے شوق میں ہم کوئی ایسی بات نہ کریں جو مسلمان نوجوان کی زیادتی کو زندگی کے مختلف پیشوں میں روکنے والی ہو مسلمانوں کے موجودہ کالج شوق سے تعلیم بی اے کا پورا انتظام کریں لوکل کمیٹیاں مسلمان طلبہ کے گورنمنٹ و مشن کالجوں میں تعلیم پانے کے لئے وظائف بہم پہونچائیں۔ اس سے علی گڑھ کی اہمیت میں جو مسلمانوں کی تعلیمی اسکیم میں اس کو

حاصل ہے سرمو فرق نہ آئے گا۔ وہ جیسا کہ اب ہر حصہ ہندوستان کے مسلمانوں کی متفقہ کوششوں اور قومی جوش کا مستحق ہے ویسا ہی اس وقت رہے گا۔ کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ وہ اس وقت مسلمانوں کے علوم اور اعلیٰ خیالات کا مرکز نہ ہوگا۔ رہے پیشے اُن کے لئے محض تعلیم عامہ کی ضرورت ہے۔ جو میرے نزدیک بی اے درجہ تک کی کافی ہے۔ اور اس قسم کی تعلیم جس قدر عام ہو اُسی قدر قوم کی مالی بہبودی کے لئے بہتر ہے۔

لیکن اس قسم کے پیشے کسب دولت کے دو بڑے ذرائع سے صرف ایک قسم کا ذریعہ ہیں۔ اور دوسرا ذریعہ حرفت اور تجارت کا بہت زیادہ تعداد اور افراد کے لئے وجہ معاش مہیا کر سکتا ہے اور اس کی مدد سے بہت زیادہ دولت پیدا ہو سکتی ہے۔ مگر بدقسمتی سے یہ ایسا کام ہے کہ جو شمالی ہندوستان کے بہت کم مسلمانوں کے ہاتھ میں ہے۔ اکثر مسلمان سمجھتے ہیں کہ تجارت اور حرفت بقالی کے ہم معنی ہے۔ لیکن یہ بڑی غلطی ہے۔ اشیا کو خریدنا اور پھر اُن کو گراں قیمت سے بیچنا اگر ہوشیاری سے کام کیا جاوے تو بے شک ایک بہت نفع کا کام ہے مگر انگلستان میں وہ اعلیٰ درجہ کا پیشہ نہیں سمجھا جاتا انگریز اُن لوگوں کی زیادہ عزت کرتے ہیں جو اشیا کی تیاری کا انتظام کرتے ہیں۔ مجھ کو یقین ہے کہ ہندوستان میں اس قسم کے بہت سے کاموں کے موقعے ہیں۔ اور اگر مسلمانوں کو ان اشغال کی طرف متوجہ کر دیا جائے اور ان کو بتا دیا جائے کہ کس طرح کام شروع کرتے ہیں تو یہ کام مسلمانوں کے ہاتھ میں آ سکتے ہیں اور اُن سے ان کو بہت نفع ہو سکتا ہے۔ اس مسئلے کو پورے طور سے بیان کرنے کے لئے مجھ کو اپنے مقصد سے بہت دور ہٹنا پڑے گا۔ اور مجھ کو اتنی فرصت نہیں ہے کیوں کہ اس میں ہندوستان کی ساری حرفتی ترقی کا مسئلہ شامل ہے مگر میں مختصراً بتاؤں گا کہ میرا اس سے کیا مطلب ہے۔ ہندوستان میں بہت سے ایسے کام ہیں جو ہاتھ سے کئے جاتے ہیں، اور بھدے آلات اُن کے لئے استعمال ہوتے ہیں اور اس وجہ سے ان میں سے اکثر یورپ کے مقابلہ کے بوجھ سے دبے جا رہے ہیں۔ گمان غالب ہے کہ اگر اُن بھدے آلات کی جگہ جو دو سو برس سے بغیر کسی تبدیلی کے استعمال ہو رہے ہیں، زیادہ صناعی کے ساتھ بنے ہوئے یورپ کے منتقل آلات استعمال کئے جائیں تو ان حرفتوں میں سے اکثر زندہ ہو سکتی ہیں۔ اور ان کی تیار شدہ اشیاء دخانی طاقت کے تیار کردہ چیزوں کا مقابلہ کر سکتی ہیں۔ میں سمجھتا ہوں اس قسم کی تبدیلی کاریگر لوگ خود نہیں کر سکتے ہیں بلکہ تیاری اشیا کے نئے طریقے اُن نوجوان کو اختراع کرنے چاہئیں۔ جو یورپ سے سیکھ کر آئے اور ہندوستان کے کاریگروں کو مزدوری پر کام میں لگائے اور اپنی زیر نگرانی اُن سے کام لے۔

یہ آلات دستکاری ہاتھ سے استعمال ہوں گے۔

اس لئے کاریگروں کے لئے بالکل نئی چیز نہ ہوں گے، اور ان میں سب ترقیاں موجود ہوں گی جو یوروپ میں اختراع ہوئی ہیں۔ اور جن کی وجہ سے اشیاء ساختہ شدہ کی مقدار اور خوبی بہت بڑھ گئی ہے۔ اس قسم کی ترقی دادہ کلوں کی مثال جو یورپ سے لوگوں کے استعمال کے واسطے لائی جا سکتی ہیں کانے کا کھڈی ہے جو اب ہندوستان میں بہت عام ہو گیا ہے۔ اور ان آلات کی قیمت بھی جو ہاتھ سے استعمال ہوتے ہیں بالمقابلہ کم ہے۔ اس لئے ایک نوجوان کو جو کارخانہ جاری کرنا چاہے بہت سے سرمایہ کی بھی ضرورت نہ ہوگی۔ میرے نزدیک اس تجویز میں کامیابی کے شرائط حسب ذیل ہیں۔

اول ایسا نوجوان اس کام کو شروع کرے جس نے اچھی خاصی انگریزی تعلیم حاصل کر لی ہو۔ جس کی وجہ سے اُس کو خود غوض و فکر کرنے کی عادت ہو گئی ہو اور انگریزی سے اس قدر واقف ہو کہ بلا تکلف و بآسانی ہر چیز کو جو اس کی حرفت کے متعلق ہو مطالعہ کر سکے۔

شرط دوئم یہ ہے کہ خواستگار ترقی اور پرجوش مسلمان تھوڑا تھوڑا روپیہ ایسی حرفت کے کاموں میں لگانے کے لئے تیار ہوں۔ اس قسم کے کارخانے جو ہمارے خیال میں ہیں جاری کرنے کے لئے پانچ ہزار یا دس ہزار سے زائد سرمایہ کی غالباً ضرورت نہ ہوگی۔ یورپین طریقہ ساخت کو سیکھنے اور اس پر حاوی ہونے کے بعد وہ نوجوان منتظم اپنے سرمایہ کا ایک حصہ ان ترقی یافتہ آلات میں سے بعض کو یورپ سے خریدنے میں صرف کریگا۔ وہ پھر کچھ مقامی کاریگر مقررہ مزدوری پر کام میں لگائے گا اور تیار شدہ مال کو بازار کے دوکانداروں کے ہاتھ فروخت کرے گا۔ میں یاد ہوائی باتیں نہیں کر رہا ہوں۔ غالباً آپ صاحبوں میں سے بعض کو معلوم ہوگا کہ ایسا ایک کارخانہ پنجاب میں مسٹر محمد شفیع نے بھی جاری کر دیا ہے اور اس میں کامیابی کی اچھی امید ہے۔ مسٹر ہیول نے اس کارخانہ کی کیفیت حسب ذیل بیان کی ہے۔

لو کیو واقعہ جاپان کے صنعتی مدرسہ میں تعلیم پانے کے بعد انھوں نے ایک دستی کل کے ذریعہ سے بننے کا کارخانہ قایم کیا ہے جو گزشتہ چھ ماہ سے چل رہا ہے۔ وہ ایک عمدہ نمونہ کپڑا بننے کی کل کا جو پاؤں سے چلتی ہے اور تانا بننے کی کل ترقی یافتہ یورپین وضع کی جاپان سے لائے۔ انھوں نے اس نمونہ پر مقامی مستریوں سے کپڑا بننے کی کلیں تیار کرائیں اور اس قسم کی چھ کلوں سے اب دیسی جلاہے کام لے رہے ہیں۔

یہ لوگ چند ہفتوں میں اپنے کام میں مشاق ہو گئے اور جس قدر کپڑا ایک کنبہ جلاہوں کا معمولی

کارگاہ پر دس یا بارہ گھنٹے روزانہ کام کرنے سے تیار کرتا تھا اب اس سے کم از کم تگنا کپڑا ایک شخص آٹھ گھنٹے کام کرنے سے تیار کر لیتا ہے۔ کام کی شرائط ایسی اچھی ہیں کہ ہر جولاہا چار آنہ روز پر بخوشی کام کرتا ہے۔ کیونکہ اسی کے قریب اُن کا سارا کنبہ پرانی کارگاہ پر کام کرنے سے دن بھر میں کماتا تھا۔ اب اُن کی عورتوں اور بچوں کو بالکل فرصت ہے کہ وہ کوئی دوسرا کام کریں یا محض اپنے خانگی کاموں کو دیکھیں یہاں مالک کارخانہ کے لئے بھی یہ کام خاصے فائدہ کا ہے۔ فی الحال اس کو فی کل آٹھ آنہ روزانہ نفع ہوتا ہے۔ اور جس قدر کلوں کی تعداد بڑھے گی اُسی نسبت سے کارخانہ کے صرف میں تخفیف ہو گی۔

مسٹر ہیول نے مذکورہ بالا کیفیت بیان کی ہے اور آپ اُس سے اندازہ کر سکتے ہیں کہ حرفتی کارخانوں کے جاری کرنے سے کس قدر نفع ہو سکتا ہے۔ مسٹر محمد شفیع چھ ماہ سے کام کر رہے ہیں۔ اور بظاہر اُن کا اس کام میں بہت روپیہ بھی صرف نہیں ہوا۔ مگر اُن کو (۳۰) روپیہ ماہوار کی اس کام سے آمدنی ہے۔ میں سمجھتا ہوں وہ اپنے کام کو بڑھائیں گے اور مجھ کو توقع ہے کہ بجائے چھ کلوں کے اُن کے ہاں ساٹھ کلیں بہت جلد چلنے لگیں گی اور اس صورت میں ان کو سات سو پچاس روپیہ ماہوار کا فائدہ ہو گا۔ مگر میں بالخصوص اس بات پر توجہ دلاتا ہوں کہ کپڑا بننے کی ترقی دادہ دستی کل کی تجویز بہت برس ہوئے اول مسٹر ہیول نے پیش کی تھی اور مسٹر محمد شفیع اس وقت تک جاپان گئے بھی نہ تھے اور اسی تجویز میں انھوں نے یہ بھی ظاہر کیا تھا کہ اسی قسم کے اور بہت سے حرفے ہیں جو ترقی دادہ یورپین طریقہ سے اسی طرح پر چل سکتے ہیں۔ اس سیدھی سادھی بات کے سمجھنے کے لئے کہ عمدہ کلوں کی مدد سے ہاتھ کی قوت ایسے ملک میں جہاں کہ مزدور اس قدر سستے ہیں اب بھی دخانی قوت کا مقابلہ کر سکتی ہے۔ اور اسی طرح پر حرفت کو ملک میں بآسانی ترقی ہو سکتی ہے۔ نوجوان مسلمانوں کو غیر ملکوں کے لمبے سفر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ مسٹر ہیول کی چٹھی پائونیر میں شائع ہوئی تھی اسی وقت مجھ کو اس بات کا خیال آیا تھا۔ کیونکہ اس سے بننے اور دیگر حرفوں میں جو ہاتھ پر موقوف ہیں جان پڑ جائے گی اور ملک میں بڑی ترقی ہو گی۔ میں سمجھتا ہوں کہ مجھ کو اس مسئلہ کی طرف زیادہ توجہ زیادہ تر اس وجہ سے ہوئی تھی کہ مسلمانوں کو اس سے بالخصوص تعلق ہے۔ ہندوستان کے جولاہوں کا زیادہ تر حصہ مسلمان ہے اور برسوں سے اُن کا کام اچھی حالت میں نہیں ہے۔ اگر کسی طرح سے بننے کا پیشہ پھر آمدنی کا ذریعہ ہو جائے تو مسلمان کو سب سے پہلے اس پر غور کرنا چاہئے۔ مگر کسی مسلمان نے بظاہر اس نئے خیال کی طرف توجہ نہیں کی اور مسٹر ہیول برسوں بے فائدہ شور و غل کرتے رہے۔ میں نے اس خاص مثال پر اس لئے زور دیا ہے کیونکہ میں سمجھتا ہوں کہ اس سے اس طریقہ کی تشریح ہوتی ہے جس سے کہ ہم متوسط درجہ کے مسلمانوں کو حرفت کی طرف راغب

کر سکتے ہیں۔ ہم کو ایسے لوگوں سے واسطہ ہے جو کاروبار کے طریقوں سے ناآشنا ہیں۔ اس لئے ہم کو چھوٹے کاموں سے شروع کرنا چاہیئے جن میں نہ بڑے سرمایہ کی ضرورت ہے اور نہ بڑی انتظامی قوت کی۔ اور جب نوجوان مسلمان منیجر کو معلوم ہو کہ چھوٹے کارخانہ کو کس طرح پر چلاتے ہیں اور مانگ کے موافق اشیا کس طرح پر تیار کرتے ہیں تو وہ بتدریج اپنے کاروبار کو بڑھائے گا اور اس کی آمدنی کو ترقی ہو گی کاریگر اور مزدور عموماً جاہل اور بے سلیقہ ہیں اس لئے ان کو اول ایسے حرفوں اور ساخت کے طریقوں میں مشغول کرنا چاہیئے جو ان کے پہلے تجربہ سے بہت بالا نہ ہوں۔ یہ سب شرائط بننے کے چھوٹے کارخانوں سے پورے ہو سکتے ہیں اور چونکہ ہندوستان میں کپڑے کی بہت مانگ ہے۔ ہم کو ایسی حرفت سے کام شروع کرنا چاہیئے۔ مسلمانوں میں خاصی تعداد ایسے نوجوانوں کی ہے جو ایسے کارخانوں کو کامیابی سے چلانے کی قابلیت اور لیاقت رکھتے ہیں۔ کوئی شک نہیں ہے کہ خاص خاص اشخاص محمد شفیع جیسے غیر معمولی ذہانت اور ہمت والے وقتاً فوقتاً نئی صنعتی ترقیوں کے لئے رہنمائی کرنے والے پیدا ہونگے مگر ہم کو ان لوگوں کے انتظار میں ٹھیرنا نہ چاہیئے ورنہ ہم کو بہت انتظار کرنا پڑیگا مجھ کو اپنے پندرہ سال کے تجربہ سے معلوم ہے کہ ہمارے طلباء کے لئے پیشہ کا انتخاب کرنا کس قدر مشکل ہے۔ اُن کو دنیا کے کاروبار سے کوئی واقفیت نہیں ہوتی جس سے وہ اندازہ کر سکیں کہ مختلف پیشوں میں کامیابی میں کیا کیا توقعات ہیں۔ موجودہ نسل میں ان کے والدین عموماً انگریزی سے ناآشنا ہوتے ہیں اور موجودہ زمانہ کی شرائط زندگی کا ایک دھندلا سا مفہوم اُن کے پیش نظر ہوتا ہے۔ ایسی حالت میں توقع نہیں ہو سکتی کہ اُن میں سے بہت سے ایسے پیشوں کا تجربہ کریں گے جن کا کوئی محسوس اور مستقل نمونہ اُن کے پیش نظر نہیں ہے۔ ان مشکلات کو دور کرنے کے لئے (اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ بڑی بھاری مشکلات ہیں) اور ابتدائی سرمایہ بہم پہونچانے کے لئے جو ایک لازمی چیز ہے، میں چاہتا ہوں کہ چھوٹی چھوٹی مشترک البضاعت کمپنیاں قایم ہوں جن کا مقصد چھوٹے چھوٹے کارخانے کھولنا ہو اس کام کے لئے کسی بڑے سرمایہ کی ضرورت نہ ہوگی۔ میری رائے میں پچاس ہزار روپیہ ابتدا کرنے کو کافی ہو گا۔ کارخانہ کا منافع منیجر کو معقول تنخواہ دینے کے بعد حصہ داران باہم تقسیم کر لیا کریں اور جب کارخانہ مضبوط جڑ پکڑ لے تو منیجر کو موقع دیا جائے کہ وہ کارخانہ کی لاگت ادا کرنے پر اُسے خرید سکے بلکہ میری رائے میں منیجر کے ساتھ اس قدر رعایت ہو کہ وہ کارخانہ کی قیمت باقساط ادا کر کے اُسے اپنا کر لے۔ جب کام سے اس طرح پر کمپنی کا روپیہ خالی ہو جائے تو دوسری قسم کے کارخانے اُس سے جاری کئے جائیں۔ اور وہ دوسرے نوجوانوں کے کام آئے۔ میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ اس قسم کی

کمپنیاں جاری کرنا بڑی ہمدردی کا کام ہوگا۔ اور اس سے مسلمانوں میں حرفت اور پیشہ وری کے رواج کا اہم مقصد حاصل ہوگا لیکن میری رائے ہے کہ حصہ داران سرمایہ بھی اپنے روپیہ کے مناسب نفع سے محروم نہ رہیں اور یقین ہے کہ وہ اس طریقہ پر محروم نہ رہیں گے۔ میری بڑی غرض یہ ہے کہ ایسی صنعت و حرفت کے کام عملاً شروع ہو جائیں۔ تاکہ نوجوان مسلمانوں کی آنکھوں کے سامنے مجسّم اور محسوس مثال حرفت کے مفہوم کی پیدا ہو جائے۔ میں چاہتا ہوں کہ وہ کاروبار کی حقیقت سے مطلع ہوں اور حرفت سے روپیہ کمانے کا طریقہ اُن کو معلوم ہو۔ اور سب سے بڑھ کر مقصود یہ ہے کہ مسلمان نوجوان اور ان معدودے چند لوگوں میں جو صنعت و تجارت کے کاروبار میں مشغول ہو گئے ہیں باہم واسطہ اور ذاتی واقفیت پیدا ہو۔

میں خود یقین کرتا ہوں کہ کاروبار کی تعلیم محض اصولوں کے پڑھا دینے سے حاصل نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ اس میں بہت کچھ ذاتی تجربہ پر منحصر ہے۔ میرا خیال ہے کہ ٹکنیکل اسکول اور کاروباری جماعتیں اتنا نہیں سکھا سکتیں جس قدر کہ چند کارخانوں کی جاری مثال سے حاصل ہو سکتا ہے۔ بمبئی اور رنگون میں ایسی بہی خواہ اور ہمدرد کمپنیوں کے قیام کی جو مبتدیوں کی رہنمائی کریں ضرورت نہیں ہے کیونکہ وہاں کے اہل اسلام کے روبرو یورپین کارخانہ جات کی مثالیں موجود ہیں۔ جن کی نقل اتارنے میں اُنھوں نے کمی نہیں کی۔

البتہ شمالی ہند میں تجارت اور حرفت سے متوسط درجہ کے مسلمان عموماً غیر مانوس ہیں اس لئے روشن خیال افراد قوم کو غور و توجہ کے ساتھ ان کاموں کے اجراء میں کوشش کرنی چاہئے۔ اگر فی الحقیقت ہم کو اس حصہ ہندوستان میں کاروبار کے نئے شعبے جاری کرنے میں کامیابی ہوئی تو ہمارے کاموں کے لئے تعلیم یافتہ مسلمانوں کی موجودہ تعداد کافی نہ ہوگی۔ اور اس میں بھی اضافہ کی ضرورت ہوگی۔ صنعت کے نئے طریقے بلا کافی استعداد انگریزی کے اور بغیر تربیت یافتہ ہو کے ہم دل و دماغ کے "خذ ما صفا ودع ما کدر" پر قادر ہوں نہیں آ سکتے۔ میرا عقیدہ ہے کہ ہر گز بی اے سے کم درجہ کی قابلیت کافی نہ ہوگی اس لئے جو کچھ لبرل پیشوں کی نسبت کہہ چکا ہوں اُسی کو پھر دُہراتا ہوں ہم کو بی اے درجہ کی تعلیم کے موجودہ سامان میں بہت وسعت اور ایزادی کی ضرورت ہے اور تمام کوششیں جو کالج ڈیپارٹمنٹ میں مسلمان طلبا کا دائرہ وسیع کوشش کرنے اور اس کو حد مطلوب تک ترقی دینے میں کی جائیں بہت مبارک ہوں گی۔

اگرچہ بے موقعہ ہے لیکن بحیثیت ایک رکن یونیورسٹی کے مجھے ضرور کہنا چاہئے کہ کیشیر

اضافہ تعداد طلبار جو بی اے کی ڈگری کے لئے آئندہ محض پیشہ و فنون اختیار کرنے کی غرض سے پڑھتے ہوں - اصلاح تعلیم یونیورسٹی کے مسئلہ میں ایک بہت مشکل سوال پیدا کرتا ہے - ایسے تمام نوجوانوں کی موجودگی جو عالمانہ لیاقت حاصل کرنے کی غرض سے بالکل نہ پڑھتے ہوں - مجلس یونیورسٹی کو بی اے کی ڈگری کا درجہ لیاقت بلند کرنے سے روکے گی - اور ان دو طریقوں میں سے ایک طریقہ ہم کو اختیار کرنا ہوگا کہ یا تو بی اے کو کھلم کھلا ادنی درجہ کی تعلیم کی حد آخر تسلیم کرلیا جاوے اور ازاں بعد ہر قسم کی فضیلت کے لئے تین سال کا کورس ایم اے کی شکل میں قرار دیدیا جاوے یا یونیورسٹی کو ایک جدید کورس قائم کرنا ہوگا - جو انٹرنس کے بعد تین سال کا ہو سکتا ہے - یہ کورس خصوصاً اُن طلبار کے لئے ہوگا جو پیشہ یا تجارت یا گورنمنٹ کی ملازمت آئندہ اختیار کرنا چاہتے ہیں - اس صورت میں ڈگری کی حمائتیں فقط ان طلبار کے لئے کھلی رہ جاویں گی جو فاضل بننے کا اعلیٰ خیال رکھتے ہیں - یہ وہ اصلاحیں ہیں جن کی تدابیر ہماری حال اصلاح شدہ یونیورسٹیوں کو کرنی پڑیں گی - مگر مجھ کو بہ سبب اس کے کہ عنقریب اس ملک سے رخصت ہونیوالا ہوں، ان کی نسبت اپنی کوئی رائے پیش نہیں کرنی چاہئے - میں فقط آپ صاحبوں کو تنبیہ کرتا ہوں اگر قوم کی واقعی ترقی کے آپ خواہاں ہیں تو آپ کے ہاں کثرت سے ایسے کالج موجود ہونے لازم ہیں جن میں موجودہ درجہ بی اے کے قریب قریب تعلیم دی جاسکے - اس تعلیم کو خواہ آپ کسی نام سے موسوم کریں لیکن اس درجہ کی تعلیم افراط کے ساتھ قوم کی مالی اور اخلاقی نشوونما کے لئے ناگزیر ہے -

مجھے خوف ہے کہ میں اپنے دلی خیالات کو صاف صاف عرض کرکے آپ کو رنج دوں گا - مگر جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں اگر میں ایسی صاف گوئی سے باز رہوں جو مفید ہے تو میں اپنے آپ کو اس عزت کے ناقابل ثابت کروں گا جو آپ نے مجھ کو اپنا پریسیڈنٹ بنانے سے بخشی ہے - مجھے مجبوراً یہ کہنا پڑتا ہے کہ مسلمانوں کی قوم میں جو فی الحال خیالات کی سطح نہایت پست ہے مسلمانوں کی سوشل زندگی میں اعلیٰ خیالات کی بہت کمی ہے - اور اُن کی سوسائٹی کی حالت کا اثر اُن کے لٹریچر کی کم مائیگی کا باعث ہے - آپ کے بچے گھروں میں علمی تذکرہ نہیں سنتے اور اس وجہ سے بڑے ہوکر اُنھیں ان اعلیٰ خیالات اور مفہومات سے جن کا اس وقت تمام تہذیب یافتہ دنیا میں چرچا ہے بالکل اجنبیت ہوتی ہے - ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دماغی کاہلی آپ کی ساری قوم پر چھائی ہوئی ہے اور عقلی باتوں سے ذرا بھی دلچسپی باقی نہیں ہے - اگر کوئی مجھ سے ان ناگوار باتوں کا ثبوت مانگے تو میں اس بے توجہی کو ثبوت میں پیش کرونگا جو مسلمانوں کو یورپین کمالات کی طرف سے ہے - ایک زمانہ تھا جب کہ عربوں کی پرشوق اور مستعد طبیعتوں سے تمام دنیا کے علوم کو

ابنا لیا تھا اور آج مسلمانوں کی قوم پر کاہلی کی نیند ایسی طاری ہے کہ مغربی خیالات کا دھکا لگنے پر بھی اُن میں کسی قسم کی حرکت تک نہیں ہوتی
ت نہ تھا کہ کوئی قوم جس کو عقلی چیزوں سے کچھ بھی دلچسپی ہو وہ یورپین خیالات کے پھیلنے پر سخت متاثر نہ ہوئی تھی۔ پھر اگر آپ کی
م سے تحقیق کے بعد انگریزی تعلیم سے کنارہ کیا ہوتا تو بھی میں ان کے اس فعل کو عزت کی نگاہ سے دیکھتا گو مجھ کو
سوس اُس وقت بھی ہوتا۔ میرے دل میں ان متعصب مولویوں کی ہمیشہ نہایت عزت رہی ہے جو
اپنے طریقوں پر اڑے ہوئے ہیں اور جو دنیاوی نفع کے مقابلہ میں پرانی تہذیب کو جس میں اسلام
نشو ونما پایا ہے ترک کرنے سے قطعی انکار کرتے ہیں۔ یہ لوگ کم از کم با اصول تو ہیں، اور
مستقل طریقہ کے پابند ہیں۔ گو وہ میری رائے میں کتنا ہی افسوسناک غلطی پر مبنی ہو۔ ام
علمائان مشرقی کمالات کو ناجائز نہیں سمجھتے بلکہ صرف دلچسپی نہیں لیتے وہ متعصب نہیں ہیں بلکہ بے توجہ ہیں۔ اور
آپ سب کو معلوم ہے کہ نئے علوم ہی نہیں بلکہ پرانے علوم سے بھی ان کو دلچسپی نہیں ہے۔ ورنہ عربی
ہی کے کمالات کو کیوں تنزل ہوتا۔ آپ کی قوم کے مالی افلاس سے میرا یہی مطلب ہے اور میں
آپ کو اس کے دفعیہ کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں۔ قبل اس کے کہ میں اپنی تجاویز اس بارہ میں پیش
ل، میں بعض ایسے مسلمانوں کی رائے ظاہر کرنا چاہتا ہوں جو اپنی قوم کی دماغی پستی کو سمجھتے اور
اس پر افسوس ظاہر کرتے ہیں۔ ان حضرات کا یہ خیال ہے کہ اگر ایک مرتبہ مسلمانوں کا مالی افلاس دفع ہو جائے
پھر مالی ترقی کے ساتھ ساتھ علمی کمالات اور فضائل بھی لامحالہ پیدا ہو جائیں گے۔ وہ کہتے ہیں پہلے تم کو
دولت پیدا کرنی چاہیئے پھر اس کے بعد ہم بہت جلد اس تعصب اور جہالت کو دفع کر لیں گے۔ جو اس
وقت میں ہماری قوم کو دبائے ہوئے ہے۔ میرے خیال میں اس سے زیادہ حقیقت سے بعید کوئی
نہیں ہو سکتا۔ مجھے یہ ثابت کرنے کے لئے یہ رائے بالکل بے بنیاد ہے آپ کی قوم سے باہر نظر ڈالنے
کی کچھ حاجت نہیں۔ آپ بمبئی اور رنگون کے مسلمانوں کو ملاحظہ فرمائیے۔ بمبئی کے خوشحال شہر میں کوئی
نہ تو پارسی اور نہ انگریز اس قدر دولتمند ہیں جتنا کہ مسلمان۔ میں سنتا ہوں کہ رنگون اور بمبئی میں ایسے
ملک التجار ہیں جن کے مقابلہ میں اودھ کے تعلقہ دار کچھ حقیقت نہیں رکھتے اور جن کا شمار دنیا کے
رئیسیوں میں ہوتا ہے۔ لیکن میں پوچھتا ہوں کہ اپنے تمول کے اعتبار سے ان دونوں شہروں کے مسلمانوں
نے اپنی قوم کی دماغی عزت بڑھانے میں کیا کیا ہے۔ بے شک بعض عمدہ مثالیں بھی ہیں۔ مگر عام طور سے
تاجروں کے متعلق یہ کہنا صحیح ہوگا کہ وہ بیوپار کر کے امیر ہو جاتے ہیں اور اپنے روپیہ کو یا تو مشہور
اولیاءاللہ کے مزاروں پر نذریں دے کر خرچ کرتے ہیں یا دکھاوے کی رسموں میں اڑاتے ہیں۔ جو
اسلام کی سادگی کے بالکل مخالف ہے۔ لیکن آپ فرمائیے کہ ان میں سے کس نے عقلی دنیا میں کچھ نام

پیدا کیا ہے۔ اور اُن میں سے کون ایسا ہوا ہے جس نے اپنی قوم کو اعلیٰ اور معقول مقاصد کی طرف ہدایت کی ہو
اُن میں سے کون ہے جس نے مولوی حالی جیسے غیر مستطیع عالم کی برابر نہیں اُن سے نصف خدمت بھی اپنی
قوم کی کی ہو۔ آپ یقین کیجئے کہ صرف آپ ہی کی قوم کا تجربہ نہیں بلکہ تمام دنیا کی قوموں کے تجربوں کا لبِ لباب
یہ ہے کہ جو لوگ حرفتوں اور پیشوں میں مصروف ہیں وہ دنیا کے اعلیٰ خیالات میں اضافہ نہیں کیا کرتے
اور اس لئے اگر آپ کی قوم کے خیالات میں ان دولتمند تاجروں اور کامیاب وکیلوں سے کچھ ترقی ظہور
میں نہ آئی تو آپ کو کوئی تعجب اور افسوس نہ کرنا چاہئے۔ اس وجہ سے میری قطعی رائے ہے کہ مالی
ترقی سے دماغی پستی کے رفع کرنے میں بہت کم مدد ملے گی۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ اس خرابی کے دفعیہ کی
ایک صورت ہے اور میں اس کے پیش کرنے میں زیادہ الفاظ استعمال نہیں کروں گا۔ کیوں کہ آپ صاحب
اس کو سُن چکے ہیں وہ صورت محمدن یونیورسٹی کا قائم ہونا ہے۔ اب میں مختصر طور پر بتانا چاہتا ہوں کہ
یہ صورت جو میں تجویز کرتا ہوں کیوں کر عمل میں لائی جاسکتی ہے۔ ہر قوم میں چند خاص خیالات ہوتے
ہیں جن کو اُس قوم کی ملکیت مشترک سمجھنا چاہئے اور ایک خاص علمی سطح ہوتی ہے جو سب افراد میں پائی
جاتی ہے۔ یہی دونوں باتیں اس قوم کی تہذیب کا معیار ہوتی ہیں اور انھیں سے قوم کے کمالات کا اندازہ
ہوتا ہے جس قوم میں بڑے بڑے عالم اور حکیم موجود ہیں اُس قوم کی زندگی اعلیٰ خیالات سے مالا مال
ہو جاتی ہے۔ ان لوگوں کے خیالات اول کتابوں لکچروں یا اسپیچوں کے ذریعہ سے شائع ہو کر قوم
میں پہونچتے ہیں اور بالآخر ہر شخص کے لئے لازمی ہو جاتے ہیں۔ اگر آپ ذرا غور فرمادیں تو آپ کو
واضح طور پر معلوم ہو جائے گا کہ ہر ملک کے لوگ اپنے خیالات کتابوں سے حاصل کرتے ہیں۔ اگرچہ
ایک نہایت تعلیم یافتہ قوم کے لئے لازمی ہے کہ عجائب گھر اور نگارخانہ اور خاص علوم کی تحقیقات کے
لئے لٹریری اور سائنٹفک کلب اور سوسائٹیاں بھی ہوں۔ لیکن با ایں ہمہ ایسی قوم کے خیالات کا
بڑا ماخذ کتابیں ہی ہوتی ہیں۔ اگر یہ بھی مان لیا جائے کہ بعض رہنما اپنے خیالات کو لکچروں یا رسالوں
کے ذریعہ سے شائع کرنا پسند کرتے ہیں یا اخباروں میں مضمون لکھ کر پھیلانا چاہتے ہیں۔ تاہم یہ لوگ
بھی کتابوں کے مصنفوں کے زمرے میں داخل ہیں۔ کیونکہ انھوں نے اپنا شغل سائنس یا لٹریچر یا علمی
تکمیل قرار دے لیا ہے۔ اُن کا کام اور ان کی قابلیت صرف یہی نہیں ہے کہ وہ علوم سے واقف ہوتے
بلکہ کامل انشا پرداز ہونا اُن کے لئے ضروری ہے۔ یونیورسٹی سے میری مراد ایسا دار العلوم ہے جہاں
اس قسم کے لوگ پیدا ہوں، اور جہاں ایسے لوگ رہ سکیں۔ اُن کے واسطے اشغال بھی موجود ہوں
براہِ مہربانی آپ ہندوستان کی یونیورسٹیوں کا خیال دل سے نکال دیجئے۔ میری مراد ایسی یونیورسٹیوں سے

نہیں جیسی کہ کلکتہ اور الہ آباد کی یونیورسٹیاں ہیں جو محض امتحان لینے والی جماعتیں ہیں اور جن کو گورنمنٹ نے بذریعہ فرمان شاہی کے ڈگری دینے کی اجازت دے رکھی ہے مگر ان کو اصلی فضیلت اور لیاقت سے کچھ واسطہ نہیں۔ میرے پیش نظر اس وقت ایسی یونیورسٹی ہے جو حقیقت میں علم و فضل کا گھر ہو جہاں مختلف علمی شعبوں کے اہل کمال یک جا فراہم ہوں اور وہ اپنے خاص علموں کی تعلیم دیں اور خود ان علوم میں جدید تحقیقاتیں کریں اور وہاں کتب خانے آلات خانے اور تمام دنیا کے علمی رسالے اور اخبارات مہیا کیے جائیں۔

یہ لوگ جب علمی آب و ہوا میں رہیں گے تو ایک سے دوسرے کو تقویت ہوگی اور نئے نئے اصول ایجاد کریں گے جس کی اشاعت بذریعہ کتابوں کے ہوگی۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ اُس فرق کو بھی خیال کرلیں جو ان لوگوں میں اور آج کل کے مضمون نگاروں میں ہوگا۔ ان لوگوں کی عام معلومات وسیع ہوں گی۔ یہ لوگ یورپ کے بہترین خیالات سے بخوبی واقف ہوں گے اور جو کچھ لکھیں گے یہ سمجھ کر لکھیں گے کہ اُن کے کام کا اندازہ کرنے کے لئے ایک دقیق النظر پبلک موجود ہے۔ فی الحقیقت ایسے ہی لوگ مسلمانوں کے خیالات میں اضافہ کرسکتے اور آپ کی سوسائٹی کو نئے اصول سے مالا مال کرسکتے ہیں۔ یہ تو میں ہرگز نہیں سمجھتا کہ یونیورسٹی کے ہر پروفیسر میں نئے اصول حکمت پیدا کرنے کا مادہ ہوگا۔ مگر میں ضرور یہ کہوں گا کہ یہ سب مل کر اور یک جا رہ کر یقیناً ایسے خیالات کا مجموعہ پیدا کرسکیں گے جو یونیورسٹی میں متفق علیہ ہو کر بالآخر تمام قوم کے دل نشیں ہو جائیں گے۔ اگر کوئی صاحب یہ کہیں کہ انگلستان میں بڑے بڑے حکماء یونیورسٹی میں نہیں رہتے۔ تو میں جواب دوں گا کہ وہاں یونیورسٹی کے علاوہ اور شہروں میں بھی وہ ذرائع مثل کتب خانوں اور علمی سوسائٹیوں کے موجود ہیں۔ لیکن ہندوستان میں ابھی تک علمی ذرائع جن کے بغیر علم ناممکن ہے کہیں نہیں ہیں۔ اور آپ کی یونیورسٹی کا کام ان ذرائع کا بہم پہونچانا ہے۔

اب میں یونیورسٹی کی تجویز کو مفصل بیان کرنا چاہتا ہوں اور بتلانا چاہتا ہوں کہ محمڈن یونیورسٹی کا خیال عملاً کیوں کر پورا ہوسکتا ہے۔ یہ کہنے کی شاید ضرورت نہیں کہ اس یونیورسٹی کو علی گڑھ میں ہونا چاہئے کیوں کہ اس وقت بھی (بی اے) کے درجہ تک تعلیم دینے کے لئے عمدہ کالج موجود ہے۔ اور طلباء و اُستادوں کے یک جا رہنے کا طریقہ نہایت معقول ترقی پاچکا ہے۔ اسی بنیاد پر میں یونیورسٹی کی عمارت بنانا چاہتا ہوں۔ اور پہلا کام جو علی گڑھ کالج کو یونیورسٹی کے درجہ تک پہونچانے کی غرض سے کرنا چاہئے اور وہ یہ ہے کہ کسی ایک علمی شعبے میں اعلیٰ تعلیم کا پورا سامان بہم پہونچایا جائے۔ سامان بہم پہونچانے سے میری صاف یہ مراد نہیں ہے کہ ایک لائق پروفیسر اس علم کا مقرر کردیا جائے۔ چاہے اس کو کتنی ہی زیادہ تنخواہ کیوں نہ دی جائے۔ میری مراد سامان بہم پہونچانے سے یہ ہے کہ

(۱) تین چار عالم شخص مقرر کئے جائیں کہ وہ اس خاص علم کو پڑھاویں اور خود بھی اپنی معلومات کو بڑھاتے رہیں۔

(۲) ایک ایسی لائبریری فراہم کی جاوے جس میں حتی الامکان اس علم پر تمام کتابیں موجود ہوں۔

(۳) چند فیلوشپ یا وظائف کا انتظام کیا جائے تاکہ جو لوگ اُس مضمون میں امتحان پاس کرنے کے بعد اپنی تحقیقات کو بڑھانا چاہیں تو اُن نوجوانوں کو وظائف سے مدد ملے۔

کسی خاص علمی شعبے کی تعلیم کا جب پورا سامان مہیا ہو جائے تو اُس کو اس خاص شعبے کے اسکول یا فیکلٹی کے نام سے موسوم کیا جائے اور میرے نزدیک سب سے بہتر طریقہ یہ ہوگا کہ یکے بعد دیگرے اس قسم کے مختلف شعبوں کے اسکول یا فیکلٹیاں ایم۔ اے۔ او۔ کالج میں اضافہ ہوتی رہیں۔ میں اپنے مطلب کو زیادہ وضاحت کے ساتھ سمجھانا چاہتا ہوں۔ اس لئے عملی تجاویز سے بحث کروں گا۔

مثلاً یہ کہ پہلی فیکلٹی جو ہم کالج میں قائم کریں وہ عربی کی اعلیٰ تعلیم کی ہو۔ اور اس کے لئے سب سے پہلی ضرورت یہ ہے کہ ہمارے پاس ایک نہایت عمدہ کتب خانہ عربی کتابوں کا ہو جس میں لغات اور دیگر حوالہ طلب باتوں کے لئے عمدہ ذخیرہ موجود ہو، اور علم ادب کی تمام کتابیں ہوں۔ مصر اور بیروت کی چھپی ہوئی کتابیں جمع کی جاویں اور یورپین ملکوں میں جو کتابیں عربی کی شائع ہوئی ہوں وہ سب مہیا ہوں علاوہ اس کے اس کتب خانہ کے متعلق کچھ مستقل رقم اس لئے بھی ہونی چاہئے جس سے جدید مطبوعات جو زبان عربی میں وقتاً فوقتاً چھپتی رہتی ہیں اور وہ علمی رسالے، جو غیر ملکوں میں اورنٹیل سوسائٹیوں کی طرف سے نکلتے ہیں خریدے جاویں۔ ایک یوروپین پروفیسر عربی کا ہونا چاہئے جو جدید طریقوں سے پورے طور پر واقف ہو اور اس پروفیسر کے ساتھ کام کرنے کے لئے ایک ہندوستانی عالم ہو۔ جو یورپ اور مصر میں تعلیم پا چکا ہو۔ آگے چل کر میرے خیال میں یہ ضرورت پیش آئے گی کہ ایک مصری اور ایک ایرانی عالم بھی رکھے جاویں۔ میری خواہش یہ ہے کہ ان استادوں کے پاس اور ان کے ساتھ کام کرنے کو دو تین ہندوستانی نوجوان جنھوں نے ایم۔ اے۔ کی سند حاصل کرلی ہو۔ پچاس یا سَو روپیہ ماہوار کے وظیفوں پر رکھے جاویں۔ میں خیال کرتا ہوں کہ یہ لوگ عربی کتابوں کے صحیح نسخے شائع کرینگے جو بکثرت آج کل صرف قلمی صورت میں پائے جاتے ہیں اور جن کے ضائع ہونے کا بہت بڑا اندیشہ ہے یہ لوگ ہندوستان کے کتب خانوں کی فہرستیں مرتب کریں گے اور خاص خاص مضامین پر رسالے لکھیں گے اور اسی قسم کے علمی کاموں سے وہ نہ صرف اپنے علم کو وسیع کریں گے بلکہ مسلمانوں کے اعتبار اور وقار کو بڑھائیں گے۔ ان کے علاوہ طالب علم ہوں گے جو عربی میں ایم۔ اے کورس کی خواندگی تیار

کرتے ہوں گے۔ مجھے امید ہے کہ یونیورسٹی کے لئے سینیٹ موجودہ ایم اے کورس کو بالکل بدل دیگی اور ایم اے کی ڈگری کے لئے تین برس کی میعاد مقرر کرے گی۔ میرے خیال میں یہ سب سامان کسی ایک خاص علمی شعبے کے لئے لازمی ہے۔ چنانچہ ہز آنر نواب لفٹنٹ گورنر بہادر رحم کو گورنمنٹ سے ایک خاص امداد اس کام کے لئے دلوانے والے ہیں مجھے یقین ہے کہ عربی کے متعلق بہت اچھی ابتدا ہوئی ہے۔ اور اس کا انجام بھی نہایت دل خوش کن ہو گا۔ لیکن اور علمی شاخیں ایسی ہیں جن کے لئے عربی سے کہیں زیادہ بڑے سرمایہ کی ضرورت ہے اور اُن کے لئے آپ کو خود فنڈ جمع کرنا چاہیئے۔ میں سمجھتا ہوں کہ عربی کے لئے اہتمام کرنے کے بعد آپ کا دوسرا فرض یہ ہوگا کہ آپ ایسے پیمانہ پر ایک فیکلٹی سائنس کی قائم کریں اور اُس کے لئے معقول سرمایہ بہم پہونچائیں۔ عربی کی فیکلٹی کی نسبت اس میں بہت زیادہ روپیہ کی ضرورت ہوگی کیوں کہ سائنس کی بہت شاخیں ہیں اور ان میں سے ہر شاخ کے متعلق تجربہ کے لئے آلات درکار ہیں جو بغیر صرف کثیر کے مہیا نہیں ہو سکتے۔ علاوہ ازیں سالانہ خرچ سائنس پر بہ نسبت کسی اور علمی شعبہ کی نسبت بہت زیادہ ہوگا۔ کیوں کہ علاوہ اتنے روپیہ کے جو ہر سال سائنس کے تجربوں پر صرف ہوگا کالج کو بہت سے سائنٹفک رسالے اور اخبارات خریدنے ہوں گے گو کہ سائنس کا اسکول قائم کرنے کے لئے سرمایہ خطیر چاہیئے۔ تاہم میں نہایت زور کے ساتھ آپ سے گزارش کرتا ہوں کہ آپ اُس کی بنیاد ڈال دیں اور اگر آپ مجھے اس امر کی اجازت دیں کہ میں آپ کو اس کا طریقہ بتاؤں تو میں عرض کروں گا کہ ذیل کی صورت اختیار کی جائے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ ایسے نوجوان مسلمانوں کو جنھوں نے ہندوستانی یونیورسٹیوں میں نمایاں کامیابی حاصل کی ہو یورپ میں تعلیم کے واسطے بھیجیں۔ یہ لوگ خاص لیاقت کے ہونے چاہئیں۔ تاکہ یورپ میں پہنچتے ہی وہ اعلی علمی درجوں میں شریک ہو سکیں۔ پہلے تو انھیں ابتدا انگلستان کی یونیورسٹی میں کرنا چاہیئے اور پھر فرانس اور جرمنی میں اپنی تعلیم کا سلسلہ جاری رکھیں۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ بخوبی اس بات کو سمجھ لیں کہ معمولی ٹرائی پاس کا امتحان کافی نہیں اس کو محض ایک ابتدائی انتخاب ان لوگوں کا سمجھنا چاہیئے جن میں اعلی تعلیم کی استعداد ہے۔ اس لئے آپ کے بھیجے ہوئے لوگوں کو چاہیئے کہ وہ ایک مدت تک یعنی پانچ چھ برس یورپ میں رہیں اور سائنس کے کامل اور راہبر استادوں کی خدمت میں رہ کر کام سیکھیں۔ تب اور اسی حالت میں وہ اس قابل ہوں گے کہ ہندوستان میں اعلیٰ سائنس کے اسکول جاری کر سکیں۔ جس وقت آپ اُن کو اس قسم کی تعلیم دیں گے اور ان کے لئے یہاں پر لیبورٹیری اور میوزیم اور ایک عمدہ کتب خانہ جس میں کہ علاوہ کتابوں کے دنیا کے تمام اچھے علمی رسالے اور اخبارات موجود ہوں مہیا کر دینگے۔

توبھی لازمی ہو کہ ان کو معقول فرصت علمی تحقیقات اور اپنی لیاقت کے بڑھانے کی دی جائے اور اُن کی ساری قوت ایف اے کے طالب علموں کو درسی کتابوں کے سمجھانے اور رٹانے میں صرف نہ کی جائے۔ یہ بہت ممکن ہو کہ آپ انگریز ایسی بڑی قابلیت کے انگلستان سے بلائیں اور اس صورت میں یہ اندیشہ بھی نہ ہوگا کہ آپ ایک پردیسی شخص کو یورپ بھیج کر تعلیم دینے میں روپیہ صرف کریں اور بعد کو معلوم ہو کہ وہ شخص کافی دماغ نہیں رکھتا۔ سچ ہے کہ انگریز بلانے کے لئے صرف اس قدر کافی ہے کہ وہ کسی کالج کا فیلو ہو جس کے معنی یہ ہیں کہ اس کی قابلیت مسلّم ہو۔ مگر محمڈن یونیورسٹی کی بڑی غرض یہ ہو کہ مسلمانوں کی قوم میں بڑے بڑے عالم اور حکیم پیدا کرے اور جو الزام خشک دماغی کا مسلمانوں کی قوم پر برسوں سے چلا آتا ہے رفع ہو۔ میں نہیں سمجھتا اگر معقول تعلیم دی جائے تو مسلمان کیوں سائنس میں نام آور نہیں ہوسکتے۔ اس میں شک نہیں کہ بہت سے تعلیم یافتوں میں صرف ایک دو ایسے نکلیں گے جن میں بڑے سے بڑے سائنٹفک کام کا مادہ ہوگا۔ لیکن یہ آپ کو معلوم ہو کہ آپ کی قوم کی وقعت کا اندازہ اُن افراد کے لحاظ سے کیا جائیگا جو آپ سب میں علمیت کے لحاظ سے بالاتر ہوں مثلاً فرض کیجئے کہ آپ کے محمڈن یونیورسٹی کے پروفیسروں میں ایک شخص بھی اس پایہ کا نکل آئے جو اس وقت سائنس کی دنیا میں لارڈ کلون اور لارڈ لسٹر کا ہو، تو آپ کی تمام قوم کا وقار محض اُس شخص کی بدولت بڑھ جائے گا علی گڑھ کی توسیع میں بھی دو باتیں خیال کرتا ہوں کہ فی الحال ہونے والی ہیں پہلے ایک فیکلٹی عربی کی اور پھر سائنس کی، پھر اور فیکلٹیاں بھی بعد کو قائم ہونگی اور ہر ایک میں کافی سامان پڑھنے پڑھانے کا اسی طرح بہم پہونچایا جائے گا۔ میری خواہش یہ ہو کہ ہسٹری (تاریخ)، کی فیکلٹی کا تیسرا نمبر ہو۔ کیونکہ عربی سے یقیناً اس کو بہت کچھ مدد ملے گی۔ بہرحال یہ ایک بہت بڑا مسئلہ ہو جس کو آئندہ آنے والے لوگوں پر چھوڑتا ہوں۔ ہماری توجہ بالفعل انھیں دو فیکلٹیوں پر جن کا میں نے ذکر کیا ہو، محدود ہونی چاہیئے۔ اسی طور پر ایک فیکلٹی کے بعد دوسری فیکلٹی کا اضافہ ہونے سے۔ جب تمام علمی شعبوں میں اعلیٰ تعلیم کا انتظام ہو جائے تو پھر اس بات کا موقع ہوگا کہ گورنمنٹ سے درخواست چارٹر عطا ہونے کی ئی جائے اس بنا پر کہ علی گڑھ ایک رزیڈنشل اور تعلیمی یونیورسٹی فی الحقیقت ہوگیا ہو اور اس کو ڈگری دینے کا اختیار حاصل ہونا چاہیئے۔ میں یقین کرتا ہوں کہ چارٹر آپ کو دے دیا جاوے گا۔ مگر سچ پوچھئے تو میں یہ بات چنداں ضروری نہیں سمجھتا کہ آپ کو یونیورسٹی کا لقب مل جائے۔ آپ کی قوم کو یونیورسٹی کے نام کی ضرورت نہیں ہو۔ بلکہ اس چیز کی ضرورت ہے جسے یونیورسٹی کہتے ہیں۔ اور جب تین چار فیکلٹیاں پورے طور سے مہیا ہوجائیں گے

اور علی گڑھ سے اعلیٰ خیالات قوم میں سرایت کرنے لگیں گے تو پھر نام ہو یا نہ ہو یونیورسٹی ہو جائے گی۔ اس بارہ میں کہ یہ کام کیوں کر شروع ہونا چاہئے۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ مسلمان مجھ سے جھگڑنے کو تیار ہیں کہ میں نے عربی کو سائنس سے پہلے کیوں رکھا ہے۔ اُن کی رائے میں مقدم کو مؤخر اور مؤخر کو مقدم کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ اگرچہ عربی کو وہ اس بنا پر بالکل پیچھے پھینک دینا چاہتے ہیں کہ اُس کی تعلیم مفید نہیں ہے۔ لیکن میں جواب دیتا ہوں کہ مالی نفع کے لحاظ سے جو آپ کا مقصود ہے سائنس کی درستی تعلیم عربی کی تعلیم سے قطعاً زیادہ مفید نہیں ہے۔ فرض کیجئے کہ سائنس کی فیکلٹی ہماری انتہائی توقع سے زیادہ کامیاب ہو جائے اور وہ نہ ہونے کا اطمینان بخش ثبوت پیدا کرے، یا کوئی ایسا گیس دریافت کرے جو کسی معمولی گیس سے بڑی آزمائش کرنے پر ممیز ہو سکے تو اگرچہ یہ باتیں علم میں نہایت قابل قدر اضافہ ہوں گی، اور یورپ کی تمام سائنٹفک سوسائٹیاں ان کی دریافت کرنے والے کی نہایت تعریف کریں گے۔ لیکن روزمرہ کی زندگی سے یہ باتیں اُتنی ہی دور ہیں جتنی کہ علما یا آثار قدیمہ کے ماہروں کی تحقیقاتیں ہوتی ہیں۔ میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ آپ مختلف علوم کو ان کے مالی فوائد کے لحاظ سے ایک دوسرے پر ترجیح دینے کا خیال چھوڑ دیجئے ان فیکلٹیوں کا اصلی مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں کی طبیعت کی وسعت کو بڑھائیں اور کم سے کم چند مسلمانوں کو اس درجہ پر پہونچائیں جہاں تک کہ آج کل انسانی قابلیت اور حکمت پہونچ چکی ہے۔ کیوں کہ یہ امر یقینی ہے کہ اگر ایسے معدودے چند عالم بھی اس قوم میں پیدا ہو گئے تو پھر ان کا اثر ساری قوم پر خمیر کے آٹے کی طرح ہو کر رہے گا۔ مانا کہ دولتمند تاجران علما کی قدر نہیں جانیں گے۔ اور بیرسٹر اور سولین جو اپنے اپنے معاش کے کاموں میں مصروف ہیں ان علمی تحقیقاتوں پر عمل نہ ہونے کی وجہ سے ہنسیں گے۔ مگر یہ یقین کر لینا چاہئے کہ یورپ کی یونیورسٹیوں میں ایک جماعت بیٹھی ہوئی ہے جو نہایت خوشی سے آپ کے پروفیسر کی محنت کی داد دے گی۔ اور یہ ہی نہیں بلکہ اگر وہ کوئی ایسے اعلیٰ درجہ کی نئی بات دریافت کر سکیں جس سے کہ شائقین کو نئی حد نظر منکشف ہو تو یہ جماعت نہایت فخر کے ساتھ ان کی شاگردی قبول کرے گی۔

وہ غریب عالم جو جرمن اور انگلستان، پیرس اور ٹوکیو میں چپ چاپ بیٹھے ہوئے دنیا کے علمی ذخیرہ کو بڑھا رہے ہیں۔ گویا سب مل کر ایک عدالت ہیں جن کے سامنے آپ کو اپنے مکاتیب علمی پیش کرتے ہیں اور وہی اُن کی بابت انصاف کریں گے۔

اگرچہ یہ سچ ہے کہ خود ان کا کام ایک اعلیٰ درجہ پر پہونچ چکا ہے۔ اور وہ نہایت سخت مبصر ہیں۔ مگر آپ یقین جانئے کہ ان کی صاف نگاہیں کسی تعصب سے دھندلی نہیں ہوں گی۔ اور اگر آپ اپنی کتابیں اُردو ہی میں چھاپیں تو وہ لوگ اُردو زبان کو اس غرض سے پڑھیں گے کہ وہ آپ کی کتابیں سمجھ سکیں

اور ان کو تمام یورپ کے فائدہ کے لئے ترجمہ کریں۔ یہی علماء تھے جنھوں نے قبل اس کے کہ جاپان بذر
عہد نامہ کے مہذب قوموں میں کیا گیا۔ نوجوان جاپانی ماہر علم کیمیا کی کتابوں کا نہایت جوش کے سا
خیر مقدم کیا۔ جو گویا اُن حیرت انگیز مکاتیب کا دیباچہ نہیں جنھوں نے تمام دنیا کو حیرت میں ڈال دیا
پس آپ کو اس بات کا ذرا بھی اندیشہ نہ ہونا چاہیئے کہ آپ کے ساتھ تعصب یا تنگ خیالی برتی جاوگ
اور اگر آج یورپ کے علماء ہندوستان کے مسلمانوں کی قوم کو عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھتے تو اُس
کی وجہ یہی ہے کہ اُنھوں نے اُن کو میزان میں تولا اور ہلکا پایا۔

صاحبو! یہ باتیں میں اس غرض سے نہیں کہتا کہ آپ ہمت ہار دیں۔ میں تمنا کرتا ہوں کہ خدا وہ
دن کرے کہ یورپ کے علماء نہایت شوق کے ساتھ ان کتابوں کو دیکھیں جو کہ علی گڑھ کی یونیورسٹی
کے مطبع سے شائع ہوں۔ لیکن مسلمانوں کو اگر ایسا دن دیکھنا ہی تو اُنھیں یہ فیصلہ کر لینا چاہیئے کہ وہ علی گ
کو اعلیٰ تعلیم کا مرکز بنائیں اور جو سرسری خاکہ میں نے کھینچا ہے اُسی سے آپ خیال کر سکتے ہیں کہ یہ کام
کتنا بڑا اور اہم کام ہے۔ دو ایسے مرکز ہندوستان میں قائم کرنے کا خیال بھی بڑی سخت غلطی ہی۔ جیسے
یونیورسٹی میرے خیال میں ہے اگر کبھی بن جاوے تو مجھے شبہ ہی کہ پھر تمام اسلامی دنیا کے لئے د
صدیوں تک کسی دوسری یونیورسٹی کی ضرورت ہو۔ دوم درجے کے کالج آپ جتنے چاہیئے بنا لیجئے
اور اُن کو کیسے ہی بڑے ناموں سے موسوم کیجئے اور گورنمنٹ سے چارٹر بھی مانگئے۔ مگر باوجود ان
تمام باتوں کے ان میں سے ایک بھی علمی مرکز نہیں ہو سکتا۔ ایسی بڑی اسکیم کی تکمیل کے لئے جیسے کہ ا
جامع العلوم قایم کرنا ہی۔ اور جس سے قوم اسلام میں ایک روح پیدا ہو۔ یہ لازمی بات ہی کہ آپ سب متفق
ہوں اور چھوٹے لوکل مقاصد کا مطلق خیال نہ کریں۔ سب مسلمان چاہے وہ کہیں ہوں آپس میں بھائی ہیں
اور قومی زندگی کا مرکز نہایت اعلیٰ سے اعلیٰ ہونے میں سب کا یکساں فائدہ ہے۔

اے صاحبو! یہ علاج ہیں جو میں اس مالی اور دماغی افلاس کے لئے تجویز کرتا ہوں جس کا ذ
شروع میں ذکر کیا ہی۔ پہلے مرض یعنی مالی افلاس کے دفعیہ کے لئے آپ کو ہائی اسکول اور دو
درجہ کے کالج قایم کرنے چاہئیں اور جہاں تک آپ کے پاس ذرایع ہوں اپنی قوم میں عام تعلی
کے لئے آسانیاں پیدا کیجئے۔ علاوہ اس کے ایک مشترک البضاعت کمپنی قایم کر کے ایسے نوجوان
مسلمانوں کے لئے جنھوں نے معقول تعلیم حاصل کر لی ہو تجارت کی راہ کھول دیجئے۔ دوسری خرابی کے
رفع کرنے کے لئے یعنی دماغی افلاس کے دور کرنے کو آپ علی گڑھ کو ایک ایسا علمی مقام بنائیے
جہاں آپ کی قوم کے فاضل سائنس داں لوگ عقل انسانی کے اعلیٰ سے اعلیٰ درجے سے واقف ہوں

اور آپ کی زبان اور آپ کی سوشل زندگی کو علم اور دانش سے مالا مال کردیں۔

اگر آپ مجھ سے یہ پوچھیں کہ ان دونوں بڑے کاموں میں سے کونسا کام پہلے شروع کرنا چاہئے تو میں یہ جواب دینا پسند کروں گا کہ آپ کو یہ دونوں کام ساتھ ساتھ کرنے چاہئیں۔ دونوں کی ضرورت یکساں ہے اور دونوں کو ایک دوسرے سے مدد ملیگی۔ لیکن اگر آپ کافی ہمت نہ رکھتے ہوں اور ان میں سے صرف ایک کو کرنا چاہیں تو میں بلا تکلف کہتا ہوں کہ آپ یونیورسٹی سے شروع کیجئے۔ پہلے اپنے دماغی افلاس کو رفع کیجئے کیوں کہ اس کی آپ کو زیادہ حاجت ہے۔ شاید آپ یہ خیال کریں کہ میں ناقابل عمل بات کہتا ہوں۔ مگر آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں ایک بے مبالغہ اور صاف گو شخص کی حیثیت سے عرض کرتا ہوں آپ کی یونیورسٹی سے اعلیٰ خیالات نیچے کی طرف چھن کر پہونچیں گے۔ اور تمام قوم میں سرایت کرجائینگے۔ تمھارے فاضل اور سائنس داں حکیم علم کے حاوی طریق ہوں گے اور ان سے عام تعلیم کی اشاعت میں مدد ملیگی جس کی آپ کی پیشہ ور جماعتوں کو ضرورت ہے۔ علاوہ اس کے ان لوگوں کی موجودگی سے آپ کی نگاہ کے سامنے ہر وقت ایک علمی معیار رہوگا۔ اور آپ اپنی قوم کی جہالت کو صاف دیکھ سکیں گے۔ میں آپ کے سامنے جرمن لوگوں کی تاریخ سے بہتر مثال پیش نہیں کرسکتا جس پر آپ کو عمل کرنا چاہیئے۔ سو برس سے کچھ کم ہوئے کہ ان میں اتحاد نہ تھا اور ان کی قوتیں لڑنے جھگڑنے میں تلف ہوگئی تھیں اور وہ سب نہایت مفلس ہوگئے تھے۔ لیکن ان دوراندیش لوگوں نے جن کے ہاتھ میں اس وقت گورنمنٹ تھی اپنی تمام نظم مملکت کی تجویزوں کا دارومدار تعلیم کو بنایا اور اعلیٰ درجہ کی تعلیم پر نہایت زور دیا اور تمام اعلیٰ مدارج کے لئے اعلیٰ تعلیم شرط قرار دیدی اور یونیورسٹی کی نہایت فیاضی سے اعانت کی۔ انھوں نے علم اور کمال کو نفس اچھا جان کر ترقی دی۔ چاہے مالی فائدہ کچھ بھی نہو اور ایک صدی سے کم مدت میں ہم دیکھتے ہیں کہ مالی اعتبار سے بھی جو ایک بہت ہی پست معیار ہے جرمنی نے اپنی تعلیم کا عمدہ اثر دکھایا۔ اگرچہ بعض لوگ جرمن کی قابل رشک حالت کو جو یورپین کمال کی ہر دائرہ کی حیثیت سے ہے" نہیں سمجھ سکتے۔ اور وہ عظیم الشان ترقی جو وہاں کے لوگوں نے اخلاق تہذیب اور تمام لطائف زندگی کے باب میں کی ہے اس کی قدر نہیں جانتے مگر نہایت پست خیال لوگ بھی جرمن کی تجارتی کامیابی اور شادابی کے فوائد کو جان سکتے ہیں جو ایک لازمی نتیجہ جرمن لوگوں کی دماغی ترقی اور تعلیم کا ہے میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ آپ بھی اپنے فرائض پر جو قوم کے ساتھ ہیں ایسی ہی عالی خیالی کے ساتھ غور کیجئے اور تمام چھوٹے چھوٹے جھگڑے اور تنگ خیالیاں بالائے طاق رکھ کر جن سے کہ اکثر آپ کی تجاویز بدنما ہوجاتی ہیں۔ آپ سب مل کر قومی زندگی کا ایک شایاں مقصد پورا کیجئے۔



نواب مشیر الدولہ مدار الملک آنربل خلیفہ سید محمد حسن خان بہادر
صدر اجلاس نوزدہم کانفرنس (علیگڈھ سنہ ۱۹۰۵ ع)

اجلاسِ نوزدہم

(منعقدہ علی گڑھ سنہ ۱۹۰۵ء)

مشیر الدولہ، ممتاز الملک خان بہادر خلیفہ سید محمد حسین صاحب مرحوم

صدر اجلاس کانفرنس

حالاتِ صدر

سال پیدائش سنہ ۱۸۳۹ء سال وفات سنہ ۱۹۰۸ء

مرحوم خلیفہ محمد حسین صاحب کے بزرگ سید جلال الدین حسین صاحب المعروف بہ "سید جلال بخاری" بخارا سے شہر ملتان میں سنہ ۶۳۵ ہجری میں تشریف لائے۔ "حضرت جلال بخاری" کا مزار (اُچ شریف) ریاست بہاول پور میں اس وقت تک مرجع خاص و عام ہے اور ریاست کی طرف سے اس کے انتظام کے لئے ایک معقول جاگیر مقرر ہے۔ سید جلال بخاری کے پوتے سید جلال الدین ثانی المعروف بہ "مخدوم جہانیاں جہاں گشت" نہایت باخدا بزرگ گزرے ہیں جن کے محاسنِ کریمہ آج تک پنجاب و ہندوستان بھر میں معروف و مشہور ہیں۔

حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت کی اولاد میں سید نظام الدین صاحب دہلی سے سنہ [illegible]۰۲ ہجری میں آکر سامانے میں آباد ہوئے۔ یہ ایک پرانا اور مشہور قصبہ ہے جو پٹیالہ سے (اٹھارہ) میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔

انہیں بخاری سادات سامانہ میں سے حکیم سید غلام حسن جو اپنے زمانہ کے ایک مشہور اور نامور طبیب گزرے ہیں خلیفہ سید محمد حسین کے دادا تھے۔ ان کے بیٹے حکیم سید سعادت علی صاحب عرصہ دراز تک طبیب شاہی کی حیثیت سے اپنے فرائض منصبی مہاراجہ کرم سنگھ رئیس پٹیالہ کی خدمت میں بجالاتے رہے اس کے بعد مہاراجہ موصوف نے مرحوم کی علمی قابلیت اور لیاقت پر نظر کر کے اُن کو اپنے ولی عہد مہاراجہ نرندر سنگھ کا اتالیق مقرر فرمایا اس نسبت سے سید صاحب موصوف کا خاندان اب تک "خلیفہ" کے لقب سے مشہور ہے لفظ (خلیفہ) سے مراد اتالیق کا بیٹا ہے۔ سید سعادت علی کے بعد اتالیق کا عہدہ ان کی اولاد میں مختلف ولی عہدوں کے لئے سلسلہ وار قایم رہا اس لئے لفظ خلیفہ اس خاندان کے لئے عام طور سے استعمال ہونے لگا۔

خلیفہ سید محمد حسین مسلمانوں کی قدیم تہذیب اور شائستگی کا بہترین نمونہ تھے جو فضیلت علمی کے ساتھ نہایت باوقار اور سنجیدہ بزرگ تھے۔ اُنھوں نے اپنے نامور اسلاف کے قدم بہ قدم ریاست پٹیالہ کی اہم خدمات نہایت وفاداری اور تدبر کے ساتھ انجام دیں جس کے صلہ میں باوقات مختلف مہاراجگان سے انعامات ملے اور جاگیریں عنایت ہوئیں۔ برٹش گورنمنٹ نے بھی اُن کی نمایاں حیثیت قابلیت اور عمدہ کارگزاریوں کے اعتراف میں خطابات مشیر الدولہ، ممتاز الملک اور خان بہادری سے مخاطب کر کے سرفراز کیا۔ اور پنجاب کی سب سے پہلی لیجس لیٹو کونسل میں ریاست پٹیالہ کے بہترین عہدہ دار کی حیثیت سے کونسل مذکور کا آپ کو ممبر منتخب کیا

خلیفہ صاحب کو اپنی قوم کی علمی ترقی سے بدرجہ اتم ذوق وشوق تھا وہ اور اُن کے بڑے بھائی خلیفہ سید محمد حسن المخاطب زبیر الدولہ، مدبر الملک ابتدا سے سر سید احمد خاں کی تحریک تعلیمی کے دست و بازو اور مدرسۃ العلوم علی گڑھ کے نامور ٹرسٹی تھے ان کے اثر سے اور ان کی توجہ سے بیش بہا عطیہ جات کی امداد مختلف زمانوں میں مدرسۃ العلوم کو حاصل ہوئی وہ مذہبًا راسخ العقیدہ شیعہ تھے لیکن اُنھوں نے شیعہ سُنی کے اتحاد واخوت باہمی کے رشتہ کو قومی ترقی کا نصب العین سمجھ کر ہمیشہ سلوک اور اتحاد کی زبردست کوشش کی۔ وہ تعصبات مذہبی کی طرف سے نہایت فراخ دل واقع ہوئے تھے۔ ان کی طبع سلیم مدت العمر نہ صرف اپنی قوم کی ہوا خواہی میں گزری بلکہ پنجاب یونی ورسٹی کو بھی اُنھوں نے بہت سے وظائف اور تمغہ جات قابلیت اپنی طرف سے بلا امتیاز قومی عطا کئے جن سے اب تک کامیاب طلبہ فیض پا رہے ہیں۔

جب پنجاب میں سر چارلس ایچیسن لفٹنٹ گورنر کے زمانہ میں اُردو ہندی کا سوال اُٹھا تو اس تجویز کی نہایت قابلیت کے ساتھ خلیفہ صاحب نے پرجوش طریقے سے مخالفت کی اور عدالتوں میں بجائے اُردو کے ہندی کا رسم الخط جاری ہو جانے سے جو نقصان پہنچتا اُس سے ان کو محفوظ رکھا۔

جب مدرسۃ العلوم علی گڑھ میں شیعوں اور سنیوں کے واسطے جدا جدا دو مسجدیں تعمیر کرنے کی تجویز اراکین کمیٹی کے سامنے پیش تھی تو اس تجویز کی خلیفہ صاحب اور اُن کے بڑے بھائی خلیفہ وزیر الدولہ نے سختی کے ساتھ مخالفت کی اور سر سیّد کو لکھا کہ یہ تجویز اس اتحاد و یک جہتی کے اصول کے منافی ہوگی جس کے قایم کرنے کے لئے ہم سب نے کالج کی بنیاد قایم کی ہے چنانچہ مذکورہ بالا رائے کا جملہ ٹرسٹیانِ مدرسۃ العلوم علی گڑھ نے احترام کر کے ایک مسجد تعمیر کرنے پر اتفاق رائے کیا۔ مرحوم کو تصنیف و تالیف کا بھی شوق تھا۔ اعجاز التنزیل، اور ترجمہ سیر و سیاحت ڈاکٹر برنیر و مفید کتابیں آپ کے علمی شغف کی یادگار باقی ہیں۔ ۱۹۰۵ء میں بہ عہد نواب محسن الملک ایجوکیشنل کانفرنس کی مجلس کے علی گڑھ میں صدر منتخب ہوئے مجلس ہذا کی ترقی سے اور اس کے ذریعہ سے ہر صوبہ کے مسلمانوں میں اتحاد باہمی کی وسعت کو دیکھ کر اور عام طور پر تعلیمی خواہش کا رجحان دیکھ کر آپ کو خصوصیت کے ساتھ دلچسپی تھی اور اس لحاظ سے اُنہوں نے اجلاس کے لئے کانفرنس میں شریک ہونے کے واسطے باوجود کبر سنی کے لمبے لمبے اور دور دراز مقامات مثلاً ۱۹۰۶ء میں پٹیالہ سے ڈھاکہ اور کراچی کے سفر کئے۔

بالآخر ہر کمالے را زوالے بزرگوں اور بزرگ زادوں کی یہ آخری یادگار بھی جو اپنی ذاتی خوبیوں اور اوصافِ انسانی کے لحاظ سے سچائی، ہمدردی، نیکی، بلند ہمتی علمی اور عملی اخلاق کا ذخیرہ تھی ۱۹۰۸ء میں لباس فنا پہن کر اس شمع حیات کو جس کے نور سے ایک عالم فیضیاب تھا ہمیشہ کے لئے بجھا دیا۔

نوٹ ماخوذ حالات نوشتہ سید محمد اسلم صاحب پٹیالوی نبیرۂ خلیفہ صاحب مرحوم

خطبۂ صدارت

حضرات! یہ پہلا ہی موقعہ ہے کہ مجھے کانفرنس کی کارروائی میں شریک ہوکر ایڈریس دینے کا اتفاق ہوا ہے۔ اور یہ محض میرے مکرم دوست نواب محسن الملک بہادر اور دیگر بزرگان قوم کی کمال عنایت ہے کہ جنہوں نے باوجود عذر و انکار کے اس خاکسار کو جو خاموشی کے ساتھ قوم کی خدمت گزاری کو زیادہ پسند کرتا ہے اپنی مہربانی کی کشش سے گھسیٹ کر اس پلیٹ فارم پر آپ کے سامنے حاضر کر دیا ہے۔ میں آپ صاحبوں کی خدمت میں اس عزت افزائی کے شکریہ کا اظہار کرنے کے لئے کوئی الفاظ کافی نہیں پا سکتا۔ کیونکہ اس سے پہلے ایسے نامور اور قابل اور اکابر قوم اس با احترام مجمع قومی کی کرسی صدارت پر بیٹھ چکے ہیں۔ کہ جن کی قابلیتوں کے مقابلہ میں مجھے کوئی بھی مناسبت نہیں ہے اب میں آپ کی خدمت میں آپ سب صاحبوں کی تشریف آوری کا شکریہ اور خیر مقدم عرض کرتا ہوں۔ کہ محض حُب قومی سے تکلیف سفر گوارا فرما کر اور اپنے کاموں کا حرج کر کے شریک کانفرنس ہوئے ہیں۔

حضرات! اس مجمع کی نسبت ہندوستان کے کسی نہ کسی حصہ میں ہوتا رہتا ہے سرسید مرحوم نے جو اس تحریک کے موجد اور بانی تھے ۱۸۸۶ء میں اس جگہ سب سے پہلی کانفرنس میں اپنا یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ اگر بالفرض علی گڑھ کالج ہر طرح سے مکمل بھی ہو جائے تو بھی اس سے قومی تعلیم کا مسئلہ حل نہیں ہو سکتا کیونکہ اہل اسلام ہندوستان کے دور و دراز حصوں میں رہتے ہیں۔ وہ اکثر ایک دوسرے کی حالت سے بے خبر ہیں۔ اور کوئی ذریعہ ایسا نہیں ہے کہ مختلف صوبوں اور مختلف اضلاع کے لوگ کسی موقعہ پر آپس میں ایک جگہ جمع ہوں اور اپنے اپنے خیالات قومی تعلیم اور قومی ترقی کی نسبت ایک دوسرے پر ظاہر کریں۔ ہر حصہ ملک کے مسلمانوں کی ترقی یا تنزل کا حال تمام قوم کو معلوم ہو۔ اور مسلمان باوجود ایک قوم ہونے کے بمنزلہ مختلف قوموں کے ہو رہے ہیں ان میں قومی یگانگی اور ہمدردی پیدا ہو کانفرنس کے جمع ہوتے رہنے کے یہ فوائد اگرچہ بدیہی اور عیاں ہیں اور اب اس کے اتنے اجلاس ہو چکنے کے بعد اور ہر سال اس کے فوائد جتائے جانے اور اس کے نمایاں نتائج ظاہر ہو چکنے پر بھی بحث جاری رکھنی غیر ضروری معلوم ہوتی چاہئے تھی۔ لیکن افسوس ہے کہ بعض لوگ

اب بھی ازراہِ ناواقفیت یہ کہ دیتے ہیں کہ کانفرنس سے کیا فائدہ ہے۔ اس لئے میں اُن حضرات کی خدمت میں بالخصوص عرض کرتا ہوں کہ وہ غور فرمائیں۔ کہ ہندوستان کے ہر حصۂ ملک سے مختلف رائے اور خیالات کے لوگوں کا مسئلہ اشاعت تعلیم کی بحث کے لئے سال بہ سال جمع ہونا، اور باہم مبادلہ خیالات کرنا۔ اور اِن خیالات کو ایک مرکزِ واحد پر جمع کر کے پھر اقطاع دور و دراز میں لے جانا کیسا کچھ مفید ہے اس طریقہ پر مسئلہ تعلیم اور خصوصًا اس کے قومی پہلو پر اگر سال بہ سال گفتگوئیں اور بحث نہ ہوتی رہتی تو یہ امر اہم زاویہ خمول میں پڑ جاتا اور یہ خیال سر سید کے ساتھ ہی ہندوستان کے مسلمانوں کی طبیعتوں سے اگر بہ کلّی رحلت نہ کر جاتا تو ایک زبردست کشش کے دور ہو جانے سے کم زور اور منتشر تو ضرور ہو جاتا ۔ صورتِ موجودہ سے نہ صرف اس خیال کی زندگی ہے، بلکہ یہ خیال زندہ رہکر نشو نما اور حرکت کرتا رہتا ہی سر سید کے انتقال کے بعد میرے خیال میں اگر ہمارے محسنِ قوم اسم بامسمّی نواب محسن الملک بہادر کی مساعی جمیلہ سے کانفرنس کا اجتماع جاری نہ رہتا تو مسئلہ تعلیم اہل اسلام ضرور یا تو حالت پژمردگی وافسردگی میں پڑ کر نیم مُردہ جاتا۔ یا انتشار و اختلاف خیالات اس کے متعلق تمام کوششوں کو اس قدر پراگندہ اور بیکار کر دیتا کانفرنس کا کبھی ہندوستان کے دار السلطنت کلکتہ میں۔ کبھی مدراس میں۔ کبھی بمبئی میں۔ کبھی پنجاب میں کبھی ممالک متحدہ کے صدر لکھنؤ میں، اور کبھی امپیریل دربار کے عالی شان اور قابل یادگار موقع پر ہندوستان کے قدیم دار السلطنت دہلی میں جمع ہونا ہی بذات خود بدیہی دلیل کانفرنس کی کامیابی اور قوم کے ترقی خیالات کی ہے۔ اور اگر کوئی نمایاں نظیر اس کامیابی کی تلاش کرنا ضرور ہو تو فیاضِ قوم مسٹر نیناپلے مرکیار کی اس بے مثل فیاضی کو دیکھنا چاہیئے۔ کہ جنھوں نے ابھی اپنے روشن خیال دوست سلطان محی الدین صاحب ڈپٹی کلکٹر تینیوری کے مشورہ سے ہندوستان کے ایک ایسے صوبہ کے مسلمانوں کی تعلیم کے لئے جس کو باعتبار کمی ترقیات علم کے بیناسڈ پراونس کہا جاتا ہے۔ اور جو یہاں سے قریب دو ہزار میل کے ہے ایک درس گاہِ اعظم اسلامیہ علی گڑھ کالج کی تقلید پر قایم کرنا تجویز فرمایا ہے۔ یہ ایک قطعی اثر اس کانفرنس کا ہی اور اس کے علاوہ نواب محسن الملک بہادر کے ڈیپوٹیشن کو جو کامیابی برہما میں ہوئی یا سال گزشتہ میں ایک معقول کامیابی لکھنؤ میں ہوئی۔ کیا یہ سب کچھ انہیں سود مند مباحثات و مکالمات کا نتیجہ نہیں ہوا! جو اس قومی مجمع میں ہمیشہ ہوتے رہتے ہیں۔ جو فیاضی اور روشن خیالی مسٹر نیناپلے ممدوح نے دکھائی ہے۔ اس سے کامل توقعات پیدا ہوتی ہیں۔ کہ اب وہ دن دور نہ

نہیں ہے کہ بمبئی اور رنگون وغیرہ کے فیاض طبع دولتمند مسلمان بھی یونیورسٹی کے قایم ہونے کے لئے مالی امداد میں ایسی ہی نمایاں پیش قدمی کریں گے۔ مسٹر پیتا پلّے کی اس قابلِ ستایش فیاضی کے ذکر کے ساتھ بعض صاحب رائے لوگوں نے یہ خیال بھی ظاہر کیا ہے۔ کہ اگر یہ سرمایہ علی گڑھ کالج کو یونی ورسٹی کی حد تکمیل تک پہنچانے کے لئے صرف ہوتا تو اور بھی بہتر تھا۔ میں بھی اس خیال کا مخالف نہیں ہوں۔ فی الواقع علی گڑھ کالج جب مکمل ہو کر محمدن یونی ورسٹی ہو جائے تو اس سے مسلمان نوجوان بہت زیادہ قابلیتوں اور زیادہ تعداد کے ساتھ مختلف شعبہ ہائے علم میں مکمل ہو کر نکلیں گے اگرچہ ہندوستان کے مسلمانوں میں یہ خیال پیدا ہونا کہ اپنے اپنے علاقہ جات میں قومی مدارس اور تعلیم گاہیں قایم کریں نہایت مبارک خیال ہے۔ کیونکہ اس سے عام قوم کا اپنی تعلیم کی طرف متوجہ ہونا ظاہر ہوتا ہے مگر بجائے اس کے ہم اپنی کوششوں کو علیحدہ علیحدہ حلقوں میں محدود کر کے اپنی مجموعی قوت کو منتشر اور ضعیف کریں نہایت ضرور ہے کہ ہم اپنی قوتوں کو علی گڑھ کالج کو کالج سے یونی ورسٹی بنانے میں اول صرف کریں اور بعد ازاں اس کی شاخیں ہندوستان اور شاید دیگر ممالک اسلامیہ میں بھی پھیلانے کی کوشش کی جائے جو خدا نے چاہا ہماری آنے والی ذی ہمت نسلیں اس خیال کو کسی دن ضرور پورا کریں گی۔

حضرات! جس علمی روشنی کو ہم اپنی قوم میں پھیلانا چاہتے ہیں، جو علمی شوق ہم مسلمانوں میں پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ اور جس قسم کا انسان اور اُس کے ساتھ جس قسم کا قابل اور لایق مسلمان اپنی حالیہ اور آیندہ نسلوں کو بنانا چاہتے ہیں۔ جن اغراض کی خاطر سید مرحوم نے علی گڑھ کالج بنا کر محمدن یونی ورسٹی کی بنیاد ڈالی تھی وہ سب اغراض ہم کو حاصل نہیں ہو سکتیں۔ جب تک ہم اپنی تعلیم کے سامان کو اپنی مجموعی قوتوں سے مکمل اور مستحکم کر کے اُس کو کالج سے یونی ورسٹی نہ بنالیں اور اپنی طرز تعلیم پر کامل اعتبار حاصل نہ کرلیں۔

حضرات! امسال جو یہ کانفرنس اس جگہ جو علی گڑھ میں مدعو کی گئی ہے۔ اس کی ایک خاص وجہ یہ ہے کہ جن صاحبوں کو پہلے اس کالج اور اس کے انتظاماتِ اندرونی کے دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا اور صرف اخباروں کے ذریعہ سے سماعی حالات معلوم ہوئے ہیں اُن کو معلوم ہو جائے گا کہ یہ کانفرنس جس طرح کی تعلیم گاہوں کی مؤیّد ہے۔ اور جس طرح پر طالبعلموں کو انہیں رکھنا چاہتی ہے خود ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔ اور اس کے ساتھ اپنے خیال کو ترقی دے کر یہ سوچ سکتے ہیں کہ جب یہ کالج اپنی موجودہ حالت سے ترقی کر کے اسلامیہ یونیورسٹی

ہو جائے تو وہ فوائد بدرجہا کس قدر زیادہ ہوں گے اور یہ بھی آپ صحیح طور سے اندازہ کرلیں گے کہ اس وقت تک جن لوگوں نے اپنی ناچیز کوششوں کو علی گڑھ کے مرکز میں جمع کیا ہے اُس سے کس قدر فائدہ حاصل ہوا ہے۔ اگر یہ کوششیں اس طرح بر یک جا جمع نہ ہوتیں تو منتشر اور چھوٹی چھوٹی کوششوں سے یہ فوائد کس طرح حاصل ہو سکتے تھے۔ اور جن صاحبوں کو کانفرنس کے اس سے پہلے اجلاس میں شریک ہونے کا اس جگہ موقعہ مل چکا ہے وہ اب دس برس کے بعد یہ دیکھ سکیں گے کہ کالج کی حالت میں کس قدر ترقی ہوئی ہے اور کانفرنس میں جو ہر سال گفتگوئیں ہوتی رہتی ہیں اُس کی وجہ سے اور منتظمان کالج کی توجہ سے کیا نفع پہنچا ہے۔ نواب محسن الملک نے براہِ مہربانی اس گزارش کو قبول فرمایا ہے کہ گزشتہ دس سال میں جس قدر ترقی کالج کو ہوئی ہے وہ اُس کی ایک کیفیت آپ صاحبوں کے روبرو پڑھ کر سُنائیں گے۔

حضرات! علی گڑھ کالج مثل ایک بوٹینکل گارڈن کے ہے جیسے کہ کلکتہ۔ سہارنپور وغیرہ میں موجود ہیں۔ اور جہاں سے ہر ایک شخص جس کو کسی عمدہ پُھلوار یا پھول دار درخت کی اپنے باغ یا غیچہ کی رونق و افزایش کے لئے ضرورت ہوتی ہے حاصل کر سکتا ہے۔ اگر قوم کی متفقہ کوشش سے یہ کالج یونیورسٹی بن جائے تو ہندوستان کے بہتیرے باغ باغیچے اس کی امداد و اعانت سے آباد و پر منفعت اور سرسبز و شاداب ہو سکیں گے۔

حضرات! اس کانفرنس کی نسبت بعض اوقات یہ اعتراض بھی کیا جاتا ہے کہ جو گفتگوئیں ایک سال ہو چکتی ہیں یا جو رزولیوشن پاس ہو جاتے ہیں آیندہ سال اُن کی طرف پھر کچھ توجہ نہیں کی جاتی اس لئے میں تائید و تجدید کی غرض سے آپ صاحبوں کو اپنے قابل و نامور دوست مسٹر مارسین صاحب کے چند بیش بہا خیالات کی طرف توجہ دلاتا ہوں۔ جو صاحب ممدوح نے بہ حیثیت پریزیڈنٹ کانفرنس سال گزشتہ کے اجلاس میں ظاہر کئے تھے۔

حضرات! صاحب ممدوح نے اپنے عالمانہ ایڈریس میں اول تعلیم عربی کی طرف آپ صاحبوں کو متوجہ کیا تھا۔ میں اپنی ایک تحریر میں ٹرسٹی صاحبان کی خدمت میں اس مسئلے کے متعلق لکھ چکا ہوں کہ قائلان کلمہ طیبہ۔ لا الہ الا اللہ۔ محمد رسول اللہ سے عربی اور عربی سے اہل اسلام کسی طرح جُدا نہیں ہو سکتے۔ کلمہ طیبہ کی تصدیق قلبی اور قرآن مجید کو کلام اللہ سمجھنا اُسی حالت میں ہو سکتا ہے جبکہ مسلمان عربی کو جانتے ہوں اور مطالب قرآنی کو سمجھتے ہوں۔ عربی کا جاننا اہل اسلام کے لئے بمنزلہ

اُن کی روح اور زندگانی کے ہے جسد بے روح سے کوئی کیا امید کر سکتا ہے۔ اگر کوئی شخص دل سے کلمہ طیبہ اور کلام اللہ کا مصدق نہیں ہے تو مسلمان کہلانا ہیچ ہے علاوہ بریں ہر تعلیم یافتہ شخص کے لیئے صاحب اخلاقِ حمیدہ ہونا اور ذمایم اخلاق سے متنفر ہونا ضروری ہے۔ یہ سچ ہے کہ اخلاق کی تعلیم ہر ایک قوم اور ہر ایک زبان میں اپنے اپنے طور پر موجود ہے مگر مسایل اخلاقی کا اثر جس قدر اپنے بزرگوں کی روایتوں سے یا کہ اُس زبان کے ذریعہ سے کہ جس کو کوئی قوم از روئے ولادت مقدس سمجھتی رہی ہو ہو سکتا ہے۔ کسی دوسری زبان اور غیر قومی روایتوں سے نہیں ہو سکتا۔ اس لیئے جس طرح بر تعلیم عربی سے تعلیم مذہبی اور اخلاقی مقاصد مسلمانوں کو حاصل ہو سکتے ہیں وہ اور طریقہ سے حاصل ہونے ممکن نہیں۔ مگر عربی تعلیم سے میری مراد یہ نہیں ہے کہ وہ محض عامیانہ یا غیر محققانہ ہوا کرے۔ جیسی کہ ہندوستان کے مکاتب وغیرہ میں اور بعض اور ممالک اسلامیہ میں ہوتی رہتی ہے بلکہ ایسی تحقیق اور تدقیق سے مراد ہے جیسے کہ نامور قدما اہل اسلام میں تھی یا اب علم دوست اہل یوروپ میں ہیں۔ باوجودیکہ ان کو ممالک اسلامیہ سے کوئی تعلق ہے نہ اہل اسلام سے۔ بلکہ محض علم دوستی اور انکشاف حقایق اور ترقی معلمات کی غرض سے ایسا کرتے ہیں اور اس انکشاف حقایق ہی کا اثر ہے، کہ خاص انگلینڈ کے مشہور شہر لورپول میں مسٹر عبداللہ کوئیلیم وغیرہ طالبانِ حق مسلمان ہوگئے ہیں۔ اور ایک خاصہ مختصر سا گروہ مسلمانوں کا یورپ میں پیدا ہو گیا ہے۔ اور ان ملکوں کے لوگ جو حقایق اور محاسنِ دین محمدی کی بے خبری کی وجہ سے اسلام کو جنگلیوں اور ڈاکوؤں کا مذہب سمجھتے تھے۔ اب یوروپ اور امریکہ کے اکثر علمائے محقق اسی اسلام کی تائید میں قابل قدر مضامین اور کتابیں لکھ رہے ہیں اور اسلام اور اہل اسلام کو سمجھنے اور ان کی قدر کرنے لگے ہیں۔ مسٹر تھیوڈور ماریسن نے جو کچھ فرمایا اُس کا بھی یہی مدعا تھا۔ اور ہمارے نامور دوست مسٹر سید امیر علی نے بھی جو ہماری قوم کے روشن ستارے ہیں جو کچھ مختلف موقعوں پر ظاہر کیا ہے اُس کا بھی یہی مطلب ہے۔

حضرات! بعض موقعوں پر بیان کیا گیا ہے کہ سر سید احمد خاں اور ٹیل تعلیم کے جس میں عربی بھی شامل ہے مخالف تھے۔ بلاشبہ جس بات کے وہ مخالف تھے میں بھی اُس کا مخالف ہوں مسٹر ماریسن بھی مخالف مسٹر سید امیر علی بھی مخالف ہیں۔ دراصل یہ مخالفت محض عامیانہ اور غیر محققانہ تعلیم کی نسبت تھی۔ نہ کہ محققانہ اور عالمانہ تعلیم کی نسبت کہ جس سے اہل اسلام کی نہ صرف ظاہری زندگانی اور بقائے نوع متصور ہے بلکہ آپ کے قوائے عقلی کی نشوونما اور شگفتگی اور حقیقی اور روحانی

زندگی - علاوہ بریں سرسید کو یہ اندیشہ بھی تھا کہ اہل اسلام کا میلان طبع جو اپنی لکیر پیٹتے رہنے کی طرف ہے، کہیں علوم عربیہ کی جانب متوجہ ہوتا چھوڑ کر محض ایک ہی طرف نہ جھک پڑیں اور فی الواقعہ بدون علوم وفنون مغربیہ کے محض عربی اس زمانہ میں کسی طرح نافع نہیں ہے اور مجھے امید کامل ہے کہ اہل اسلام محققانہ تعلیم عربی کو برد دینے کے لئے ہمیشہ بدل متوجہ رہیں گے - اور اپنی دنیاوی علمی ترقیوں کے ساتھ جن کا ذکر میں آگے کردن گا ایسی اس دینی اور روحانی ترقی کو بھی بھول نہ جائیں گے تعلیم عربی کے بعد جس بات کا بہ خصوصیت مسٹر ماریسن نے ذکر کیا تھا اور جس پر کانفرنس میں صاحب زادہ آفتاب احمد خان اور نواب محسن الملک بہادر نے بڑی فصیح اسپیچیں کی تھیں اور جس کو ہمارے مکرم شمس العلما مولانا نذیر احمد صاحب اپنی دوراندیشی سے عربی کی تعلیم سے بھی مقدم سمجھتے ہیں وہ یہ ہے کہ علی گڑھ کالج میں تعلیم سائنس کو اس قدر وسعت دی جائے کہ اس زمانہ کے مختلف علوم وفنون کی اعلیٰ تعلیم ہماری آیندہ نسلوں کو بہم پہنچائی جائے - جس سے ہمارے لئے انواع اقسام کے راستے خود بخود کھل جائیں اور مسلمان عزت وشہرت و دولت اور تہذیب وشایستگی کی اعلیٰ منازل پر پہنچکر نہ صرف اپنی ذات اور قوم کے لئے نافع ہوں بلکہ ملک اور نہ صرف ملک بلکہ دنیا کی عام ترقی میں ایک نمایاں حصہ دار بن کر دکھائیں۔

حضرات! یہ زمانہ صنعت وحرفت وتجارت کا زمانہ ہے - اور اقوام وممالک کی طاقت وعزت اس زمانہ میں نہ مذہب پر منحصر ہے، نہ مردم شماری پر نہ رقبہ پر بلکہ صرف اس قوم کی تجارت اور علم کی حالت پر منحصر ہے - صنعت وحرفت اور تجارت میں اصلی ترقی اس وقت تک نہیں ہو سکتی، جب تک کہ اُن کی عمارت سائنس اور علوم کی مستحکم بنیادوں پر نہ اُٹھائی جائے - ہندوستان کے تجارتی شہروں میں رہنے والے اگرچہ اقوام متمدنہ کی دیکھا دیکھی کچھ نہ کچھ روپیہ کمانے کے ڈھنگ سیکھ لیتے ہیں - لیکن اصل بات یہ ہے کہ صنعت وحرفت اور تجارت اور اُس کے لئے ایجاد و اختراع کی استعداد، جیسی کہ چاہیئے بغیر سائنس میں کمال حاصل کرنے کے نہیں ہو سکتی - اور مختلف اقوام وممالک کے دیکھنے اور خصوصًا یورپ میں جا کر اس زمانہ میں ترقی حاصل کرنے کے اور اُس کے ساتھ عملی طریقے سیکھنے اور اہل یورپ کی سی اولوالعزمی - ہمت - استقلال - عادات و خصائل وخیالات پر غور کرنے اور سیکھنے کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی -

محض بی - اے - تک تعلیم حاصل کر کے اس پر قانع ہو جانا اور اُسی کو ہائی ایجوکیشن کی انتہا سمجھ لینا - ہرگز کافی نہیں ہے - جب تک کہ مسلمان طالب علم اعلیٰ سے اعلیٰ درجات تعلیم

مختلف علوم و فنون کی شاخوں میں حاصل نہ کریں۔ مدارج کمال اور فراغ بال حاصل نہیں کر سکتے پس خواہشمندان ترقی اہل اسلام کو واجب ہے کہ اُن کی کوششوں کے دو حصے ہوں ایک تو یہ کہ مسلمان مسلمان سمجھے جائیں دوسرے یہ کہ وہ ایسے صاحب محقق اور صاحب کمالات عالم ہوں، جو خود اپنے نفس کے لئے اور دوسروں کے لئے مفید اور رہنما اور خوش حال اور فارغ البال ہوں۔ اور یہ سب کچھ تب ہی حاصل ہو سکتا ہے کہ جب علم اور مال دونوں پران کو قدرت اور قبضہ ہو۔ جیسے کہ اس وقت اقوام متمدنہ یورپ وامریکہ یا کہ جدید الوجود قوم متمدنہ جاپان کی حالت ہے جو ہندوستان کے قریب تر اور ہماری ہمسایہ ہے۔ اور جو اب سے چالیس پچاس برس پہلے کسی شمار و قطار میں بھی نہ تھی۔ اور محض سوائے تجارت اور سوداگری سے ہی جب تک اُس کے ساتھ علمی روشنی اور قوت ایجاد شامل نہ ہو۔ اہل اسلام کو دنیا میں کچھ عزت حاصل نہیں ہو سکتی۔

چند سال ہوئے میں نے ایک مسلمان دوست سے جو بمبئی کے تجارت پیشہ قوم خوجہ سے تھے اُن کے مذہب کے متعلق چند کتابوں کے حاصل کرنے کے لئے کہا۔ میں نے اپنے دوست سے احتیاطاً یہ بھی کہدیا تھا کہ میں یہ کتابیں صرف حصول آگاہی و معلومات کے لئے چاہتا ہوں نہ کسی مذہبی قیل وقال و بحث و جدال کے لئے۔ مگر جب میرے تاجر دوست نے یہ جواب دیا کہ حضرت ہم لوگوں کا یہ حال ہے کہ بجز۔ لاالٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کہہ لینے اور گجراتی زبان کے حروف میں اپنا بہی کھاتہ لکھ لینے کے اور کچھ نہیں جانتے تو مجھے سخت افسوس ہوا میں نے ایسی ہی حالت بعض متمول میمن لوگوں کی دیکھی۔ پس حضرات! اگر تمول کے ساتھ علم نہ ہو اور علم کے ساتھ تمول نہ ہو تو ایسے علم اور ایسے تمول سے دنیا میں قوم کو وہ عظمت اور فضیلت حاصل نہیں ہو سکتی جو مطلوب و مقصود ہے۔ جیسا کہ کسی زمانہ میں ہمارے ایک تجربہ کار عالم نے فرمایا تھا۔ ؎

مرا بہ تجربہ معلوم گشت آخر حال
کہ قدر مرد بہ علم است قدر علم بہ مال

سرسید مرحوم جب اپنا گھر بار بیچ کر مرحوم سید محمود کو ولایت لے گئے اور اس طرح پر ہندوستان کے مسلمانوں کو فوائد تعلیم یوروپ کا راستہ دکھایا۔ تب سے مسلمان طالبعلموں نے ولایت جانے اور تحصیل علوم مختلفہ میں بے شک کچھ پیش قدمی کی ہے۔ مگر ابھی یہ معدودے چند کا جانا یا کہ ہماری

محدود کوششوں سے چند بی۔اے۔ یا ایم۔اے کا علی گڑھ کالج سے اور بعض دیگر مقامات سے تیار ہو جانا ہندوستان کے چھ کروڑ مسلمانوں کے لئے ہرگز کافی نہیں۔ جن اہل اسلام کو خداوند نے اپنے ہم جنسوں کی مالی امداد کرنے کے لئے مقدور دیا ہے اُن کو اپنی ہم قوموں کو ذلت ادبار کے گڑھے سے نکال مدارج ترقی و کمال پر پہنچانے کے لئے کوشش کرنا ضروریات سے ہے سرسید احمد خاں بہادر نے ایک سول سروس فنڈ چندے سے جاری کیا تھا اور ایک خاص کلاس بھی مدرستہ العلوم میں قایم کرنا چاہا تھا۔ تاکہ بعض منتخب طالب علم حصول تعلیم سروس کے لئے تیار کئے جا کر ولایت کو تکمیل تعلیم کے لئے بھیجے جایا کریں میں بھی بے انتہا خوشی سے اس میں شریک ہوا تھا۔ تعداد چندہ سالانہ اگرچہ بہت قلیل تھی مگر افسوس قوم کی بے توجہی سے کچھ دنوں یہ چندہ جاری رہ کر بند ہو گیا۔ اگر علی گڑھ میں سول سروس اور سائنس و پیشہ ہائے مفید کی تعلیم کے لئے محبان قوم چندہ سے فنڈ قایم کر سکیں یا کہ ذی مقدور طالب علموں کے مربی خود اپنے ذاتی سرمایہ سے ہونہار نوجوانوں کو تعلیم کے لئے یوروپ و امریکہ و جاپان بھیجنے کے طریقے میں حالت موجودہ سے زیادہ ترقی دیں اور جو نوجوان ممالک غیر میں نہ جا سکتے ہوں اُن کو ہندوستان ہی میں فن انجنیری و طبابت و زراعت وغیرہ میں (جس کے اسکول و کالج ہماری گورنمنٹ کی مہربانی سے اس ملک میں بھی کچھ نہ کچھ موجود ہیں) تعلیم دلوائیں تو جس ادبار و افلاس میں مسلمان عموماً گرفتار ہیں اس سے بہت کچھ نجات مل سکتی ہے۔ جیسا کہ ہمارے ہندوستان ہی کی عاقبت اندیش اور کفایت شعار اقوام ہندو و پارسی خصوصیت سے اپنے روپئے کو بچا کر اولاد کو یوروپ و امریکہ و جاپان میں مختلف فنون اور پیشوں کی تعلیم دلوانے میں کوشش کر رہے ہیں۔ نوجوان طالب علموں کا غیر ملکوں میں جانا اور رہنا سوائے اُس تعلیم کے کہ جس کے لئے وہ وہاں جائیں عموماً اُن میں ہمت و حوصلہ۔ جرأت پیدا کرے گا۔ اور دیگر ملکوں کے دیکھنے سے اور دیگر اقوام کے اختلاط پیدا کرنے سے جو عقلی و اخلاقی شگفتگی اور سلف رسپکٹ اور سلف ہلپ پیدا ہوگی اُس کے فوائد بدیہی اور عیاں ہیں۔

حضرات! مجھے ایک قابل اعتماد مسلمان تاجر دوست نے جو بہت عرصہ تک انگلینڈ۔ فرانس قسطنطنیہ اور مصر وغیرہ میں رہا تھا اور مسلمانوں کی پست حالت سے آگاہ تھا۔ ممالک غیر میں جا کر تعلیم حاصل کرنے کے فوائد کی نسبت محمد علی پاشا اول خدیو مصر کی جو ایشیائی مسلمان فرمانرواؤں میں ایک نہایت ہوشمند اور مدبر شخص تھا۔ ایک عاقلانہ اور پُر غیرت حکایت سنائی تھی کہ وہ اپنے جاہل اور ناتربیت یافتہ سرداروں اور اُمرا کی حالت دیکھ کر اُن کو فرنگستان میں جا کر تعلیم و تربیت

حاصل کرنے کی ایک عرصہ تک فہمائش کرتا رہا۔ لیکن جب اُنھوں نے اس نصیحت پر عمل نہ کیا تو اُس دانش مند دور اندیش مدبر نے آخر کار اُن کو یہ سمجھایا کہ تم نے میرا کہنا نہ مانا۔ مگر اب میں کیا کروں گا کہ جو لوگ پست حالت میں تمھارے زیر دست ہیں یہاں تک کہ زرخرید غلام بھی ہیں اُن کو یورپ میں بھیجوں گا۔ اور جب وہ علم و فضل حاصل کر کے واپس آئیں گے تو وہ حاکم بنائے جائیں گے اور تم لوگ محکوم ہو گے۔ اور آخر کار ایسا ہی کر دکھایا۔

حضرات! مصر و قسطنطنیہ میں کس قدر روشنی علم و عقل کی جو آپ دیکھ رہے ہیں یہ ایسے ہی دانشمندانہ تدبیروں کا نتیجہ ہے۔ زور دا ختیار حاکمانہ سے طالب علموں کو ممالکِ دور دست میں بھیجنا اگرچہ بہت آسان ہے۔ مگر میرے خیال میں ہم لوگ اپنی مرضی اور رغبت اور اختیار سے جو کچھ اس بارہ میں کریں گے وہ زیادہ مستحکم اور زیادہ پائیدار اور زیادہ مفید ہو گا۔ اس کے متعلق میں یہ بھی عرض کرتا ہوں کہ ہمارے ممالک، پنجاب میں بلکہ سارے ہندوستان میں سکھوں کی تعداد تقریباً بیس لاکھ انسانوں کی ہے اور بجز چند والیان ملک اور بعض چھوٹے سرداروں کے سب زراعت پیشہ ہیں۔ ہمارے فیاض والیان ملک نے اور نیز اُن ذی عزت سکھ سرداروں نے اپنی قوم کے بہبود کے لئے خالصہ کالج کو جو بیس لاکھ روپیے سے زیادہ کی نمایاں امداد بمقام امرت سر ابھی اپریل ۱۹۰۴ء میں دی ہے اور اس کے علاوہ جو دو لاکھ کے فنڈ سے اسی مہینہ میں ایک سکالر شپ غیر ممالک میں تعلیم حاصل کرنے کے لئے مقرر کیا ہے۔ وہ ہندوستان کے رؤسا و والیان ملک، بڑے بڑے تعلقداروں اور متمول تاجروں کے لئے میں نہیں کہنا چاہتا کہ قابل شرم ہے، مگر یہ ضرور کہوں گا کہ قابل تقلید ہے۔ کیا جو کام بیس لاکھ آدمیوں نے کہ جن میں لاکھوں معمولی کاشتکار بھی ہیں ایک عرصۂ قلیل میں کر دکھایا ہے۔ وہ ہندوستان کے چھ کرور مسلمان جن میں اب بھی بفضل ایزدی بڑے بڑے والیان ملک اور جاگیرداران و تعلقداران زمینداران و تاجران ذی امتیاز موجود ہیں، نہیں کر سکتے البتہ قومی حاجات سے ناواقفیت اور خیر دائمی اور صدقات جاریہ کے اصل طریق سے ناواقفیت اس تمام بے غرضی اور لاپروائی کا سبب ہے بیچارے میر جعفر حسین جیسا دردِ دل اگرچہ امرائے قوم کو ہوتا کہ جنھوں نے عرصۂ قلیل میں تیس ہزار کے قریب "ون پینی فنڈ" کے سلسلے میں بھیک مانگ کر محض اپنی ذاتِ واحد کی کوشش سے علی گڑھ کے قومی سرمایہ میں داخل کر دیا ہے۔ اور اگر بالعموم اہلِ اسلام والیان ملک اور ذی مقدور لوگ متوجہ ہو جائیں اور اپنی قوم کی مصیبتوں اور حاجتوں سے آگاہ ہو جائیں تو بجائے ون روپی فنڈ کے لکھ روپی فنڈ" جمع کر کے دکھا سکتے ہیں۔ مگر ہاں قومی

حمیت اور درد دل اور انفاق فی سبیل اللہ کے مفید اور معقول طریقوں پر غور فرمانا شرط ہے۔

پس حضرات! ہماری قوم کی آیندہ عزت آرام و آسائش اور ترقی اور عروج کا رستہ اور یہ موجودہ افلاس و احتیاج اور پستی اور کس مپرسی اور ذلت و جہالت کا علاج یہ ہے کہ ہم سردست جس قدر ہو سکے مالی امداد دے کر اپنے قومی کالج میں اور بعد ازاں وسیع پیمانہ پر اپنی قومی یونیورسٹی میں ہر قسم کے مفید علوم و سائنس کی اعلیٰ تعلیم کے سامان مہیا کرنے کی فکر کریں۔ مختلف پیشوں اور کاموں کے لئے وظیفے اور فنڈ قائم کریں اور اپنے ہونہار طالبعلموں کے لئے اعلیٰ منزلوں پر پہنچنے کے آسان اور صاف راستے بتائیں اور ہر قسم کی ترغیب و تحریص کے ذرائع پیدا کریں۔ ایک اور اہم اور نازک معاملہ جس پر کانفرنس کے اجلاسوں میں کچھ گفتگو ہو چکی ہے، وہ تعلیم نسواں کا مسئلہ ہے۔ حضرات! اس زمانہ میں کسی ذی فہم شخص کو اس امر سے اختلاف نہیں ہے کہ جس طرح لڑکوں کی تعلیم ضروری ہے لڑکیوں کی تعلیم بھی ویسی ہی ضروری ہے۔ اس زمانہ میں تعلیم یافتہ مسلمانوں کے گھرانے کا باپ بھائی یا شوہر اپنے خاندان کی تعلیم نسواں میں جہاں تک ہو سکتا ہے کوشش کرنا چاہتا ہے۔ یہ امر نہایت موجب خوشی ہے۔ اور ہر ایک تعلیم یافتہ محب قوم کو لڑکوں اور لڑکیوں کی تعلیم میں بدل کوشش کرنا جیسا کہ سب جانتے ہیں ایک فریضہ مذہبی ہے۔ لیکن اس ضروری مقصد کے حصول کے لئے اس زمانہ کے حسب حال تعلیم دینے کے لئے عمدہ اور آسان ذرائع مہیا نہیں ہیں۔ اور اگر اس مسئلہ اشاعت تعلیم نسواں میں کچھ اختلاف ہے تو محض تعلیم دینے کے طریقوں کی نسبت ہی۔ اس زمانہ کے بعض ترقی یافتہ خیالات کے حضرات پردہ کی رسم کو جس طرح پر کہ اس وقت ہندوستان میں عروج ہے حارج ترقی تعلیم سمجھ کر اس کی اصلاح پر زور دیتے ہیں۔ اور لڑکیوں کے اسکول بنانے کے خیالات ظاہر کرتے ہیں۔ اس خیال کے موافق جہاں کہیں پردہ شرعیہ کی محافظت کے ساتھ عمل ہو سکتا ہے، ہونا چاہیئے۔ اور یہ امر کچھ مناسب نہیں ہے کہ ایسے خیالات کی نسبت تحقیر اور اعتراض کے الفاظ خواہ مخواہ اخباروں میں شائع کئے جائیں لیکن یہ امر ظاہر ہے کہ ہماری (قوم) کا اکثر حصہ کنسرویٹو خیالات رکھتا ہے جن کے خیالات میں بغیر اس عام اشاعت اعلیٰ تعلیم کے کہ جس کے لئے ہم کوشش کر رہے ہیں تبدیلی کا ہو جانا ایک دن کا کام نہیں ہے۔ اور ترقی یافتہ گروہ تعداد میں ہنوز بہت قلیل ہے۔ اس لئے یہ خیالات طبائع جمہور سے موافقت نہیں کھاتے اور جو نتیجہ مطلوب ہے وہ حاصل نہیں ہوتا۔

حضرات! میری رائے میں کانفرنس کا اس بارہ میں مجموعی خیال یہ ہونا چاہیئے کہ ہر خیال کے اہل اسلام جس جس طرح پر کہ ہو سکتا ہو۔ اپنے اپنے خیالات کے موافق کوشش کریں مگر سب کا مقصد

واحد یہ ہونا چاہیئے کہ جس طرح سے ہو سکے لڑکیوں کی تعلیم میں روز بروز ترقی ہو۔ خصوصاً جو لوگ لکھے پڑھے ہیں۔ وہ اپنے گھروں میں لڑکیوں کو پرائیویٹ تعلیم دیں۔ اگر کسی جگہ مدرسہ۔ یا اسکول بنایا جا سکتا ہے تو اُس کو بھی بن نے دو۔ غرضیکہ ہر طرح کی سوسائیٹی کے مناسب حال جو کوشش ممکن ہو وہ عمل میں لانی چاہیئے۔ ایک خیال جو غالباً کنسرویٹو طبیعتوں کے موافق ہو سکتا ہے اور جس سے تعلیم نسواں کے لئے آئندہ بہت بڑی بنیادیں پڑ سکتی ہیں یہ ہے کہ ایک محصور تعلیم گاہ بنائی جائے کہ جس کے اندر زنانہ اسکول بھی ہو اور بورڈنگ ہوس بھی۔ پھاٹک پر مِسن اور شریف محافظ ہوں۔ اندر متعدد کمرے ہوں کہ جن میں لڑکیاں مع اپنے خاندان کی کسی بڑی بوڑھی کے بہ آرام رہ سکتی ہوں۔ اندر ہی اُن کی معلّمات کے لئے کمرے بنے ہوں۔ اوقاتِ مقررہ پر سب لڑکیاں اسکول کے کمروں میں تعلیم پائیں۔ اسی حصار کے اندر حفظ صحت کے لئے بیڈمنٹن۔ بلیرڈ روم اور کروکی وغیرہ ایسے کھیل جو لڑکیوں کے مناسب حال ہوں کھیلنے کے لئے اچھے وسیع کمرے اور میدان ہوں اندر ہی کھانے پکانے، سینے پرونے کشیدہ وغیرہ دستکاریوں کے لئے بندوبست ہو۔ اچھا کھانا پکانے والی۔ چند مامائیں ایسی ہوں کہ جن سے لڑکیاں کھانا پکانا بھی سیکھ سکیں جیسا کہ اکثر شریف ومتوسط الحال گھروں کا دستور ہے۔ زنانہ لیڈی ڈاکٹر اور زنانہ انسپکٹرس اور معلمہ یوروپین مقرر ہوں۔ اس طریقہ پر لڑکیوں کی تعلیم معمول سے بڑھ کر بہت عمدہ طور پر ہو سکتی ہے۔ اور نصاب تعلیم بزرگان قوم ایسا بنا سکتے ہیں جو مناسب حال ہو۔ اور اس میں مذہبی تعلیم قرآن شریف مع ترجمہ، اور دیگر اخلاقی تعلیم قواعد حفظ صحت۔ تربیت اطفال امور خانہ داری معمولی حساب وکتاب بھی شامل ہو اور پھاٹک کے قریب کوئی خاص کمرہ اسی حصار کے اندر خاندان کے مردوں کی ملاقات کے لئے ہو تاکہ جب کسی لڑکی کا رشتہ دار ملنے آئے تو وہ وہاں مل سکے۔ غرضکہ اسی حصار کے اندر جملہ ضروریات موجود ہوں۔ ایسی تعلیم گاہ کم از کم سو لڑکیوں کے لئے ہونی چاہیئے۔ اور زیادہ جس قدر ممکن ہو وہ بہتر ہے۔ اس طرح پر جو لڑکیاں تعلیم پاکر نکلیں گی۔ تھوڑے عرصہ میں خود اور لڑکیوں کو جابجا تعلیم دینے کے قابل ہو جائیں گی۔ اور آئندہ ترقیوں کا ایسا بیج بویا جائے گا جو خوب پھلے پھولے گا۔ اور باایں ہمہ اغلب ہے کہ کسی کنسرویٹو خیال کے مخالف بھی نہ ہوگا اور اسکول اور بورڈنگ ہوس کی ساری خوبیاں اس طریقہ میں جمع ہوں گی۔ اگر امرائے ذی دولت فیاضانہ چندوں کے مجموعی فنڈ سے ایسا محفوظ ومحصور بورڈنگ ہاؤس علی گڈھ میں بنا سکیں یا جناب عالیہ بیگم صاحبہ بھوپال۔ جو پہلے ہی اس کار خیر کی طرف بہت متوجہ ہیں یا عالیجناب نواب صاحب بہادر والیٔ رامپور یا ہزہائینس نواب صاحب بہادر بہاولپور یا حضور نواب نظام عالی مقام اپنی اپنی

دارالریاست میں اس سسٹم کو جاری فرما سکیں تو قوم کی بے شمار مشکلات جو اس بارہ میں ہیں حل ہو سکتی ہیں۔ اور تعلیم یافتہ لڑکیوں کا گروہ عظیم ان بورڈنگ ہاؤسوں میں تیار ہو کر جابجا نور علم کو اپنی ہم جنسوں میں بغیر کسی روک اور مزاحمت کے پھیلا سکے گا۔

حضرات! میرے خیال میں یہ مسئلہ ایسا نازک ہے۔ کہ اگر ہم کامیابی چاہتے ہیں تو اپنی عملی تدابیر میں ہم کو کنسرویٹو خیالات کا ضرور لحاظ رکھنا چاہیئے۔ اور اس کے ساتھ ہی ہم کو یہ امید رکھنی چاہیئے کہ جس قدر لڑکوں کی تعلیم میں کامل ترقی ہوتی جائے گی اس کے لازمی نتیجہ کے طور پر تعلیم نسواں میں بھی ضرور ترقی و کامیابی ہو گی۔ اور نہایت عمدہ اور پائدار ہو گی۔ جو تمام دلوں کے اندر سے خود بخود پیدا ہو گی۔

حضرات! تعلیم عربی، تعلیم سائنس، فارین ایجوکیشن، اور تعلیم نسواں ہر قسم کی تعلیم کے ذکر کے ساتھ یہ امر بے موقع نہ ہو گا کہ میں آپ کو تعلیم جسمانی کی ضرورت اپنے کالج اور یونیورسٹی کی تجاویز میں ہمیشہ ملحوظ رکھنے اور اس کو ہر طرح سے ترقی دیتے رہنے کی طرف بھی متوجہ کروں۔

تعلیم کتابی کے ساتھ ہمارے علی گڑھ کالج میں فٹ بال۔ اور کرکٹ۔ مشق سواری و ڈرل وغیرہ کی جسمانی ورزش پر زور دیا جاتا ہے یہ سب کچھ ہمارے کالج کے پرنسپلوں اور یورپین پروفیسروں کی مہربانی اور توجہ سے ہوا ہے چند سال ہوئے کہ سر سید کے عہد حیات میں جب ہز ایکسیلنسی لارڈ رابرٹس نامور کمانڈر انچیف ہندوستان نے اپنی ہندوستانی فوج میں سے ازراہ مہربانی قواعد سکھانے کے لئے ایک اُستاد مامور فرمایا تھا اور اسی طرح جب علی گڑھ کالج کے بعض نوجوان لڑکوں کو ایک چین میں جانے والی رجمنٹ میں بطور ڈائرکٹ کمیشن کے چند عہدے دئے گئے تھے تو مجھے ان دونوں باتوں سے نہایت ہی خوشی ہوئی تھی۔ ہم مسلمانوں میں اکثر لوگ اُن اقوام کی اولاد میں ہیں کہ جن کے بزرگ یا تو سپاہی تھے، یا جامع سیف و قلم۔ تعلیم کتابی و فنون کے ساتھ سپاہ گری کے خیال کو بھی ہمیشہ ترقی دیتے رہنا چاہیئے۔ چند سال ہوئے جبکہ مجھے نیل گری اور مدراس جانے کا اتفاق ہوا تو یہ دیکھ کر مجھے بہت افسوس ہوا کہ وہاں کے مسلمان عام اصلی باشندگان ملک کی طرح ننگے پاؤں پھرتے تھے اور اکثر دھوتیاں اور تہ بند باندھتے تھے۔ قوموں میں ایسی رسوم و عادات جاری ہو جانے سے صفات مردانگی مفقود ہو جاتی ہیں۔ اور جرارت و ہمت کم ہو جاتی ہے۔ پھر اس کا اثر قومی عزت اور قومی فوائد دونوں پر پڑتا ہے۔ شاید ہم میں سے بعض حضرات کو وہ دونوں رزولیوشن گورنمنٹ مدراس و گورنمنٹ بنگال کے یاد ہوں گے کہ جن میں سے اول الذکر نے مدراس کے درباریوں کو یہ ہدایت

کی تھی کہ جب وہ گورنمنٹ ہاؤس یا دیگر سرکاری رسمیات میں آیا کریں تو ایسے لباس میں آیا کریں
کہ اُن کی ٹانگیں برہنہ نہ ہوں اور گورنمنٹ بنگال کے بعد اور صوبوں میں بھی تحصیلداری وغیرہ
عہدوں کے لئے علاوہ اور فنون اکتسابی یہ شرط لازمی گردانی گئی ہے کہ اس عہدوں کا اُمیدوار
گھوڑے پر چڑھنا بھی جانتا ہو۔ میرے خیال میں کسی ذی علم شخص کو محض اپنے ایسے غیر مردانہ لباس
کی وجہ سے یہ کہلانا کہ کسی باعزت سرکاری مجمع میں شامل نہ ہو سکے گا نہایت موجب شرم ہے اور
کسی نوجوان مرد سے یہ سوال ہونا بھی کہ تم گھوڑے پر چڑھنا جانتے ہو یا نہیں ایسا ہی سوال ہے کہ بالفاظ
دیگر اس کے یہ معنی ہیں کہ تم اوصاف مردانگی سے معرّا ہو اور سوائے کسی دفتر میں بیٹھ کر قلم چلانے
کے اس قابل نہیں ہو، کہ کسی مردانہ خدمت سرکاری کے فرائض بوجہ احسن ادا کر سکو ہماری مربی
و محافظ گورنمنٹ انگریزی کے تعلقات اس زمانہ میں دنیا کے دور و دراز مقامات مثل سوڈان و
دیگر حصص افریقیہ و عربستان و ایران و افغانستان و خراسان و سیستان اور مختلف اقوام کے ساتھ
نہایت ترقی کر گئے ہیں۔ نوجوان مسلمانوں کو اپنے اوضاع و اطوار میں ایسے مردانہ طریقے اختیار کرنے
چاہئیں کہ جب ان ممالکِ دور دست میں جانا پڑے تو یہ ننگے سر اور ننگے پاؤں رہنے اور دھوتی و
تہ بند باندھنے کے غیر مردانہ عادات اُن کی چستی و چالاکی میں حارج و سدِ راہ نہوں اور ان تمام کاموں
کے لئے جن میں مردانگی و جفاکشی مطلوب ہے نکمّے اور بودے نہ سمجھے جائیں۔ اور ابتدائی عمر سے
ڈرل و سواری کی مشق یہ بہان جائیں اُن کو چست و چالاک جفاکش و مردانہ وش ثابت کرے مسٹر
ماریسن کے شوق سے علی گڑھ کالج میں رائڈنگ اسکول جاری ہوا تھا۔ میں دیکھتا ہوں کہ اُس میں زیادہ
ترقی نہیں ہوئی ہے۔ اس لئے طالب علموں کے ذی مقدور مربیوں کو اُس کی ترقی دینے کی طرف
خاص طور پر متوجہ ہونا چاہیئے۔ اور اگر بہ زیر نگرانی ہمارے لایق و فایق پرنسپل مسٹر آرچ بولڈ صاحب یا
کسی اور صاحب شوق یوروپین پروفیسر کے بشرائط خاص سکرٹری کی تعلیم بھی ہو سکے تو بہتر ہے اور اگر
ہر ذی مقدرت لڑکے پر رائڈنگ اسکول کی فیس اور اس میں شامل ہونا لازمی کر دیا جائے تو مناسب
ہوگا۔ قرون اولی کے مسلمان اپنے گھوڑوں پر چڑھنے کے لئے رکاب کے بھی حاجتمند نہ تھے اور اکثر
پھلانگ کر چڑھتے تھے۔ اور خلفائے بنی امیہ و بنی عباس کے شاہزادے اور اُس وقت کے امرائے
عرب کے لڑکے سامان عیش و عشرت سے اور اپنے امیرانہ گھروں سے دور بدویوں کی صحبت میں رہنے
کے لئے بھیجے جاتے تھے تاکہ اُن میں صفاتِ مردانگی و جفاکشی اور حمیت قومی پیدا ہو اگر ہمارے
نوجوانوں کے دل و دماغ زیور علم کے ساتھ مزیّن ہوں اور اُن کے اجسام ظاہری بھی توانا اور ہلکے

معارک و مہالک میں جانے کے لئے تیار رہوں تو اس حالت میں جس قدر قومی عزت متصور رہے وہ ظاہر ہے۔

حضرات! ہمارے ملک کے تعلیم یافتہ نوجوانوں میں حب الوطنی اور حب قومی کے غلط معنی سمجھنے کی بدولت ایک عجیب و بابیلی ہے کہ ہر چھوٹی سی چھوٹی ذات، قوم یا مذہبی فرقے کے جُدا اغراض و مقاصد قرار دینے، اور اُس کی حمایت میں دوسروں کے ساتھ لڑنے جھگڑنے، اور گالی گفتار ہونے اور بغض و تعصب پھیلانے کو اور گورنمنٹ کو بوجہ ایک غیر قوم کے ہاتھ میں ہونے کے۔ کمال ناشکری کے ساتھ مطعون کرتے رہنے اور ناقابل اعتماد ٹھہرانے، اور خواہی نخواہی اس کی طرف سے بد دلی پھیلانے کو اور اُس سے قبل از وقت! اور ناقابل العمل بلا سوچے سمجھے کئے جانے کو ایک قومی اور ملکی فرض خیال کر لیا ہے۔ چونکہ یہ تعلیمی کانفرنس ہے اور یہ قابل افسوس حالت مغربی تعلیم کے نتیجوں سے منسوب کی جاتی ہے۔ اس لئے آپ صاحبان کی خدمت میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔ تاکہ مسلمان اِن خیالات کے زہر سے جس طرح کہ اس وقت تک سرسید اور اُن کے ہم خیال بزرگان قوم کے اثر سے محفوظ رہے ہیں۔ آیندہ بھی محفوظ رہیں۔ اور ہمارے کالج اور یونیورسٹی میں یہ مرض اگر خدانخواستہ نمودار ہوتا دکھائی دے تو اُس کا فوراً انسداد و قلع قمع کرنے کی کوشش ہمیشہ جاری رہے۔ اور اس طرح قوم کے روشن خیال اور ذی اثر اشخاص ہر جگہ اپنے اہل قوم کو تفرقہ پردازی اور غیر از وفاداری و خیر خواہی سلطنت کے خیالات سے مبرّا رہنے کی اپنی ہدایت و رہنمائی سے مائل رکھیں اور آپس کی غلط فہمیوں کے مٹانے میں کوئی دقیقہ نہ چھوڑیں۔ علاوہ بریں جو بات تمام اہل اسلام خصوصاً تعلیم یافتہ مسلمانوں کو مدنظر رکھنی چاہیئے اور وہ یہ ہے کہ اختلافات عقائد اور اختلاف وطن و ملک سے اُن کے خیالات پر کوئی اثر نہیں پڑنا چاہیئے۔ اس تفرقے اور تشتت نے جس قدر ضرر و نقصان کافہ اہل اسلام کو پہونچائے ہیں وہ روشن و ہویدا ہیں۔ تھوڑا ہی عرصہ گزرا کہ سرحد پنجاب پر ایک مُلّاجی نے بیچارے سُنّی و شیعوں کو بھڑکا کر لڑوا دیا۔ اور سیکڑوں ہزاروں خون کرا دیئے۔ اور حکام گورنمنٹ کو کچھ عرصہ تک ایک ناحق کی فکر میں ڈالدیا۔ حالانکہ وہ سب لوگ بھائی بھائی تھے اور مدّت ہائے دراز سے امن و آشتی کے ساتھ رہتے تھے۔ ایسا ہی ہندوستان کے بعض شہروں کا حال ہے۔ اگرچہ گاہ گاہ ہوتا ہے مگر اس کا خراب اثر دیر تک قایم رہتا ہے۔ ایسا ہی کبھی کبھی ہندو مسلمان لڑ مرتے ہیں تمام تعلیم یافتہ مسلمانوں کو جہاں اور اُمور بطور اُصول اپنی تعلیم کے پیش نظر رکھنے واجب ہیں اس صلح کل کے ضروری

اُصول کو ہمیشہ پیش نہاد خاطر رکھنا چاہیئے کہ آپس میں اور اپنے ہمسایہ ہندو بھائیوں سے کوئی عناد و فساد کی بات ہرگز نہ کریں بلکہ عناد و فساد سے سخت نفرت کریں۔ اور جس جس پر اُن کا اثر پہنچ سکتا ہو اپنے مسلکِ صُلح کُل کا اثر پہنچائیں۔ علی گڑھ میں جس کے زیر سایہ یہ کانفرنس جمع ہے خدا کے فضل سے ابتدا سے مسلکِ صُلح کل کی عملی تعلیم ضروریات سے سمجھی جاتی ہے۔ ہر فرقہ کے مسلمان اپنے عقائد مختلفہ کی دینی تعلیم پاتے ہیں اور ایک ہی مسجد میں اپنی نمازیں بھی ادا کرتے ہیں۔ اور دور دراز مختلف الحال مقامات (مدراس، بمبئی، برہما، ایران، بلوچستان وغیرہ) کے طالب علم جمع ہیں۔ اور تمام کاموں میں شریک رہتے ہیں۔ اور اس طرح اپنے عمل سے ثابت کرتے ہیں کہ ہم ایک ہی خدا اور ایک ہی پیغمبر اور ایک ہی قرآن کے متبع ہیں۔ اور ایک ہی کلمہ کے قائل ہیں۔ پس اختلاف چہ معنی وارد اسی طرح ہندو طالب علم بھی یہاں پڑھتے اور بورڈنگ ہاؤس میں رہتے ہیں اور وہ بھی صلح کل کا اصول سیکھتے ہیں۔ کہ ہندوستان کے رہنے والے سب بھائی اور عام نفع میں شامل ہیں۔

میں اپنے آبا و اجداد سے شیعہ ہوں۔ میرے مرحوم بھائی اور میں ابتدا سے علی گڑھ کالج کی قائم کرنے کی تحریک میں شامل رہے ہیں۔ ہماری آرزو ہمیشہ یہی رہی ہے کہ تمام مسلمان باوجود اختلاف عقائد اس صُلح کُل کے اصولِ کلّی کو اپنی ترقی تعلیم کا آئیڈل بنائے رکھیں۔ اور ہم کو سخت افسوس ہوتا ہے کہ جب کسی جگہ سے اختلاف اور فساد باہمی کی آواز سنائی دیتی ہے کل حاضرین کانفرنس سے کہ جس میں بلاشبہ ہر ایک عقیدے کے حضرات موجود ہیں۔ اُسی خدائے واحد اور اُسی پیغمبر اور اُسی قرآن اور کلمے کا جس کے سب یکساں قائل ہیں واسطہ دے کر یہ عرض کرتا ہوں کہ جن جن پر اُن کا اثر پہنچ سکتا ہے اُن پر اپنا اثر پہنچائیں۔ اور مسلمانوں کی پُر درد حالت اور مشکلات پر غور سے نظر فرما کر ان جاہلانہ اور مضر اختلافات کو پست اور مضمحل کرنے میں سعی فرمائیں۔ ہمارے سابقین! دین و ملت کے نام سے بہتیری لڑائیاں لڑ چکے اور بہتیرے خون بہا چکے اور بہتیرے نقصان اٹھا چکے۔ مگر غور کرنا چاہیئے کہ اب وہ زمانہ نہیں ہے۔ خداوند عالم نے اپنی رحمت سے ہم کو ایک منتظم۔ دانا۔ عادل۔ اور رحمدل گورنمنٹ کے سایہ میں سپرد کیا ہوا ہے۔ اس امن و آزادی کو غنیمت سمجھنا چاہیئے۔ اور اقوام یورپ کی حالت پر غور کرنا چاہیئے۔ کہ جس زمانہ میں وہ لوگ بھی ہماری طرح گرفتار جہل و حماقت تھے تو اُس وقت مذہبی اختلافات کی وجہ سے کہیں زندہ جلاتے تھے اور کبھی کسی اور طرح سے ایذا دیتے اور قتل کرتے تھے۔ اور طرح طرح کی تکلیف پہنچاتے تھے۔ مگر اب علم کی روشنی کا یہ نتیجہ ہے کہ وہی قوم جو باوجودیکہ اب بھی ویسی ہی مختلف عقیدوں کے متبع ہیں۔ مگر نہ کہیں بربنائے اختلاف عقائد و خیالات مذہب فتنہ و فساد ہے

نہ کہیں خوں ریزی وجنگ وجدال وعناد ہے بلکہ سب یکساں وضع اور ایک ہی قسم کے خیالات میں مصروف یہ ترقیات گوناگوں علمی وعقلی نظر آتے ہیں۔ یہاں تک کہ ہمارے شہنشاہ معظم کی رعایا کا ایک گروہ کثیر جو رومن کیتھلک کا پیرو ہے اُن کو حامی المذہب کہکر نہیں مانتا۔ مگر باوجود اس کے ویسرائے۔ اور لفٹننٹ گورنرا اور بڑے بڑے مناصب فوجی کے عہدوں پر ویسے ہی حُبّ ملکی اور وفاداری سلطنت کے ساتھ ایام صُلح وجنگ میں مامور ومنسوب ہیں۔

حضرات! تعلیم یافتہ مسلمانوں کو جوخواہ علی گڑھ کالج سے نکلیں خواہ کسی اور جگہ سے اپنے اعمال و افعال اور تحریر وتقریر میں اس خیال کو بھی ملحوظ رکھنا۔ بلکہ اپنی کردار سے اس امر کو ہمیشہ ثابت کرتے رہنا ضروری ہی کہ جس گورنمنٹ کے زیر سایہ اُنھوں نے امن وآزادی کے ساتھ برکات تعلیم حاصل کی ہیں اور جس کے استحکام اور پائداری وعظمت شان کے ساتھ اِن کے گوناگوں فوائد وابستہ ہیں یہ لوگ اُس گورنمنٹ کی مہربانیوں کی کیسی خیرخواہانہ قدرشناسی صدق دل سے کرتے ہیں۔ علی گڑھ کالج کا خیال جب سے وجود میں آیا ہے ہندوستان کے فرماں روایانِ اعلیٰ یعنی وایسرایوں اور لفٹنٹ گورنروں اور دیگر حکام عالیمرتبت نے جس قدر مہربانی۔ سرپرستی۔ اور اخلاقی ومالی امداد اپنی اہل اسلام رعایا کی ترقی کے خیال سے فرمائی ہے۔ اُس کی تفصیل کی حاجت نہیں ہے اُن کی اکثر مہربانیوں کے علی گڑھ کالج کے درودیوار شاہد ہیں۔ اگر کسی انتظامی غلطی کی وجہ سے کسی حاکم سے کوئی ایسا امر بھی سرزد ہوجائے جو ہمارے فوائد اور خیالات کے مخالف ہو جیسا کہ سرانٹونی میکڈانل لفٹنٹ گورنر سابق نے ایک وقت زبان اُردو کے بارہ میں حکم نافذ فرمایا تھا کہ جو ہمارے خیالات اور فوائد کے سراسر برخلاف تھا ایسی غلطیوں کی اصلاح کے لئے اگرچہ مؤدبانہ گزارش کرنا واجب اور مناسب ہے جیسا کہ اُس وقت کیا گیا تھا۔ مگر ہم کو باوجود اس کے بھی اپنے مذکورہ بالا اصول ادب واطاعت و خیرخواہی کو کبھی فراموش نہیں کرنا چاہئے۔ کیونکہ ایسی غلطیاں بربنائے کسی نیتِ مخالفانہ کے نہیں ہوتیں۔ چنانچہ ظاہر ہے کہ خود سرانٹونی میکڈانل بھی باوجود اس غلطی کے علی گڑھ کالج کے کیسے کچھ مؤید رہے تھے۔

حضرات! آپ صاحبوں میں سے کوئی شخص ان مہربانیوں سے ناواقف نہو گا جن کی طرف میں نے اوپر اشارہ کیا ہے۔ اب اس سے زیادہ ہمارے فرماں رواؤں کے الطاف ومہربانی کا اور کیا ثبوت ہوسکتا ہے کہ گورنمنٹ کی اس کم استطاعت رعایا۔ جو برسوں کی بے شمار کوششوں سے پیسہ پیسہ جمع کرکے مسلمانوں کی حال وآئندہ نسلوں کے لئے یہ تعلیم گاہ علی گڑھ میں قایم کی ہے۔ ہمارے شہنشا

ذی جاہ کے تخت جگر ولی عہد سلطنت ہز رائل ہائی نس پرنس اوف ویلز اپنی تشریف آوری سے آیندہ مارچ میں نہ صرف علی گڑھ کالج کو بلکہ ہندوستان کی کل خیر خواہ رعایا اہل اسلام کو اعزاز بخشیں گے اور اُمید ہے کہ جملہ اہل اسلام نہ صرف ہندوستان کے اندر بلکہ ہندوستان سے باہر بھی اس عزت افزائی کو خاص طور پر اس نظر سے دیکھیں گے کہ ہمارے شہنشاہ معظم اور اُن کی گورنمنٹ اپنی ہندوستانی رعایائے اہل اسلام پر کیسی نظر شفقت رکھتے ہیں۔

اب میری آرزو ہے کہ ہم جمیع حاضرین کانفرنس نہایت صدق دل سے اپنے شہنشاہ عالی جاہ اور ولی عہد سلطنت کے دوام دولت و درازی عمر و صحت عافیت کے لئے دست بدعا ہوں اور شکر گزاری کے ساتھ اور دلی بشاشت کے ساتھ ان کے لئے ہُرّا اور چیرز کی آواز بلند ہو۔ تھری چیرز فار دی کنگ امپرر ہپ ہپ ہُرّا۔ ہپ ہپ ہُرّا۔ ہپ ہپ ہُرّا۔ تھری چیرز فار دی پرنس آف ویلز ہپ ہپ ہُرّا۔ ہپ ہپ ہُرّا۔ ہپ ہپ ہُرّا۔

اجلاس بستم

(منعقدہ ڈھاکہ سنہ ۱۹۰۶ء)

جسٹس سید شرف الدین پریسیڈنٹ اجلاس

حالات صدر

سید شرف الدین مرحوم (نیورہ) بانکی پور کے باشندے تھے۔ نیورہ بانکی پور پٹنہ سے چند میل کے فاصلہ پر ایک گاؤں کی صورت میں سادات نیورہ کی آبادی کا نام ہے۔ اس دور جدید میں تعلیم جدیدہ کی بدولت باشندگان نیورہ نے حکومت کے جو بلند درجے اور منصب حاصل کئے دولت



آنربل جسٹس سید شرف الدین
صدر اجلاس بستم (ڈھاکہ سنہ ۱۹۰۶ ع)

اور امارت کی جس رفعت پر وہ پہنچے ان کی شہرت نے نیورہ کی زمین کو بھی آشنا بلند اور روشن کردیا ہے جس کے لحاظ سے شمالی ہندوستان کے بعض قصبے بلگرام، کاکوری، حیدرآباد، مارہرہ وغیرہ کے نام اُن کے باشندوں کے کمال علمی اور ثروت واقبال مندی کے آثار سے اب تک زبان زد خلائق چلے جاتے ہیں۔

نیورہ کی خاک کو صدیوں یہ فخر حاصل رہے گا کہ شمس العلما نواب سید امداد امام موئیدالملک نواب سر علی امام جسٹس سید حسن امام جسٹس سید شرف الدین اس سرزمین سے اُٹھ کر آفتاب کمال بن کر چمکے۔

ساداتِ نیورہ کے خاندان نے انقلاب حکومت کے ساتھ علوم جدیدہ کے حاصل کرنے میں خاص شغف اور انجام بینی کا اظہار کرکے زمانے کے سانچے میں اپنے حالات اور خیالات کو ڈھالنے کی کوشش کی اس انقلاب ذہنی میں سید شرف الدین کے مساعی بہت پیش پیش ہیں۔

سید صاحب ۱۸۷۹ء میں بیرسٹری کی سند حاصل کرکے انگلستان سے واپس آئے جس زمانہ میں وہ انگلستان سے واپس ہوئے ہیں تو وہ گنتی کے اُن چند مسلمانوں میں سے تھے جنھوں نے تعلیم کی غرض سے انگلستان کا سفر کیا تھا اُنھوں نے ہندوستان واپس آکر بہت جلد پیشہ وکالت میں ترقی کی اور تھوڑے ہی دن کے بعد وہ اپنے اثر قانونی لیاقت اور خاندانی وجاہت کے اعتبار سے بہار کے مسلمانوں کے لیڈر بن گئے اُنھوں نے ملکی پالیٹکس میں بھی اُس وقت حصہ لینا شروع کیا جب مسلمان بہ حیثیتِ قوم اس سے کنارہ کش تھے چنانچہ نیشنل کانگریس کے وہ شروع سے حامی اور راس مجلس کے شریک کار بن کر اس کے ممبر بن گئے تھے اُس زمانہ میں جو نوجوان ولایت سے واپس آتے تھے اُن میں مذہب سے بیگانگی خصوصیت کے ساتھ نمایاں ہوتی تھی۔ یہ پہلے مسلمان بیرسٹر تھے کہ حاجی وارث علی شاہ کے مرید ہوئے حاجی صاحب سے ان کا حسن عقیدت آخر عمر تک انتہائی درجہ پر رہا حاجی صاحب کے انتقال کے بعد انہیں کی تحریک سے حاجی صاحب کی خانقاہ کا انتظام رجسٹری شدہ جماعت کو سپرد ہوا جس کے قانون اساسی کا مسودہ خود اُنھوں نے مرتب کیا تھا ہر سال محفل میلاد نبوی صلعم کا اہتمام بھی وہ خاص طور پر کیا کرتے تھے۔

جب ممالک متحدہ میں سر انٹانی میکڈانل (بعد ازاں لارڈ میکڈانل) کے زمانہ میں مسلمانوں کے خلاف گورنمنٹ کی پالیسی روز افزوں ترقی پر تھی تو اس عالم پریشانی میں ممالک متحدہ کے مسلمانوں کو اپنی پولٹیکل جماعت بنانے کا خیال پیدا ہوا اور نواب وقارالملک نے اس خیال کو عملی جامہ پہنانے کی

کوشش کی ۱۹۰۲ء میں مرحوم حامد علی خاں صاحب بیرسٹرایٹ لا لکھنؤ کے مکان پر ابتدائی جلسہ شوری منعقد ہوا یہ اس جلسہ کی شرکت کی غرض سے بانکی پور سے لکھنؤ آئے تھے اور جلسہ ابتدائی کے پریسیڈنٹ بھی یہی تجویز ہوئے تھے۔

۱۹۰۶ء میں حکومت ہند نے ان کو ہائی کورٹ کلکتہ کی ججی پر سرفراز کیا۔ اپنے فرائض متعلقہ کو اُنھوں نے مسلسل کئی سال تک قابلیت کے ساتھ انجام دے کر سبکدوشی حاصل کی۔

۱۹۰۶ء میں وہ ہندوستان کی اس سب سے بڑی انجمن آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے بمقام ڈھاکہ پریسیڈنٹ منتخب ہوئے اس زمانہ میں نواب محسن الملک کانفرنس کے سیکرٹری تھے۔ نواب بہادر سر سلیم اللہ رئیس ڈھاکہ نے کانفرنس کو ڈھاکہ میں ذاتی طور پر دعوت دی تھی۔ کانفرنس کی تاریخ میں نواب بہادر کی طرف سے ایسی عالی شان دعوت اور اس کا اہتمام اور ڈھاکہ میں ہر حصۂ ملک کے مشاہیر مسلمانوں کا اجتماع واقعۂ تاریخی شمار ہوگا۔

یہ اجلاس سید صاحب کی صدارت میں نہایت کامیابی کے ساتھ شروع ہو کر ختم ہوا۔

المختصر ممدوح اپنے ذاتی اور صفاتی وجاہت کے لحاظ سے نہ صرف اپنے صوبہ بہار میں بلکہ دوسرے صوبہ کے مسلمانوں میں بھی وقعت اور امتیاز کی نظروں سے دیکھے جاتے تھے۔

نوٹ ماخوذ از صحیفہ زریں مطبوعہ نول کشور پریس بروایت خان بہادر مولوی بشیر الدین صاحب ایڈیٹر البشیر اٹاوہ

خطبہ صدارت

حضرات حاضرین مجلس و دیگر برادران و دوستان - ایک ایسا جلسہ جو ہمارے برادران اسلام کے منتخب اشخاص کا مجمع ہو جہاں قابل ترین اور لایق ترین اصحاب بہی خواہان قوم ایک ضلع یا ایک صوبہ سے نہیں بلکہ سارے ہندوستان سے ذاتی اغراض کے لئے نہیں بلکہ قومی اغراض کے لئے جمع ہوئے ہیں میں ناچیز اس لائق نہیں کہ ایسے جلسہ کا صدر انجمن بنایا جاؤں۔ مگر یہ آپ صاحبوں کی فیاضانہ نگاہ تھی جو مجھ پر پڑی ہے۔ میں اس عزت افزائی کا جو قومی اور اس لئے حقیقی ہے آپ صاحبوں کا ممنون ہوں۔ منجملہ ان کے جناب نواب صاحب محسن الملک بہادر کا خدا اُن کی عمر دراز کرے اور اُن کی

کوششوں میں برکت دے اور اُن کی قومی ہمدردی کی ٹرین کو اور تیز کرے کہ وہ اُن کی آنکھوں کے سامنے منزل مقصود کے اسٹیشن پر جا پہنچے۔ اُنھوں نے مجھے تار دیا۔ اور اس وقت جبکہ میں معزز قومی خدمت کے لئے تاتیار اور عدیم الفرصتی کے باعث بات کرنی بھی مشکل تھی۔ مگر تعمیلاً للحکم باہمہ حال جیسے بن پڑا یہاں پہنچا اور آپ حضرات کی خدمت میں حاضر ہوں۔

حضرات! میں کوئی نئی بات نہیں کہنا چاہتا۔ نئی بات اب رہی کیا۔ قوم کس حال میں ہے اُس کو کیا کرنا چاہیئے اور اُس کی کیا کیا تدابیر ہیں۔ یہ عملاً مدرسۃ العلوم علی گڑھ فی حد ذاتہ دکھلا رہا ہے اور یہ ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں کانفرنس بھی پکار آیا۔ اور قریہ قریہ میں اس کی منادی بھی پھیر گیا۔ زمانہ نے بھی ساتھ دیا۔ اور اقتضائے زمانہ بھی یہی ہوا کہ ہم غفلت سے چونکیں اور الحمد للہ چونکے بھی اگر معترضوں نے یہ کہا کہ ایجوکیشنل کانفرنس نے ایجوکیشن کے متعلق کچھ نہ کیا۔ ہاں سوشل اصلاح میں قدم بڑھایا ہے۔ تو میں اُن کے اعتراض کی بھی قدر کرتا ہوں بہ ایں نیک نیتی کہ اُنھوں نے اعتراض بُری نگاہ سے نہ کیا۔ بلکہ اُس کی سوشل اصلاح کے مقر ہوے۔ اگر کانفرنس نے سوشل اصلاح کی تو ایجوکیشن کا بہت بڑا نتیجہ حاصل کیا۔ غرض یہ قومی خدمتیں ہونے کی تھیں جو ہوئیں۔ اب اُن مادون میں دھرا کیا ہے جو میں کچھ کہوں اور چھپا کیا ہے جسے میں کھولنے کی ہمت باندھوں۔ اس لئے آپ معاف فرمائیں گے اگر میں یہ کہوں کہ اس وقت میں کچھ دُکھڑا رونے کے لئے کھڑا نہیں ہوا۔ کیونکہ قومی مرثیئے پڑھ پڑھ کر رونے کی اب کوئی حد نہیں رہی ہے۔ بلکہ میں مصلحان قوم کی نظر سے وہ پُرانی عینک جو آنکھوں سے اب اُتر گئی ہے اوتار دینے کی درخواست کیا چاہتا ہوں اب دوسرے نمبر کی عینک لگائیں وہ راست آئے گی۔

اس سے میری غرض یہ ہے کہ ہمارے بزرگوں نے اس دنیا میں جس کی شان ہی تلک الایام نداولہا بین الناس جس کا رنگ نہ کبھی یکساں رہا اور نہ رہے گا۔ کیا علم میں کیا عمل میں۔ کیا تربیت میں کیا اخلاق میں۔ کیا ہنر میں۔ کیا فنون میں۔ کیا دولت میں۔ کیا حکومت میں۔ کیا شان میں۔ کیا شوکت میں۔ کیا رزم میں۔ کیا بزم میں۔ کیسی کچھ ترقیاں کی تھیں۔ اور ابنائے زمانہ کے نمونے بنے ہوئے تھے جن کی یادگاریں صفحہ ہستی سے کھُدی کھُدائی بھی اب تک باقی ہیں۔ جن کے نشان صفحہ تاریخ سے مٹائے بھی اب تک نہ مٹ سکے۔ لیکن اس کے بعد میں رونا نہیں پسند کرتا ہمت کرنا پسند کرتا ہوں۔ بیجا تفاخر بھی پسند نہیں کرتا۔ اُن کے اوصاف اخذ کرنا پسند کرتا ہوں۔ یہ کہنا نہیں چاہتا کہ ایسے برگزیدہ اسلاف کے ہم ایسے ناخلف اولاد ہیں۔ اور اس نکبت کو پہنچ گئے کہ ہم سے کچھ نہیں

ہونے کا کہ یہ بے حیائی ہے اور اس سے پست ہمتی پیدا ہو گی بلکہ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ہاں ہمارے اسلاف ایسے تھے جو ایک دن پھر ہم بھی ویسے ہی ہو کر رہیں گے اور انہیں کی طرح پھر جب تک ہم ترقی کے معراج پر پہنچ نہ لیں گے دم نہیں لینے کے۔ اے خدا تو ایسا ہی کر۔

یاس کی جگہ ہوتی اگر غیرت اور ہمت ہم سے کھو جاتی مگر الحمد للہ کہ غیرت اور ہمت ہم میں باقی ہے۔ حرکت کی ضرورت تھی وہ تحریک پیدا ہو گئی۔ جہاں دیکھو ترقی کی پکار ہے یعنی جب خیال بدلا اور ہمت آئی تو چال بھی بدل گئی اور حال بھی بدلے گا۔

اے بھائیو! ایک زمانہ تھا کہ جب ہم سوتے تھے اُس کا اقتضا تھا کہ ہم اپنے کو دیکھیں اور اس پر روئیں۔ اپنا حال دیکھا اور اُس پر رو چکے۔ اب کام کا زمانہ ہے ؎

کار کن کار، گذر از گفتار

اس دنیا میں آنسو تولا نہیں جاتا۔ اُس کا گاہک کوئی نہیں۔ عمل تولا جاتا ہے عمل۔ کُلُّ امْرِءٍ بِمَا کَسَبَ رَهِينٌ ہر آدمی اپنے کئے کا مرہون ہے۔

یہ تقریر میری اس بنا پر ہے کہ ہم نے جب اپنی تنزلی کو مشاہدہ کیا تو اُس وقت ترقی کا آفتاب خطِ استوا پر تھا۔ کیا کرتا تھا۔ چونکنے کا وقت ہی وہ تھا۔ اُس وقت ضرور اپنی تنزلی کو مقابلہ اوروں کی ترقی کے دیکھا تو یہ دیکھا کہ بمقابلہ اور اقوام کے ہم تنزلی کی حالت میں ہیں۔ یہ دیکھ کر جن کا دل بھر آیا اُنھوں نے فریادیں مچائیں۔ اس فریاد نے سارے قافلہ کو چونکا دیا۔ چونکے تو دنیا کا رنگ ڈھنگ دیکھ دیکھ کر آنکھیں خیرہ ہو گئیں۔ پھر اضطرارانہ حرکت ہم سے کیا سرزد ہوئی کہ مضر مفید کو دیکھا نہیں ریس کے پیچھے پڑ گئے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہم اپنے سے پھر غافل ہو گئے۔ ہماری نظروں میں۔ ہمارے خیال اور اوہام میں۔ ہمارے حرکات اور افعال میں اوروں کی ریس ہی سما گئی۔ اس سے ہم چند غلطیوں میں پڑ گئے۔ ایک تو یہ کہ فریادیں ہماری کچھ نہیں۔ ترقی کے معنی سمجھا تھا کچھ اور۔ اور اس اوچھی نگاہ سے رفتار ہو گئی کچھ اور۔ دوسرے اس دیکھنے میں ہم نے اپنی صفات سے بھی چشم پوشی کی بلکہ کھو بیٹھے۔ تیسرے یہ ہم دوسروں کے عیوب کے بھی گاہک بن گئے چوتھے مدمقابل کے بغض وحسد کا تخم بھی دلوں میں بو یا گیا۔ جس سے ہم جھگڑوں میں پڑے یہی تو وہ وجہ ہے کہ باوجودیکہ ہمارا مذہب بھی طرح معاون ترقی ہے۔ لیکن جب سے ہم چونکے اُس وقت سے اس وقت تک اپنی ترقی ہم نہ کر سکے۔ جتنی ترقی کی امید ہم سے کی جا سکتی تھی۔ مذہب کی تعلیم بھی يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا عَلَيْكُمْ أَنفُسَكُمْ۔ اے۔ ایمان والو! اپنے اوپر اپنے نفس کی اصلاح

لازم کراؤ۔ سلف ہلپ اور سلف رسپکٹ وغیرہ وغیرہ اسی کے شاخ و برگ ہیں۔ مذہب میں
بھی جو تفرقے پڑے اور اختلافات پیدا ہوئے یہ تو فطرت کا اقتضا تھا۔ مگر جو جھگڑے و فساد آئے
وہ اسی ہدایت کی خلاف ورزی سے۔ اگر ہر فرقہ اپنے حال میں آپ چوکس ہونے کے تجسس میں
تو جھگڑے نہ پڑتے اور بایں ہمہ اختلاف ترقی کی راہ مسدود نہ ہوتی۔ بلکہ ترقی کے مختلف لائنیں
کھل جاتیں۔ اور ہر فرقہ اپنی کمی کے پورا کرنے میں لگ جاتا۔ اب اس ہدایت کی خلاف ورزی
ساری ترقیوں کی راہ میں بغض و حسد خیمہ زن ہو کر سدّ راہ ہو گئے۔

انسان کی اصلی ترقی تو انسانیت کی ترقی ہے۔ یعنی اس کی کل قوتوں کا اپنے کمال
عروج پر پہنچنا۔ اور اُس کے کل شاخ و برگ کا اپنے پورے بڑھاؤ پر برومند ہونا۔ یہی جڑ ہے دینی
اور دنیاوی دونوں ترقیوں کی۔ بعض قوتیں دینی ترقیوں میں سرفراز ہونگی۔ اور بعض علوم و
دولت و حشمت ہر طرح کے خزانے کھولیں گی۔ یہی انسانی ترقی ہے۔

جہالت نے جب ہماری قوم پر وہ چھاپا مارا کہ کالانعام بنا دیا تو ضرورت ہوئی کہ علم کی بارگاہ
میں پناہ ڈھونڈی جائے۔ اس بنا پر علی گڑھ کالج کی بُنیاد پڑی۔ تجربہ نے ضرورت تربیت کی سجھا
اسی نے بورڈنگ کی بنا ڈالی۔ کیونکہ اگر پڑھا لکھا اور اخلاق درست نہوئے تو کس کام کے ہوئے
اس تجربہ نے یہ بھی بتایا کہ علم کام کا نہیں جب تک عمل نہو۔ اور صرف علم خیالی سے شفا نہیں ہوتی
جب تک علم عملی نہ ہو۔ اسی نے متوجہ کیا ہنر و فنون کی طرف۔ یہ بنائی ہوئی یونیورسٹی کے خیال
کی۔ خدا وہ دن لائے کہ یہ آرزو پوری ہو کر رہے۔

جس طرح دین کو لو۔ تو علم بے عمل اور عمل بے اخلاص کام کا نہیں۔ اسی طرح اور علوم و فنون
بھی بغیر پریکٹس۔ اور پریکٹس بے انسانی اوصاف کے برومند نہیں ہوتے۔ اگر علم سیکھا اور عمل نہ کیا
اگر ہنر سیکھا اور کام میں نہ لائے تو ایسا ہوا نہ ہوا دونوں برابر۔

مجھے علم کے فیوض اور برکات بیان کرنے نہیں ہیں۔ اب اسے بچہ بچہ سمجھتا ہے اور اس کی ضرورت
کو قوم کا ہر فرد محسوس کرتا ہے۔ نہ علی گڑھ کالج اور اُس کے بورڈنگ کی تعریف بیان کرنا ہے۔
ظاہر ہے کہ یہی ایک کالج ہم مسلمانوں کا ہے اور یہی ایک بورڈنگ ہم مسلمانوں کی ہے تو اس کے
فیوض و برکات اور اس کے تجمل و شان سے صرف ہماری ہی قوم واقف نہیں ہے۔ بلکہ غیر اقوام کی
نظریں بھی اس کی سعادت کی طرف اُٹھی ہوئی ہیں۔ ہاں علی گڑھ کالج اور اس کے بورڈنگ سے
مقاصد کماحقہٗ پورے نہیں ہو سکتے اور قوم کماحقہٗ صحت یاب نہیں ہو سکتی۔ جب تک یونیورسٹی

قائم نہ ہو جائے۔ جس کا سرگرم جوش حامیانِ علی گڑھ میں مدت سے پھیلا ہوا ہے۔ یہ اُن کا بڑا مہتم بالشان کام ہے۔ کہ یہ ہی ایک کام کرنے کا ہے۔

اے بھائیو! میں پھر کہوں گا کہ عَلَیْکُمْ اَنْفُسَکُمْ۔ غیر اقوام سے تعرض چھوڑ دو۔ اپنی ضرورت کو دیکھو۔ اور اپنی کمی کو پوری کرو۔ اب یہ عینک اُتار دو کہ ہم سے کچھ نہیں ہو سکتا۔ اس سے پست ہمت ہو جاؤ گے۔ یہ عینک لگا لو کہ ہم زندہ قوم ہیں۔ ہم سے سب کچھ ہو سکتا ہے۔ اس سے ہمت آ رہے گی۔ ہمت آئی تو کام بھی ہوا۔ قیمۃ المرء ہمتہ۔ آدمی کی قیمت تو اس کی ہمت ہی ہے۔ ہمت ہو تو یہی ہماری قوم ایسی ہے کہ ایک ایک آدمی کھڑا ہو سکتا ہے کہ تیدلاکھ کی بڑی طاقت میں یونیورسٹی کے بایحتاج پورا کر سکتا ہوں۔ ایک سہرا موحد کے سر باندھا تھا ایک مہتم کے بندھے۔ ایسی ایثار نفس کی بہت سی مثالیں ہماری قوم میں موجود ہیں۔ ہمت کچھ ہو چکا صرف آنکھ کا کانٹا نکالنا ہے۔ منزل دور نہیں۔ گورنمنٹ بھی ہماری وفاداری کی قدردان ہے۔ صرف یونیورسٹی کی اجازت ہی نہ دے گی۔ بلکہ ہم کو اُمید کرنی چاہئے کہ ہر طرح کی حمایت بھی کرے گی۔

اے قوم۔ اگر تو نے اس قومی کالج کو یونیورسٹی نہ بنایا تو کچھ نہ کیا۔ ہمت کر ہمت سے کھڑی ہو۔ خواہشات نفسانی کو تھوک۔ اسلامی خون کو حرکت میں لا۔

چند لاکھ کی بنیاد ہی کیا ہے ہمت ہے تو کچھ نہیں۔

یہ نہ کہو کہ ہماری قوم نکبت نشاں ہے اس سے کچھ نہیں ہوگا۔ کسی بات کا اعادہ دس دفعہ کرو تو اُس کی تاثیر ہوتی ہے کم سے کم اُس کا تیقن ہوتا ہے۔ یا ویسا ہی دکھائی دینے لگتا ہے۔ یہی تو وجہ ہے کہ ہم مسلمانوں کی ساری ہوا اُکھڑ گئی۔ اور اقبال اسی ہوا بندی کا نام ہے۔ یعنی اسی چال سے ہم اقبال کو کھو بیٹھے۔ جہالت، نکبت، افلاس، بے ایمانی، بے وفائی، جھوٹ۔ بدعہدی، نفاق، بغض وغیرہ وغیرہ ایک فہرست طولانی ہے اپنی قوم میں کہتے کہتے نظر آئی بھی دینے لگا۔ ہم بھی ایسا ہی دیکھنے لگے۔ اور اغیار بھی یہاں تک کہ یہ مذاق ہو گیا۔ اسی میں شاعری بھی ختم کی گئی اور اسی میں قوم کی دلچسپی ہو گئی۔ جیسے کوئی افیون کا عادی ہو جاتا ہے۔ رفتہ رفتہ ہماری ہوا اُکھڑ گئی۔ اور ہوا مخالف نے اپنی ہوا باندھی۔ اسی وجہ سے کتنے ترقی کے تارے نوجوان ہم میں موجود ہیں مگر انہیں گرد آلود ہواؤں سے اُن کی روشنی بجھی اور کہیں کہیں ٹمٹما رہی ہے۔ غیروں کا اعتماد تو درکنار۔ بے اعتماد ہو کر اپنوں نے بھی منہ پھیر لیا۔ یہ ہی وجہ ہے کہ اب تک کوئی بڑی کمیٹی مسلمانوں کی دکھائی نہیں پڑتی۔

اے قوم! میں یہ کہے بغیر بھی نہیں رہ سکتا کہ اُس کی ایک شان نہیں۔ كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ۔ فطرت ایک رنگ نہیں، نیرنگ ہے۔ فطرت مختلف الطبیعت مختلف المزاج۔ مختلف الدماغ ہے۔ ترقی کا خیال آئے گا تو مختلف دماغوں میں۔ مختلف راہیں آئیں گی اس اختلاف کو کوئی دور نہیں کر سکتا۔ کل کنسو ویٹو کو لبرل یا کل لبرل کو کوئی کنسو ویٹو نہیں بنا سکتا۔ وَلَوْ شَاءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ أُمَّةً وَّاحِدَةً۔ یہ خدا کی مرضی ہی نہیں کہ دنیا میں ایک ہی گروہ ہو جائے۔ اس لئے علم اور کسی طرح کا علم کوئی اگر جرمنی زبان میں سیکھنا چاہے تو اُس کو سیکھنے دو۔ اور اُس کی مدد کرو۔ اور اگر کوئی فرینچ زبان میں سیکھنا چاہے تو سیکھنے دو۔ اور اُس کی مدد کرو۔ اگر کوئی عربی زبان سیکھنا چاہے تو اُس کو سیکھنے دو۔ اور اُس کی مدد کرو۔ بھلا چاہو تو تمھارا بھلا چاہا جائے گا۔ بھلائی کرو تمھاری بھلائی کی جائے گی۔ یہ خیال اُٹھا دو کہ مختلف راہوں سے قوت منقسم ہوگی۔ یہ فطرت کا مقابلہ کرنا ہے۔ بلکہ مختلف راہوں کی ہمدردی کرو کہ تمھاری ہمدردی بھی مختلف راہوں سے کی جائے۔ علمی میگزین یا انسٹیٹیوٹ جہاں نکلیں۔ علوم وفنون۔ ہنر و دستکاری کے اسکول جہاں کہیں کھلیں۔ تجارت کی راہیں جس جس طرح قوم میں کشادہ کی جائیں۔ دینیات کے مدارس جہاں کہیں جاری ہوں۔ سب کی ہمدردی کرو اور اخلاص کے ساتھ۔ مگر اپنے کام میں لگے رہو۔ تو ساری جماعتیں بھی تمھاری ہمدرد ہوں گی۔ اور اس طرح فطرت باہمہ اختلاف و نیرنگی تمھاری اعانت کو کھڑی ہو جائے گی۔

برادرانِ من! ایک زمانہ تھا کہ گنبد گردوں سے ہماری بھی آواز گونجتی ہوئی آتی تھی کہ

ع ہم بھی اپنے گمان میں کچھ ہیں۔ ایک دن ہمارے بھی دن تھے کہ خشکی کو ناپا تھا اور تری کو بھی۔ لیکن ہر حرکت کہیں پر منتہی ہوتی ہے۔ اور ہر انتہا کا لازمہ ہے اطمینان، اور ہر اطمینان کا غفلت اور سکون۔ جیسے تو اے دن کو تھکے تو رات کو نیند آ گئی۔ جب ہماری رات آئی تو دوسروں کی صبح ہوئی۔ یہی زمین کی گردش ہے۔ اس اقتضا سے ہم سوئے تو غفلت کی نیند سوئے۔ اس اثنا سے کیا سے کیا ہو گیا۔ پھر گھبراہٹ میں گھر سے باہر نکلنا دوبھر ہو گیا۔ یہ آج پہلا دن ہے اور یہ ایک پہلی مثال ہو گی جو یہ کانفرنس قومی خدمت کے لئے اور محض قومی بہبود کے لئے تری میں جہاز ڈال کر یہاں پہنچا۔ اور یہی خواہانِ قوم دُور دُور سے زحمتیں اُٹھا اُٹھا کر گھر سے نکلے اور یہاں آئے ہیں کہ کچھ دینی بھائیوں کا حال دیکھیں۔ اور انھیں چونکائیں۔ کچھ اپنی سرگزشت کہیں۔ اور اخوت اور ہمدردی کا تخم جو اسلام نے بویا تھا اُسے سیراب کریں۔ کہ برگ و بار لائے۔ اے

راوہ ون لا۔

حضرات! جب بھی خواہان قوم نے دیکھا۔ بلکہ قوم کو مشکور ہونا چاہیئے۔ نواب محسن الملک کا
جب اُنھوں نے دیکھا کہ رابطہ حاکم و محکوم خوشگوار ہو گیا۔ ہم محکوموں کی وفاداری کا اعتبار
حاکم وقت کے دلوں میں جانشیں ہو گیا تو وقت آگیا کہ ہم فریاد کریں تو شنوائی ہو گی۔ ہم روئیں
تو آنسو پونچھا جائے گا۔ تو اُنھوں نے ڈیپوٹیشن کی ٹھہرائی۔ تعجب کی جگہ ہے بلکہ حیرت در حیرت کا
مقام ہے کہ چند ہی دنوں میں قوم کے سارے منتخب اور برگزیدہ حضرات کیونکر سمٹ آئے۔ اور
اس آپے دھاپے میں ایسے مہتم بالشان ڈیپوٹیشن کا کیونکر اہتمام ہو سکا۔ پھر جو ڈیپوٹیشن تیار ہوا
وہ دل کی ایک سچی آہ تھی مگر موزوں زبان سے تھی اس لئے خالق زبان نے اُس کی موزونیت
کی داد دی۔ ان چند دنوں میں ایسا ڈیپوٹیشن تیار ہوا جس سے ہندوستان ہی میں غلغلہ
بلند نہ کیا بلکہ یورپ کے اخباروں نے بھی نہ صرف ستایش کی بلکہ ہمدردی بھی کی یہ ایک ایسی مثال
ہے جس کی کوئی دوسری مثال نہیں اس لئے وہ ڈیپوٹیشن جیسا کچھ کامیاب ہوا اور ہو رہا ہے،
جیسی کچھ اُس کی شنوائی ہوئی اور ہو رہی ہے۔ وہ مستحق ہے کہ ہم زبان سے۔ دل سے اپنے
بادشاہ کا اپنے وایسرائے کا شکریہ ادا کریں، نہ صرف رسمی طور پر بلکہ عملی طور پر۔ بادشاہ تو وہی
جو اپنی رعایا کی سُنے۔ اور رعایا بھی وہی جو بادشاہ کی ہو کر رہے۔ اے حضرات! نواب محسن الملک
کا اس تعجب خیز طرح سے کامیاب ہونا یہ کانفرنس کے ہی فیوض و برکات ہیں۔ جو ہر سال کہیں نہ
کہیں مہمان ہوتا ہے تو وقت پر اپنے میزبانوں کو مہمان کر لینے میں کچھ وقت نہیں اُٹھا سکتا۔

حضرات! ایک اور بہت ضروری بات میں آپ لوگوں کی خدمت میں عرض کیا چاہتا ہوں،
لیکن قبل اس کے کہ میں اپنی زبان سے کچھ کہوں سرسیّد مرحوم کے اسپیچ کا کچھ حصہ جو ۲۰ ستمبر ۱۸۶۶ء
کو بنارس اسٹیوٹ میں بابو فتح نراین سنگھ بہادر کے مکان پر اہل ہند کی ترقی و تربیت پر دیا تھا آپ کو
سُناؤں کہ اس غمخوار قوم نے کیا کہا تھا۔

یونانیوں نے بہت بڑا حصّہ علوم و تربیت کا مصریوں سے پایا تھا اور اس بڑی دولت کو اپنی
زبان میں ترجمہ کرکے رواج دینے سے ملکی فخر و امتیاز حاصل کیا تھا۔

مسلمانوں نے جو یہ فخر و امتیاز حاصل کیا۔ اُنھوں نے بھی علم علوم کو یونانیوں کی زبان سے
اپنی زبان میں ترجمہ کرکے رواج دینے سے حاصل کیا۔ خلیفہ منصور نے یونانی زبان سے
عربی زبان میں علوم کے مترجموں کو بڑے بڑے انعام دیئے۔ خلیفہ مامون نے روم

شام، جرمنی، مصر سے یونانی کتابیں منگا کر اپنی زبان میں ترجمہ کیں۔
جو ایک عیسائی عالم طب کا مترجم تھا تاریخ سے ثابت ہے کہ سنسکرت
زبان کی کتابیں بھی اُسی نے اپنی زبان میں ترجمہ کرائیں۔

اسپین یعنی اندلس میں عبدالرحمٰن بن الحکم خلیفہ بنی امیہ نے یونانی زبان سے اپنی زبان میں کتاب کے ترجمہ پر کمر باندھی۔ بڑا نامی مترجم یونانی زبان سے عربی زبان میں ابوالوالدتہا جس کا نام عرب اور یورپ میں مشہور رہے۔ بطلیموس کی مجسطی کا عربی زبان میں ترجمہ ہونا کیسا بڑا ثبوت اس مدعا کا ہے۔

اہل فرنگ بھی جن کی نسبت تمام برائیاں اس زمانہ کی میں نے منسوب کیں۔ لیکن جب شائستگی اور ملکی فخر حاصل کرنے پر متوجہ ہوئے تو انھوں نے بھی یہی کیا جو اوروں نے کیا تھا۔ گیارھویں صدی میں گروہ کے گروہ فرنگستان کے طالبعلموں کے اسپین میں گئے اور عربی زبان سیکھ کر ارسطو اور یونانی حکیموں کی کتابیں جو عربی زبان میں ترجمہ ہو چکی تھیں اپنی زبان میں ترجمہ کیں۔ سب سے اول جس نے یہ کام کیا پادری کانسٹنٹن تھا اسی طرح ڈانٹل مورلی اور رابرٹ ایٹن اور ہنری ال کے عہد کے پادری ایڈی لارڈ اور اور لوگ عربی زبان سے اپنی زبان میں ترجمہ کرنے پر مستعد ہوئے اور اسی طرح برابر کرتے چلے جاتے ہیں۔

روس میں جب ترقی تربیت پر متوجہ ہوئے تو سب سے اول بادشاہ پیٹر دی گریٹ نے جس طرف توجہ کی وہ یہی بات تھی کہ اجنبی مصنفوں کی عمدہ تصنیفات کے ترجمے اپنی زبان میں کر کے چھپوائے اُس بادشاہ کو علم کی پیروی میں جو جو قباحتیں پیش آئیں نہایت استقلال سے اُن پر ظفریاب ہوا۔ اس بلند اور مستقل ارادے کے پورا کرنے میں کہ وہ صرف اپنی ہی نہیں بلکہ اپنے ملکیوں کی بھی اپنی زبان میں علم پھیلانے سے تعلیم کرے اُس کو قدم قدم پر دشواریاں پیش آئیں۔ مگر اُس کا مستقل ارادہ ان سب پر غالب آیا اور اسی بات سے پیٹر اعظم کے لقب پانے کا سزاوار ہوا۔ اس کی محنت کے وہ نتیجے جو اپنی زبان میں علم پھیلاتے تھے اب تک موجود ہیں اور ہمیشہ موجود رہیں گے۔

پیٹر اعظم کو اُن بہت سے بادشاہوں سے جن کے بڑے بڑے کاموں کا روئے زمین پر غلغلہ ہے مقابلہ کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ اُن سب سے اسی کا نام بلند ہے سکندر کے ہاتھوں سے جونہی عصائے شاہی گرا اُس کی ایسی عظیم الشان سلطنت ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی بونا پارٹ کا بھی یہی حال ہوا۔

ان سب نے بہت سی چیزوں کو ہلایا مگر کچھ قایم نہ کیا۔ شہر اسکندریہ۔ مقدونیہ کے بادشاہ کو اور مجموعہ قوانین فرانس کے فتحمند نپولین کو یاد دلاتا ہے۔ مگر جو درخت روسی فتحمند پیٹر اعظم نے بویا وہ اب تک قایم ہے۔ اور ہمیشہ روز بروز تازہ ہوتا رہے گا۔ وہ درخت یہی علم کا درخت تھا جس کو اُسی نے اپنی ملکی زبان کی آب یاری سے سرسبز و شاداب کیا تھا۔ بہت سے بادشاہوں نے اپنی سلطنت کا تصفیہ تلوار پر کیا۔ مگر پیٹر اعظم نے اپنی سلطنت کی بنا علوم و شایستگی پر قائم کی اُسی نے اپنی ملکی زبان کی ہجی کو درست کیا، حرفوں کی شکلوں کو سنوارا۔ دارالسلطنتِ روس میں چھاپے خانے مقرر کیے۔ انواع و اقسام علوم کی اجنبی قوموں کی زبان سے اپنی زبان میں ترجمہ کرکے چھاپا۔ رفتہ رفتہ یہ نوبت پہنچی کہ سنہ ۱۸۱۳ء تک ۱۳۲۵۰ کتاب اُس کی ملکی زبان میں تیار کی گئیں۔

یہ مضمون جس پر ہم گفتگو کر رہے ہیں ایک ایسا مضمون ہے کہ اس پر بہت کچھ کہا جا سکتا ہے اور ترقی تربیت اور ملکی فخر و امتیاز کو بہت سے اقسام علمی و عملی و عقلی پر منقسم کرکے ہر ایک شاخ پر بہت لمبی لمبی بحث کی جا سکتی ہے۔ مگر ان سب کی انتہا اور ان سب کا شروع اُس ایک بات یعنی ترقی علم پر ہوتا ہے۔ پس حقیقت میں یہی ایک بات ہے جس پر ترقی تربیت اہل ہند اور ملکی فخر و عزت حاصل ہونے کا مدار ہے۔

ان تمام حالات سے جو میں نے بیان کیے بخوبی ثابت ہوتا ہے کہ جو قوم تربیت شایستگی میں ترقی پائے ہوئے تھی اُس قوم کے تمام علوم اُس کی زبان میں تھے اور جس قوم نے تربیت و شایستگی میں ترقی پانے کا ارادہ کیا اُس قوم نے تمام علوم کو اپنی زبان میں کر لیا۔ پس صاف اور مستحکم تدبیر ہندوستان کی ترقی۔ تربیت و شایستگی کی جو ہزاروں برس کے اور بہت سے ملکوں کے تجربہ کے بعد ہاتھ آئی ہے یہی ہے کہ وہ بھی تمام علوم و فنون کو جو اجنبی قوم کے پاس ہیں اپنی زبان میں جمع کرے اور بہت لوگ سب سے اول اسی تدبیر کے درپے ہو کر محنت سے، روپیہ سے اور ہر قسم کی مدد سے اس امر اہم کے انجام پر پہنچانے کی کوشش کریں۔ کلب اور سوسائٹیاں اور انسٹی ٹیوٹ یورپ کے دیکھا دیکھی جس قدر ہندوستان میں قایم ہوتے جاتے ہیں اگرچہ مفید ہیں اور کچھ نہ کچھ فائدے سے خالی نہیں۔ مگر سب کی جڑ یہی ہے کہ سب سے پہلے علم کے خزانوں کو اپنے قابو کا کرو اور پھر اُس کا لطف اُٹھاؤ (اس کے بعد کے پیراگراف کا آخری جملہ یہ ہے) غرضکہ بغیر اس کے کہ علم اپنی زبان میں ہو علم تربیت اور علم شایستگی کسی ملک کو ہوتی ممکن نہیں۔

حضرات! سرسید مرحوم نے جو کچھ کہا تھا سچ کہا تھا۔ یہی ہے۔ اور حقیقت یہی ہے۔ کہ

جب تک ہم یورپ کے سارے علوم و فنون کو ترجمہ کرکے اپنی زبان میں نہ لائیں عام تربیت اور عام شائستگی نصیب نہیں ہو سکتی۔

غیر زبان میں کسی چیز کو سیکھنے سے دماغ میں جگہ مفہوم کے ساتھ زبان بھی لیتی ہے اور اپنی زبان میں صرف مفہوم۔ علاوہ اس کے وہ سیکھنا مردہ ہے کہ زندگی تک ہی اور زبان کا علوم و فنون سے زرخیز ہونا تو جب تک کہ قوم ہی وہ علم بھی ہے۔ اگر ایسا کیا جائے اور ہو بھی جائے تو کتنے دماغ اس وقت بیکار ہیں وہ کام میں لگ جائیں گے غرض کہ اگر اس کے منافع پر غور کیا جائے تو حد نہیں ہے۔ اس لئے میں نے بنظر اختصار سرسید ہی کے مضمون پر اکتفا کیا۔

اب یہ تو ثابت ہو چکا کہ ہماری ترقی منحصر ہے علوم و فنون کو اپنی زبان میں لانے پر تو یہاں یہ سوال ہو سکتا ہے کہ تو پھر سرسید نے ایسا کیوں نہ کیا اور ایسے مہتم بالشان کام کی طرف سے کانفرنس اب تک کیوں چشم پوش ہے۔ مگر یہ سوال صحیح نہیں ہے۔ سرسید نے غفلت نہیں کی بلکہ اول اول اس کی طرف توجہ کی تھی۔ مگر یہ وہ زمانہ تھا کہ انگریزی دانوں کی تعداد بہت ہی کم تھی یا قریب قریب گویا نہ تھی۔

لٹریری۔ سوسائٹی کی یادگار چند کتابیں جو ترجمہ ہوئی تھیں۔ سرسید کے اس مقصد کو یاد دلا رہی ہیں۔ بلکہ کہا جا سکتا ہے کہ اسی ضرورت نے علی گڈھ کالج کی طرف سرسید کے دماغ کو متوجہ کیا ہوگا۔ جب انگریزی دانوں کی ایک گونہ کافی تعداد ہماری قوم میں ہو گئی تو کانفرنس نے بھی چشم پوشی نہ کی اور دارالترجمہ کھول دیا۔ مجھے معلوم ہے کہ اس میں دشواریاں پیش آئیں اور وہ آتی ہیں۔ مگر مجھے اس کی پوری رپورٹ سے اطلاع نہیں ہے۔ تاہم اس اپنے کہنے سے میری غرض دارالترجمہ کی طرف توجہ دلانی ہے۔

اس مشکل کے حل کرنے کی نسبت اور اس دشواری کو آسان کرنے کے متعلق میری رائے یہ ہے کہ سارے علوم کی فہرست کی جائے۔ اور ہر علم کے چند ضروری اور اصل اصول کتابیں بطور لکھی جائیں۔ اور ایک ایک علم کی کتابیں ملکیوں کے مذاق کا اندازہ کرنے کے بعد ہر ہر شہر بھٹا دی جائیں اور ہر ہر شہر میں ایک ایک کمیٹی انگریزی دانوں کی بذریعہ خط ہو یا بذریعہ ڈیپوٹیشن یا خود کانفرنس بھی جہاں جہاں جائے قایم کرے۔ وہ کمیٹی جو اپنے شہر یا صوبہ سے واقف ہوگی اس میں کوشاں ہوگی۔ نوکریاں کہاں ملتی ہیں۔ بہتیرے بی اے۔ اس میں مصروف ہو جائیں گے۔ کیونکہ۔ انھیں ایک کافی مقدار انعام کی موعود ہوگی۔ اس سے مستفیض بھی ہوں گے۔ اس میں ایک دقت بیان کی جاتی ہے

کہ الفاظ کی کمی مانع ترجمہ ہے۔ مگر یہ کوئی دقت نہیں۔ کیونکہ اُردو زبان ایک زندہ زبان ہے۔ جس لفظ کا ترجمہ نہو اُسے اپنی زبان میں لے لو۔ ہر علم کے ساتھ ایک فرہنگ کی ضرورت پڑے گی تو اس سے ڈکشنری اور زبان وسیع ہوگی صرف اس وقت کے خیال علوم سے بے بہرہ رہنا کوئی بات نہیں اس کے بعد صرف ایک مشین پریس کھولنا رہ جائے گا۔

ایسا کرنے سے اگر کیا جائے مگر کوشش و سرگرمی کے ساتھ تو خدا سے اُمید ہے کہ چند ہی برس میں زبان زرخیز و علوم و فنون سے مالا مال ہو سکتی ہے اور قومی ترقی کی جڑ یہی ہے کہ قومی زبان ترقی کرے۔

اے حضرات! اس میں ایک نفع اور بھی ہے اُسے بھی میں کھولدینا چاہتا ہوں۔ کانفرنس سال میں ہوتا ہے اُس وقت شہروں میں جاگ ہوتی ہے۔ اور سال کے اندر تمام جوش خوابیدہ ہو جاتے ہیں۔ جہاں کمیٹیاں بھی ہیں تو چونکہ اُنھیں کچھ لگاتار کرنا نہیں ہوتا وہ عضو بیکار کی طرح ہیں۔ کوئی کمیٹی جب تک وہ کچھ کرتی نہ رہے بیکار ہو جاتی ہے۔ جس کا ہونا نہ ہونا دونوں برابر ہوتے ہیں۔ اگر ترجمہ ہی کے خیال سے سہی تمام شہروں میں کمیٹیاں قایم ہو جائیں تو ترجمہ کے متعلق اُن کو کچھ کرنا ہوگا اس کے متعلق رپوٹ بھیجنی ہوگی۔ کل نہیں تو کہیں کی کمیٹی تو کچھ کام کرے گی وہ کب نفع سے خالی ہوگا۔

اور کانفرنس کے لئے چاہیے وہ کسی کام کے لئے کمربستہ ہو ایک ایسی طاقت بہم پہنچے گی جس کی دوسری مثال اس ہندوستان میں تو نہ ملے گی۔ یَدُ اللّٰہِ فَوْقَ الْجَمَاعَۃِ پر اس کے فیوض و برکات بیان میں نہیں آسکتے۔

حضرات! دار الترجمہ کی نسبت میں نے جو اپنا خیال ظاہر کیا اُس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ہم ابھی موجودہ ترقی کی راہ روک دیں۔ کہ جب علوم و فنون ترجمہ ہولیں گے تو قوم ترقی یافتہ ہو ہی جائے گی کیونکہ یہ موجودہ تعلیم کی موجودہ حد تک پہنچنے کا ہی نتیجہ ہے جو میں نے یہ خیال اور یہ عنوان پیش کرنے کی جرأت اور اس کی کامیابی کا یقین کیا۔

حضرات! اگلے دن لد گئے۔ اور اگلا زمانہ پامال ہو چکا۔ جب ساری ترقی کی معراج سلطنت تھی اور ساری خوشگوار تعلیاں۔ بہادری اور فتوحات میں سمجھی جاتی تھیں اب دن اور نئی راتیں ہیں اب حکومت۔ علوم و فنون تجارت اور درستی اخلاق کی ہی کوشش اور سرگرمی ہماری قوم میں پیدا نہیں ہوئی اس کا کافی انتظام ہونا چاہیئے صنعت کی تعلیم گویا نہیں ہے۔ تجارت مطلق نہیں ہے۔ فنون کی

تعلیم نام کو بھی نہیں - ہاں کالجوں میں علوم پڑھائے جاتے ہیں - مگر وہ محض ناکمل ہیں - کسی مرض کی دوا نہیں ہو سکتے سائنس کی بھی پڑھائی ہے مگر کسی ایجاد و اختراع کی قوت و استعداد تو درکنار اتنا بھی نہیں آتا کہ کسی ایسی چیز کو جس میں سائنس نے ہاتھ بٹایا ہو سمجھ لیا جا سکے - اس لئے تمام کالجوں کی جو ہندوستان میں ہیں موجودہ تعلیم بالکل ناکافی ہے - اس کا علاج بجز اس کے کوئی نہیں ہے کہ یونیورسٹی اور قومی یونیورسٹی بنانے کی کوششیں جان توڑ ہمتوں کے ساتھ انجام کو پہنچائی جائیں اس کے ساتھ علوم و فنون کو اپنی زبان میں لانے کی کوشش اور اس کے لئے ہر طرح کی کوشش لگاتار محنت کے ساتھ کی جائے یہی دو ذریعہ ہیں ترقی کے - اگر ترقی کی غایت سلطنت ہوتی تو ایشیائی سلاطین بھی ترقی کے چاند تارے ہوتے مراکو - افغان - چین - ساری مثالیں آنکھوں کے سامنے ہیں - اب تو سلاطین کی جنگ بھی علوم کی جنگ ہے - اگر کامیابی فوج اور قوت پر منحصر ہوتی تو روس جاپان سے کیوں شکست کھاتا - ریل نے زمین کو سمیٹا - تو بائیسکل اور موٹر کار نے ولایت کو - اور تار برقی نے بجلی کو اگر کامیابی مردم شماری سے ہوتی تو تعدد ازدواج سے اس کمی کو پورا کر لینا بائیں ہاتھ کا کھیل تھا، مگر اے دوستو - ساری کامیابی اب علوم و فنون اور تجارت اور صنعت پر منحصر ہے - مگر تربیت و اخلاق کے زوروں پر -

اس پچھلے جملے سے میری مراد مسلمانوں کی ترقی ہے اور تربیت اخلاق سے میری مُراد قرآن مجید کے برگزیدہ اور مقدس احکام اور محققانہ مطالب کی پیروی ہے - مسلمانوں کی ترقی کے معنی ہیں مسلمان ہو کر اور مسلمان رہکر ترقی کرنا - اس لئے ہماری ترقی سے ہماری روحانی زندگی جُدا نہیں ہو سکتی جس طرح ہمارے جسم سے روح اور قرآن ہے - عربی زبان میں - اس لئے عربی کی تعلیم ہم مسلمانوں کی تعلیم جزو لاینفک ہے - الحمد للہ شکر کی جا ہے کہ علیگڑھ میں عربی تعلیم کا سلسلہ کھل گیا اور شکریہ کی جگہ ہے کہ بنگال یونیورسٹی میں قرآن ہم مسلمانوں کے لئے گویا لازم کر دیا گیا ہے -

مگر حضرات! آپ معاف کریں کہ اگر میں یہ کہوں کہ یہ موجودہ عربی تعلیم اگر مقصد تک کامیاب بھی ہو جب بھی مرض کی دوا نہیں ہو سکتی کیونکہ میں نے بیان کیا ہے کہ عربی تعلیم اس حد کو پہنچے قوت تحقیق بھی پیدا او رصرف تھوڑی تعلیم سے اور صرف کسی قدر زبان جان لینے سے نہیں ہو نیگا -

ایسی حالت میں کہ موعظہ اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر فرض ہے اور اشاعت دین ہمہ تبلیغ رسالت کی خدمت ہے - مگر ہم اس سے کس درجہ غافل ہیں آزادی کی خنک ہوا چل رہی ہے تو اس نئی تعلیم یافتہ ممالک میں مذہب کی آزادی بھی دیدی ہے - اور مذہبی تعصب کی گرمیوں کو دل سے نکال دیا ہے جس سے قبول حق کا مادہ پیدا ہو گیا ہے - اسی مادہ کا ہیجان ہے کہ بغیر کسی طرح کے

تبلیغ کی یورپ میں اسلام کچھ نہ کچھ پھیلا اور پھیلتا جاتا ہے اور ایک معقول تعداد مسلمانوں کی ہوگئی ہے ایسی حالت میں کیسی ضرورت ہے کہ قرآن مجید کا صحیح ترجمہ انگریزی زبان میں کیا جائے۔ اس وقت تک کل تین ترجمے ہوئے ہیں اور میری جانچ میں بلکہ شاید آپ صاحبوں کا بھی ایسا ہی خیال ہوگا کہ علاوہ اس کے کہ وہ راز کار اور موہوم روایتوں کی آمیزش سے مملو ہیں غلط بھی ہیں پھر کیا ضروری نہیں ہے کہ قرآن کا صحیح ترجمہ کیا جائے اور کیا اس کا وقت نہیں آیا۔ مگر یہ کرے کون۔ ایسا کون قابل ہے جو انگریزی اور عربی دونوں میں قابلیت رکھتا ہو اور صاف خیال بھی ہو۔ اس کی محققانہ نظر بھی ہو۔ مجتہدانہ قدرت بھی رکھتا ہو اگر کوئی ایک باہمہ صفت موصوف نہ ہو تو آٹھ دس مل کر کریں۔ مگر ایسے دو چار بھی نہ ملیں گے۔ جو ایک ایک ضرورت کے ذمہ دار ہوسکیں۔ اس لئے انگریزی تعلیم کے متعلق تو مجھے کچھ کہنا نہیں ہے۔ ہاں عربی کی تعلیم اگر اس درجہ پر ہے کہ یہ مقصد بھی پورا ہوسکے تو فہو المراد۔ اس درجہ پر نہیں ہے۔ اور اس درجے پر لانے کی کوشش کی جائے۔ کوشش اگر اس طرف منقسم نہیں کی جاسکتی تو قوم میں جو کوئی اس خدمت کا بار اُٹھائے اُس کی حمایت کی جائے۔ حمایت بھی اس طرح کہ اپنا کام اور وہ بھی دینی کام سمجھ کر۔ اس لئے ہماری کوشش۔ اور تمام تر کوشش یہ ہونی چاہیئے کہ اولاً مسلمان مسلمان سمجھے جائیں اور رہیں بھی مسلمان۔ اور ایسے کہ کوئی صاحب کمالات ہو۔ کوئی محقق ہو۔ دوسرے وہ علوم جدید وصنعت جدید کے بھی ماہر ہوں۔ خشکی میں اُن کی ریلیں چلتی ہوں تو تری میں اُن کا جہاز۔

حضرات۔ ایک اور اہم مسئلہ ہے جس کے متعلق کانفرنس اور اخباروں میں تقریر و تحریروں کا انبار لگ گیا ہوگا۔ وہ مسئلہ عورتوں کی تعلیم کا ہے۔ یہ مسئلہ یوں زیر بحث تو ہے نہیں اور نہ ہوسکتا ہے کہ عورتوں کو تعلیم دی جائے یا نہ دی جائے مذہبًا نہ عملاً۔ اس سے کون انکار کرسکتا ہے مگر ہاں زیر بحث یہ دو امر ہیں کہ تعلیم دی جائے تو کیونکر اور کہاں تک یعنی آیا اس مقصد کے لئے اسکول بنے اور لڑکیاں اسکول میں جاکر تعلیم پائیں اور آیا اُن کی تعلیم محدود کی جائے یا غیر محدود۔ یہ مضمون تو ایک رسالہ لکھنے کا ہے اور دوستوں نے لکھے ہیں۔ مگر اُس کے متعلق میں بطور خلاصہ چند الفاظ کہنا چاہتا ہوں۔

زنانہ اسکول بنانا در انحالیکہ ہنوز مردوں کے لئے کافی قومی اسکول نہیں ہے۔ اور کالج تو علی گڑھ کے سوا کوئی بھی نہیں ہے۔ اور وہ کالج ہنوز ناتمام یعنی اب تک یونیورسٹی

بھی نہیں ہوا ہے۔ تو یہ قوت کو۔ دھیان کو اور دولت کو بانٹ تا ہے علی گڑھ کو جب تک یونی ورسٹی بنا نہ لیں۔ بہت سی باتوں سے آنکھ بند کرلینا مناسب ہے دوسرے سرسید مرحوم کی طرح میں بھی موجودہ حالت کے اقتضا کے ساتھ لڑکیوں کا اسکول میں بھیجنا پسند نہیں کرتا۔ اور جس طرح سرسید مرحوم نے ایشیا اور یورپ دونوں جگہوں کی خانگی تمدن کو دیکھ کر عورتوں کی غیر محدود تعلیم کی حمایت نہیں کی ہے میں بھی غیر محدود تعلیم اور اُن کی ان نیچرل آزادی کی حمایت نہیں کرتا۔ اب صرف اس کا فیصلہ باقی ہے کہ اگر گھروں میں عورتوں کی تعلیم کا عنوان اُٹھایا جاوے۔ تو اُستانیاں لایق اور قابل کس طرح پہنچائی جائیں۔ بلا شبہ یہ ایک مشکل کام ہے۔ مگر ہر مشکل کام توجہ اور ہمت سے آسان ہوسکتا ہے۔ اس کے متعلق میری رائے یہ ہے کہ ہندوستان میں یتیم خانے گویا نہیں ہیں۔ معدودے چند ہیں تو صرف یتیم بچوں کے لئے ہیں۔ گویا یتیم بچیوں کا حق قوم پر کوئی نہیں ہے۔ اس لئے ضرورت ہے کہ یتیم بچے اور بچیاں دونوں کی نگہداشت، حفاظت اور تعلیم کی جائے اور ہنر و صنعت کے زیور سے بھی وہ آراستہ کئے جائیں یہی بچیاں اس طرح تعلیم پائیں کہ اُستانی اور مڈ وائف کی ضرورت کو پورا کریں۔

حضرات! قوم کے معنی تو یہ ہیں کہ کسی ایک ملک کے باشندوں کو ایک قوم کہتے ہیں جیسے یورپ کے باشندوں کو یوروپین لوگ کہتے ہیں۔ اس رُو سے ہندوستان کے باشندے چاہے ہندو ہوں یا مسلمان یا کرسچین یا کوئی ہندو ہیں مگر یہ معنی بولنے میں آتے ہیں اور اسپیچ کو خوشگوار بتلاتے ہیں عملاً اس کا کوئی معنی نہیں۔ دوسرے معنی قوم کے وہ ہیں۔ جو بانی اسلام نے بنایا تھا اس کی بنا مذہب پر تھی اور عملاً دنیا میں برتا بھی جاتا ہے چاہے تعلیم یافتہ ملک ہو یا غیر تعلیم یافتہ مثلاً کوئی شخص ہندوستان کا ہو یا بلوچستان کا، چین کا ہو یا مصر کا۔ فرانس کا ہو یا جرمن کا۔ ترک کا ہو یا تاجیک کا۔ عرب کا ہو یا عجم کا اسلام لایا اور مسلمان ہوگیا۔ سارے حقوق میں کیا دین کے اور کیا دنیا کے برابر کا شریک ہوگیا۔ اس رو سے قومیت کا جز و عظم مذہب قرار پایا۔ مگر افسوس سے دیکھا جاتا ہے کہ آجکل کے نو تعلیم یافتہ اسی تعلیم کو حاصل کر کے جسے ہم جیسوں نے بھی حاصل کیا ہے قوم قوم پکارتے تو ہیں مگر مذہب کی وقعت اُن کے دلوں میں نہیں رہی ہے۔ آزادی کے غلط معنی سمجھنے کی بدولت یہ عجیب وبا پھیل گئی ہے کہ مذہب کے نام سے انھیں ہوک آتی ہے۔ اگر نماز پڑھتے ہیں تو ڈرل کے طور پر۔ اگر روزے رکھتے ہیں تو فاقہ مستی سمجھ کر۔ قرآن پر حملے کرنا ان کا شیوہ ہوگیا ہے۔ اور اہل مذہب سے جھگڑنے پر انھیں مزہ آتا ہے نہ عربی جانتے نہ قرآن سمجھتے ہیں مگر

ہب کو کما حقہ سمجھے بیٹھے ہیں۔ کہیں مدنی آیتیں ناقابل عمل درآمد ٹھہرائی جاتی ہیں۔ کہیں مکّی
یتوں پر نکتہ چینیاں ہیں۔ کہیں امام غزالی گڑھے میں گرائے جاتے ہیں کہیں رازی۔ توم
مُ پکارنے سے کیا ہوتا ہے۔ جب قوم کی بنیاد ہی ڈھانے پر تلے ہوئے ہیں، جب قرآن
نہیں تو اسلام کہاں۔ اور جب اسلام ہی نہیں تو مسلمان کہاں۔ اور جب مسلمان ہی نہیں
کس کی ترقی۔ اور کیسی ترقی۔ یوں ترقی تو یورپ کی موجود ہے۔ اور اپنی رفتار سے ہر ایک
ے ترقی کرے ہی گا۔ اس سے میری غرض یہ ہے کہ اس عام وبا کے زہریلے اثر سے علی گڑھ یورڈ
و محفوظ رکھنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ جن کی تربیت کا ہم نے ذمہ لیا ہے۔ اُن کے اخلاق کی
ف مزید کوشش ہونی چاہئے۔ وہ اخلاق نہیں جو صرف علمی ہو۔ وہ بولنا اور آب پیچ کا ہونا ہے۔
ہ وہ اخلاق جو روحانی ہو اور جس میں سراسر اخلاص ہو۔ جو اصلی عزت ہے اور حقیقت میں قومی
ت ہے۔ عزت بذاتہ ایک چیز ہے۔ یہ عزت نہیں ہے جو دوسری کسی چیز کی محتاج ہو کہ
دہ مکان ہو۔ گاڑی۔ گھوڑے ہوں۔ دو چار خوشامدی ہوں۔ دس پانچ امیدوار ہوں۔
لہ عزت یہ ہے کہ انسان اپنی عزت آپ کرے کیا خلا میں کیا ملا میں۔ کیا اکیلے میں۔ کیا جماعت
ں۔ یہی عزت دوسروں سے عزت کراتی ہے۔ اور یہی عزت دلوں پر حکمرانی کرتی ہے۔ ہماری
اہش ہے کہ ہمارے بورڈر بھی حاصل کریں۔ اس کی طرف توجہ درکار ہے۔

حضرات! باتیں کہنے کو تو بہتیری ہیں۔ گر میں نے آپ صاحبان کی بہت دیر تک سمع خراشی
ں۔ اس کی معافی چاہتا ہوں اور اسی پر اکتفا کرتا ہوں۔

وَمَا عَلَيْنَا اِلَّا الْبَلَاغ۔

التربیۃ الاستقلالیہ

مندرجہ بالا کتاب فن تعلیم و تربیت کے متعلق ایک مشہور و مستند کتاب ہے یہ کتاب فرانسیسی
زبان میں تالیف ہوئی ہے جس کا نام :-

"انیسویں صدی کا ایمل"

تھا کتاب ایسی مفید و کارآمد سمجھی گئی کہ مصر کے یگانۂ روزگار علامہ مفتی محمد عبدہ نے ہربرٹ اسپنسر
کی مشہور کتاب کے بعد اس کو ترجمہ کے لئے انتخاب کیا۔ اور علامہ ممدوح کی تحریک سے مصر کے
مشہور رسالہ المنار میں اس کا ترجمہ شائع ہونے لگا جو بہت پسند کیا گیا اور آخر کار ریاض پاشا
وزیر مصر کی تحریک سے مستقل کتاب کی صورت میں شائع ہوا اور مقبول ہوا۔ اس وقت
سعد پاشا زغلول مصر میں وزیر تعلیم تھے انہوں نے سرکاری طور پر اس کتاب کو ٹریننگ کے
طلباء کے لئے تجویز کیا۔ اور تھوڑی مدت میں اس کتاب کے دو ایڈیشن عربی میں شائع ہوگئے
اب جناب مولانا محمد حبیب الرحمن خاں صاحب شروانی المخاطب بہ نواب صدر یار جنگ
بہادر کی تحریک سے ہندوستان کے مشہور انشاپرداز مولانا عبد السلام صاحب ندوی نے عربی
سے [illegible] ترجمہ کیا جس کو [illegible] نے شائع کیا [illegible]
مطالعہ میں رہنی چاہئے [illegible] والدین بچوں کی تعلیم و تربیت کے متعلق [illegible]
اور صحیح طریقہ تعلیم و تربیت معلوم کر سکتے ہیں [illegible]
[illegible]

[illegible] علی گڑھ

وقارِ حیات

یعنے

نواب وقار الدولہ وقار الملک مولوی حاجی محمد مشتاق حسین صاحب سابق ہوم سکریٹری گورنمنٹ نظام و

آنریری سکریٹری محمڈن کالج و بانی آل انڈیا مسلم لیگ

کی

[illegible] دلچسپ از معلومات سوانح عمری جو ایجوکیشنل کانفرنس نے

علی گڑھ کی پنجاہ سالہ جوبلی کے موقع پر شائع کی

یہ سوانح عمری درحقیقت مسلمانوں کی گذشتہ پنجاہ سالہ زمانہ کی تعلیمی سیاسی اور قومی تاریخ اور بیشمار اہم

واقعات کا مرقع ہے جس میں علی گڑھ تحریک اور اسلامی پالیٹکس کے متعلق بہت سے پُراسرار مخفی حالات

اس کتاب سے معلوم ہوتے ہیں جو کسی دوسرے ذریعہ سے نہیں معلوم ہو سکتے

مصنفہ

نوشتہ نواب صدر یار جنگ بہادر مولانا حاجی محمد حبیب الرحمن خاں صاحب شروانی [illegible]

مطبوعہ مسلم یونیورسٹی پریس علی گڑھ [illegible]

قیمت پانچ روپیہ

ملنے کا پتہ:- دفتر آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ